

ہزار چشمہ ترے سنگِ لاف سے پھوٹے  
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

# برقِ طوبہ

1993ء ایڈیشن

بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت انگیز داستان  
اور

حضرت عیسیٰ سے قبل انبیاء بنی اسرائیل کا بصیرت افروز تذکرہ

پرویز

شائع کن کھانا دار کاٹھن اسلام آباد

تہذیب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

برقی طور

| صفحہ | مضمون                                | صفحہ | مضمون                                     |
|------|--------------------------------------|------|---|
| ۵    | فرعون کا خطرہ                        | ۱    | فہرست                                     |
| ۶    | بنی اسرائیل کی مظلومیت               | ۱    | پیش آہنگ                                  |
| ۷    | قتل ابنا کا حکم                      |      |   |
| ۸    | حضرت موسیٰ کی پیدائش                 |      |   |
| ۹    | موجوں کے تلاطم سے محلات شاہی میں     |      |   |
| ۱۰   | اور وہاں بچہ پھر اپنی ماں کی گود میں | ۲    | فسادِ آدمیت کے تین گوشے                   |
| ۱۱   | محلات میں پرورش                      |      | استبدادِ حکومت، برہنیت اور سرمایہ داری    |
| ۱۲   | ایک نیا واقعہ۔ قبطی کا قتل           |      | یہ تین شکنجے اور قوم بنی اسرائیل          |
| ۱۳   | اسرائیلی کی حمایت کیوں تھی؟          | ۳    | بنی اسرائیل اور یہودی                     |
|      | دوسرے دن ایک اور واقعہ               | ۴    | حضرت موسیٰ کا زمانہ اور اس زمانہ کا فرعون |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون  |
|------|--|------|--|
| ۳۱   | مزید بکھرے ہوئے موتی                                   | ۱۴   | قتل حضرت ہوئے کی سازش، مصر سے ہجرت               |
| ۳۷   | طور سے واپسی   | ۱۵   | مدین کی طرف                                      |
| "    | دربار فرعون میں  | "    | راستہ میں پیاد کا واقعہ                          |
| ۳۸   | بنیادی مطالبہ: بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو        | ۱۷   | فطرت کی فیاضیاں اور انسانی تصرفات                |
| "    | فرعون کا استفسار: تمہارا رب کون ہے جس کی               | "    | (کیا ان پیرزوں پر انفرادی قبضہ جائز ہے؟)         |
| "    | طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو۔                              | "    | (ایک ضمنی گوشہ)                                  |
| ۳۹   | حضرت ہوئے کا جواب                                      | ۱۹   | ترہیت صحرائی و شبانی: کلیمی کے ابتدائی مراحل     |
| "    | حقیقت کی ایک دنیا چار الفاظ میں                        | ۲۰   | تجلی کا طور                                      |
| "    | فرعون نے راہ کتر کر ایک اور سوال کیا                   | ۲۱   | سب سے پہلی وحی: اللہ کے سوا کسی کی               |
| ۴۰   | وہ سوال جو دنیائے مذہب میں تخریب و                     | "    | محکومیت جائز نہیں۔                               |
| "    | اختلاف کی بنیاد ہے، یعنی اسلاف کے بارے                 | ۲۲   | قیام حکومتِ خداوندی کی بنیاد                     |
| "    | میں کیا کہتے ہو؟                                       | "    | (قوموں کی شکست و کامرانی کا بنیادی راز)          |
| "    | ایک اور بصیرت افروز جواب: ان کا معاملہ خدا کے          | ۲۳   | عصائے کلیمی اور ید بیضا                          |
| "    | ساتھ ہے!   | ۲۴   | عصائے کلیمی اور ید بیضا کا دوسرا مفہوم           |
| ۴۱   | اس جواب میں آج ہمارے لئے سامان                         | ۲۶   | فرعون کی طرف ماموریت                             |
| "    | صد بصیرت ہے۔   | "    | اس ہم عظیم کے لئے استعانت کی دعائیں              |
| ۴۲   | فرعون کا دعویٰ رُبوبیت اور اس کا بطلان                 | "    | زبان کی گرہ کشائی                                |
| ۴۴   | فرعون کی دھمکی: اگر یازنہ آئے تو جیلی نے بھجوا دوں گا۔ | ۲۷   | تسبیح و ذکر کا صحیح مفہوم (ایک ضمنی گوشہ)        |
| "    | سیاست فرعون کی اور حکمتِ کلیمی کا فرق                  | ۲۸   | ایک نبی کو خاص اندازوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے |
| "    | تاریخ اسی سلسلہ صید و صیاد کی داستان                   | ۲۹   | عبادت کا مفہوم: قیام حکومتِ الہیہ                |
| "    | خونچکاں ہے۔  | ۳۰   | دعوت انقلاب کے دو مقام: جمال و جلال              |
| ۴۵   | مستبد قوم اپنے جذبہ حکومت کی تسکین                     | "    | مزید ہدایات                                      |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون   |
|------|--|------|---|
| ..   | یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم آج اپنے              | ..   | کے لئے کمزور قوم کو ہمیشہ محکوم رکھنا چاہتی         |
| ..   | خط و خال دیکھ رہے ہیں۔                         | ..   | ہے کہیں جانے بھی دینا نہیں چاہتی۔                   |
| ۵۳   | فرعون نے اب حضرت موسیٰ پر اپنے خاندان کے احسان | ..   | اس غرض کے لئے مختلف چیلے اور حربے                   |
| ..   | جتانے شروع کئے۔                                | ..   | استعمال کئے جاتے ہیں۔                               |
| ۵۴   | اس کا جواب؟ حقیقت و بصیرت کا ایک               | ..   | دبیسہ کاریاں اور گردہ سائیاں                        |
| ..   | درخشاں جوابہ پارہ!                             | ..   | ہمیشہ اور ہر جگہ                                    |
| ..   | یہی احسان ہے ناکہ پوری کی پوری قوم کو غلامی    | ۴۶   | مطالبات کی مخالفت                                   |
| ..   | کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے؟                      | ..   | لیکن مشیت کو منظور تھا کہ کمزوروں پر احسان کیا جائے |
| ۵۶   | قوم فرعون دل سے حضرت موسیٰ کی صداقت کی قائل    | ۴۷   | احسان خداوندی کا صحیح مفہوم۔ سطوت و حکومت           |
| ..   | ہو چکی تھی لیکن حکومت و قوت کا نشہ اعتراف      | ..   | دعوت موسوی کے جواب میں فرعون کی طرف سے              |
| ..   | حقیقت سے مانع تھا۔                             | ..   | نشانات طلبی   |
| ..   | اس نش میں بدست، دعوت موسوی سے اتہزا            | ۴۸   | لیکن اس کے بعد بھی انکار و سرکشی                    |
| ..   | کرنے لگے۔                                      | ۴۹   | اور اسلاف کی اندھی تقلید۔                           |
| ۵۸   | فرعون کے اعلانات اور منادی کہ کوئی حضرت موسیٰ  | ۵۰   | صداقت کی تکذیب                                      |
| ..   | کی بات نہ مانے۔                                | ۵۱   | ایک عجیب اعتراض! یعنی کیا اپنے جیسے انسانوں پر      |
| ۶۰   | لیکن دبدبہ کلیمی کا رعبہ انگریز اثر            | ..   | ایمان لے آئیں؟                                      |
| ..   | فرعون کی نئی تدبیر۔ ساحرین سے مقابلہ           | ..   | اور اس سے بھی عجیب تر۔ کیا اپنی محکوم قوم           |
| ۶۱   | مقابلہ کا میدان، جشن کا روز، لوگوں کا ہجوم     | ..   | کے افساد کو ایسا بلند سمجھ لیں اور                  |
| ۶۳   | مقابلہ   | ..   | ان کی بات مان لیں؟                                  |
| ..   | ساحرین نے ابتدا کی اور باطل کی                 | ۵۱   | سچ ہے محکوم کی بصیرت پر کون بھروسہ                  |
| ..   | نظر فریب "رستیوں" کا                           | ..   | کر سکتا ہے؟   |
| ..   | جال بچھایا۔                                    | ۵۲   | نہ اس وقت نہ آج                                     |



| صفحہ | مضمون   | صفحہ | مضمون  |
|------|---|------|--|
| ۷۴   | اربابِ حکومتِ فرعون کے خدشات اور شورے                 | ۷۴   | اب حصائے موسوی آیا۔ اور وہ دیکھو وہ اس سارے      |
| ۷۶   | دربارِ فرعون کا مردِ مومن اور اس کی جرأتِ آفریں تقریر | ۷۶   | فریب کو نکل گیا۔                                 |
| ۷۷   | تکذیب کی وجہ سے قومِ فرعون پر ہلکے ہلکے عذاب          | ۷۷   | ساحرین کی آنکھوں نے حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا    |
| ۷۸   | لیکن ان کی عجیب حالت                                  | ۷۸   | دیکھا اور سجدہ میں جھک گئے!                      |
| ۷۹   | اور یہی حالت آج بھی ہے                                | ۷۹   | وہ سجدہ جس سے زمین و آسمان وجد میں آجائیں        |
| ۸۰   | لیکن انہوں نے اللہ کے قانونِ ہدایت سے فائدہ نہ        | ۸۰   | یہ دیکھ فرعون کی شعلہ باری۔                      |
| ۸۱   | اٹھایا اور بربادی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے گئے۔       | ۸۱   | اس کے مقابلہ میں ساحرین کا کوہِ تمثالِ ایمان     |
| ۸۲   | اتمامِ حجت کے بعد مصر سے ہجرت                         | ۸۲   | اور اس قسندیلِ ایمانی کی نور افشائیاں!           |
| ۸۳   | ہجرت کیا ہے؟ ظلمت سے نور کی طرف آجانا۔                | ۸۳   | اور ہمارا ایمان!                                 |
| ۸۴   | ظلمت اور نور کا قرآنی مفہوم! غلامی سے آزادی           | ۸۴   | دوسرا مرحلہ خود بنی اسرائیل کی تنظیم و تربیت اور |
| ۸۵   | کی طرف  | ۸۵   | اصلاح و تہذیب تھا۔                               |
| ۸۶   | درد کا مفہوم۔ ایک اہم ضمنی گوشہ                       | ۸۶   | غلاموں کی ذہنیت                                  |
| ۸۷   | لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کا بیچا کر لینے کی ٹھان لی۔ | ۸۷   | بنی اسرائیل ایک مدت کی غلامی سے                  |
| ۸۸   | اسے کیا معلوم تھا کہ یہ اپنے پاؤں اپنی قبر کی         | ۸۸   | بتیں ہار چکے تھے۔                                |
| ۸۹   | طرف جاتا ہے۔  | ۸۹   | ان میں عزم و استقلال باقی نہیں رہا تھا           |
| ۹۰   | بنی اسرائیل اور فرعون کے شکرِ سمندر کے درمیان گھر گئے | ۹۰   | البتہ نوجوانوں کے طبقہ نے اس دعوت پر             |
| ۹۱   | اس سے وہ ہراساں ہوئے۔                                 | ۹۱   | لتیک کہا۔  |
| ۹۲   | لیکن حضرت موسیٰ کے عزم و استقلال میں                  | ۹۲   | انقلابی تحریک بتدیج آگے بڑھا کرتی ہے             |
| ۹۳   | ذرا فرق نہ آیا۔                                       | ۹۳   | تدیج سے مفہوم آگے بڑھنا ہے رک جانا نہیں۔         |
| ۹۴   | فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی                        | ۹۴   | اس انقلاب کی اہتدار اقامتِ صلوة سے ہوتی ہے       |
| ۹۵   | ڈوبتے وقت فرعون کا اظہارِ ایمان                       | ۹۵   | لیکن مستبد حکومت اس قسم کے انقلاب کو کب          |
| ۹۶   | لیکن یہ ایمان کیا تھا؟ ضعفِ خودی کا مظاہرہ!           | ۹۶   | روا رکھ سکتی ہے۔                                 |

| صفحہ | مضمون   | صفحہ | مضمون  |
|------|---|------|--|
| ۱۰۲  | تفرقہ۔ گوسالہ پرستی۔ بڑا شرک                          | ۸۶   | لہذا اس کی قیمت کچھ نہ تھی۔ ایمان ساجرین               |
| ۱۰۳  | اس کے متعلق تورات کا بیان                             | ..   | کا تھا۔  |
| ..   | قرآن اور تورات کے بیانات میں فرق                      | ۸۷   | فرعون کی لاش۔ تاریخ و اثریات کا ایک اہم انکشاف         |
| ۱۰۴  | بنی اسرائیل کی ایک اور فرمائش۔ شہری دسترخوان کے       | ۸۸   | ایک شبہ اور اس کا ازالہ، یعنی بنی اسرائیل کے لئے       |
| ..   | چھپٹے کھانے چاہئیں۔                                   | ..   | سمندر نے راستہ کیسے دیدیا؟                             |
| ..   | بدوی اور شہری تمدن میں فرق                            |      |  |
| ۱۰۵  | ایک اور مطالبہ۔ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے       |      |  |
| ..   | طور پر بے ہوشی  | ۹۲   | داستان بنی اسرائیل کا نیا ورق۔ لاکے مرحلہ              |
| ۱۰۶  | بنی اسرائیل کا ایمان اور قوم فرعون کے مومنین کا ایمان | ..   | کے بعد الّا۔   |
| ..   | محکوم اور عالم قوم کے افراد کی قوت ایمانیہ کا فرق     | ..   | یہ مرحلہ بڑا جانگداز تھا، اس لئے کہ قوم میں خوئے غلامی |
| ۱۰۷  | ایک اور فرق۔ محکوم قوم عمل کے بجائے باتیں بنانے والے  | ..   | پختہ ہو چکی تھی۔                                       |
| ..   | ہیلنے تراشنے میں مشاق ہوتی ہے۔                        | ..   | غلامی کی لعنت اور نحوست کے نتائج                       |
| ۱۰۸  | ذبح بقر کا واقعہ اور اس سے عبرت آموز سبق              | ۹۳   | ہر مقام پر بگڑ بیٹھتے تھے کہ ہمیں کس مصیبت             |
| ۱۱۰  | جرات اور حوصلہ کے بجائے خوف و ہراس                    | -    | میں لے آئے؟  |
| ۱۱۱  | فاذهب انت دس بڈک۔ ہمتوں کی پرستی                      | ۹۴   | تورات کا بیان  |
| ۱۱۲  | سودہ ارض مقدس جو ان کے نام لکھی جا چکی تھی چاہیں      | ..   | ”ہم غلام ہی اچھے تھے۔“                                 |
| ..   | سال تک ان پر حرام ہو گئی (کہ یہ ابھی اس کے            | ۹۶   | اس قوم پر انعامات خداوندی کی بارشیں                    |
| ..   | اہل نہ تھے)۔  | ۹۷   | خوئے غلامی کی پختگی                                    |
| ..   | یہ تھی وہ قوم جس نے حضرت موسیٰ کو اس طرح ستایا۔       | ..   | ایک قوم کو بُت پوجتے دیکھا تو پھل کر بیٹھ گئے          |
| ۱۱۳  | لیکن تورات نے اس کے متعلق کیا افسانہ طرازی کی؟        | ..   | کہ ہمیں بھی ایسا ہی خدا بنوادو!                        |
| ۱۱۵  | اور افسوس کہ خود ہماری کتب روایات بھی اس              | ۹۸   | گوسالہ سامری۔ عبرت و موعظت کی ایک                      |
|      | سے محفوظ نہ رہ سکیں۔                                  | ..   | حسرت بھری داستان                                       |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون   |
|------|--|------|---|
| ..   | کی ضرورت ہوتی ہے؟                              | ..   | بخاری شریف کی ایک روایت                         |
| ..   | جو ہر ذاتی نہ کہ نسب و دولت                    | ۱۱۶  | قوم کے بڑے بوڑھوں سے مایوسی۔ نئی نسل کی         |
| ۱۲۷  | قوم کے ضبط نفس کا امتحان۔ ذرا سی بات، لیکن وہ  |      | تربیت کی فکر۔                                   |
| ..   | اس پر بھی پورے نہ اتر سکے۔                     | ۱۱۷  | چالیس برس تک دشتِ پیمائی دھواوردی               |
| ۱۲۸  | معیارِ فتح و ظفر، قلت و کثرت نہیں ایمان        | ..   | سلسلہ رشد و ہدایت۔ بارگاہِ ایزدی سے نوازشات     |
| ..   | کی قوت۔  | ..   | پیہم کی گہراری۔                                 |
| ۱۲۸  | جالوت کے ساتھ مقابلہ۔ میدانِ جہاد کی دعائیں    | ۱۱۸  | خدا کے احکام ملتے چلے گئے                       |
| ۱۲۹  | فتح و کامرانی                                  | ..   | تربیت گاہِ سینا                                 |
| ۱۳۰  | ”بادشاہ“ بنانے کے متعلق تورات کی تصریحات       | ..   | انہی میدانوں میں حضرت شعیبؑ بھی تشریف لے آئے    |
| ۱۳۳  | عروج کے بعد انحطاط۔ بنی اسرائیل کی قلی خرابیاں | ۱۱۹  | اور نوجوانانِ قوم کی تربیت میں ہاتھ بٹانے لگے   |
| ..   | دو بہت بڑی بربادیاں                            | ۱۲۰  | یہ نوجوان تنظیمِ تربیت کے بعد سیلاب کی طرح اٹڑے |
| ۱۳۴  | (i) بخت نصر کی لورٹ اور یرشلم کی بربادی        | ..   | اور فلسطین کی زمینوں پر چھا گئے۔                |
| ۱۳۶  | اس تباہی کے بعد دوبارہ زندگی                   | ۱۲۱  | یوں اللہ کے وعدے پورے ہوئے                      |
| ..   | حزقیلؑ نبی کا خواب جس کی تائید                 | ..   | دورِ عروج و سیادت                               |
| ..   | قرآنِ کریم سے بھی ہوتی ہے۔                     | ۱۲۲  | مقامِ برتری                                     |
| ۱۳۸  | (ii) رومیوں کے ہاتھوں سنہ ۱۰۰۰ء میں            |      |   |
| ..   | دوسری بربادی۔                                  |      |   |
| ..   | جس کے بعد اُنھیں پھر زندگی نصیب                | ۱۲۳  | ..... طاؤس در بابِ آخر                          |
| ..   | نہیں ہوئی۔                                     | ..   | حضرت موسیٰؑ کی وفات۔ (بخاری شریف کی ایک روایت)  |
| ۱۳۹  | یہ بربادی اور تباہی ان کے جرائم کا نتیجہ تھی۔  | ۱۲۴  | خلافتِ موسویؑ۔ حضرت یوشع بن نون                 |
| ..   | جرائم کی فہرست                                 | ..   | جنابِ طاہرات کا واقعہ                           |
| ..   | قتلِ انبیاء                                    |      | قیادت و سیادت کے لئے کن خصوصیات                 |

## باب سوم

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون                                       |
|------|--|------|---|
| -    | باہمی تشدد و افتراق اور خرب و تشیع نے ان کی  | ۱۴۰  | بہدشکنی                                     |
| ..   | وحدت ملی کے ٹوٹے کر دیئے تھے۔                | ..   | پہلے اپنے لوگوں کے لئے مصیبت کا سامان       |
| ۱۴۶  | یہ اختلافات باہمی ضد کی بنا پر ہوتے تھے      | ..   | پیدا کرنا اور پھر ان سے اظہارِ ہمدردی       |
| ۱۴۷  | ایک دوسرے کی تنقیص و تکذیب                   | ..   | وجہ ثواب سمجھنا۔                            |
| ۱۴۸  | نجات بلا عمل کا خود فریب عقیدہ               | ۱۴۱  | تو منوں ببعض الکتاب و تکفرون ببعض           |
| ..   | نخن ابناء اللہ                               | ..   | کا مفہوم۔ مسلمانوں کے لئے ہجرت و            |
| ۱۴۹  | محض یہودی نام رکھ لینے سے جنت کے احد         | ..   | موعظت کا ایک واضح باب                       |
| ..   | مالک۔ اس نجات کے لئے عجیب و غریب             | ..   | (ضمنی گوشہ)                                 |
| ..   | عقائد۔                                       | ۱۴۲  | عیوب اتنے عام ہو چکے تھے کہ ان پر مرنش      |
| ۱۵۰  | اندھی تقلید                                  | ..   | کرنے والا کوئی نہ تھا۔                      |
| ۱۵۱  | وہ اپنے باطل عقائد پر اس طرح آنکھیں          | ..   | سود خود اور حرام خود                        |
| ..   | بند کر کے جمے بیٹھے تھے کہ کسی دوسری         | ۱۴۳  | سچی کہ دین فروش                             |
| ..   | بات کو سننا ناک گوارا نہیں کرتے تھے۔         | ..   | ضبط نفس کا فقدان۔ اطاعت شعاری کا            |
| ۱۵۲  | لیکن اس ماد عمار کے باوجود موت کے نام سے     | ..   | جذبہ فنا ہو چکا تھا۔                        |
| ..   | ان کی رُوح فنا ہوتی تھی۔                     | ۱۴۴  | قوانین خداوندی کو فراموش کر بیٹھے تھے۔      |
| ۱۵۳  | ان جرائم کی پاداش میں (بلکہ ان کے فطری نتائج | ..   | انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی پابندی       |
| ..   | کے طعہ پر) ان پر غلامی اور محکومی کا سوا کس  | ..   | بڑی سختی سے کرتے تھے۔                       |
| ..   | عذاب مسلط ہو گیا۔                            | ..   | یوں انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو          |
| ۱۵۵  | نہ صرف بدن کی غلامی بلکہ دل و دماغ کی غلامی۔ | ..   | خدا بنار کھا تھا۔                           |
| ..   | نظریات زندگی میں بھی دوسروں کے نقال۔         | ۱۴۵  | ان کے علماء و مشائخ (احبار و رہبان) کی حالت |
| ۱۵۶  | بلکہ بندروں کی سی کیفیت۔                     | ..   | بھی تاسف انگیز ہو چکی تھی۔                  |
| ..   | ”بند رہن جانے کا مفہوم۔                      | ..   | بھوٹی نمائش اور منافقت کی تعریف چاہتے تھے۔  |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون                                       |
|------|--|------|---|
| ۱۴۲  | ”إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ“ اور ”ابد“ کا مفہوم | ۱۵۷  | یہود پر ذلت کی مار                          |
| ۱۴۳  | حکومت و سلطنت حاصل کرنے کی صلاحیتیں            | ۱۵۸  | ذلت کے معنی۔ محکومی اور غلامی               |
| ..   | صلیبی جنگ کا واقعہ                             | ۱۵۹  | سکنت کے معنی۔ بے عملی کا تعطل               |
| ۱۴۴  | نیولین کا مصر پر حملہ                          | ..   | حَبْلِ اللَّهِ اور حَبْلِ النَّاسِ کا مفہوم |
| ..   | بخارا پر روسیوں کا محاصرہ                      | ..   | ایک اہم ضمنی گوشہ                           |
| ..   | توہینِ حیات گئیں۔ خالی دعائیں کچھ نہ           | ۱۶۰  | بنی اسرائیل کے لئے باز آفرینی کا آخری موقع  |
| ..   | بگاڑ سکیں                                      | ..   | یعنی اتباعِ نبی اکرمؐ۔ لیکن انہوں نے        |
| ..   | ہماری حالت .....                               | ..   | اسے بھی ضائع کر دیا۔                        |
| ۱۴۵  | ۱۹۴۷ء میں یہودیوں کے ہاتھوں عربوں              | ۱۶۱  | آخری تباہی۔ مسلمانوں کے ہمد میں             |
| ..   | کی شکستِ فاش۔                                  | ۱۶۲  | یہ ہے داستانِ بنی اسرائیل جو ہمارے لئے      |
| ..   | قوموں کی تقدیروں کے فیصلے ان کے                | ..   | باعثِ عبرت و موعظت ہے۔                      |
| ..   | اپنے اعمال و کردار کے مطابق                    | ..   | باز بخوشتن نگو!                             |
| ..   | ہوتے ہیں۔                                      | ۱۶۳  | کیا یہودیوں کی تباہی ابدی ہے؟               |
| ..   |  | ..   | یہ خدا کا فیصلہ نہیں۔ ہماری خوش فہمی تھی۔   |
| ۱۴۶  | باچہ مار<br>(تورات)                            | ۱۶۵  | عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی       |
| ..   | وحدتِ ادیان کا صحیح مفہوم                      | ..   | طبیعی قوانین۔ ”شیر سنگھ یا رام داس“ میں     |
| ..   | سلسلہ رشد و ہدایت کی مختلف کڑیاں ایک           | ..   | تفریق نہیں کرتے۔                            |
| ۱۴۷  | ہی مشعل کی کرنیں تھیں۔ لیکن کتبِ بقا اپنی      | ۱۶۶  | خدا کی چاہیبتی اولاد؟                       |
| ..   | اصلی شکل میں باقی نہ رہیں۔ اس لئے اب وہ        | ۱۶۷  | بنی اسرائیل کی اجتماعی خرابیاں              |
| ..   | تمام تعلیم صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے۔          | ..   | کون سی خرابی اس ہم میں پیدا نہیں ہو چکی؟    |
| ..   |  | ۱۶۹  | مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ سے مراد                |
| ..   |  | ۱۷۰  | خدا کا غضب سے مفہوم                         |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ   | مضمون   |
|------|--|--|---|
| ۱۸۸  | (۳) ضلالت کے معنی۔ جہاں حضرت موسیٰ نے کہا تھا کہ | ۱۷۷  | قرآن، کتبِ اربعہ کا ذکر و قبائے چشمک سے جس میں کرتا |
| ..   | اَنَا مِنَ الضَّالِّينَ۔                         | ..   | بلکہ یگانگت کے رنگ میں کرتا ہے۔                     |
| ..   | اس کے معنی غلطی کے ہیں                           | ..   | تنزیلِ تورات  |
| ۱۸۹  | اور راستہ کی تلاش میں اضطراب کے بھی              | ۱۷۸  | تورات حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون                     |
| ۱۹۰  | (۴) "قتلِ نفس" کا واقعہ                          | ..   | دونوں کو ملی تھی۔                                   |
| ..   | یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو تاریخی انکشافات        | ۱۷۹  | یہ باعثِ ہدایت و رحمت تھی                           |
| ..   | کی روشنی میں ہی واضح ہو سکے گا تا حال            | ..   | اس میں نبی اکرم اور صحابہ کی مقدس جماعت کا ذکر تھا  |
| ..   | اس کا یقینی مفہوم متعین نہیں ہو سکا۔             | ..   | یہ ایمان کہ تورات منزلِ من اللہ تھی مسلمانوں        |
| ۱۹۱  | (۵) قارون  | ..   | کے لئے ضروری ہے۔                                    |
| ..   | یہ فسادِ سرِ پادری کا مظہر تھا۔                  | ۱۸۰  | لیکن اصل تورات میں تحریف و الحاق کیا گیا تھا        |
| ۱۹۲  | دعوتِ اصلاح کے جواب میں قارون کا جواب            | ۱۸۱  | قرآن کریم، تورات کی اصلی تعلیم کو لئے ہوئے ہے۔      |
| ..   | سطح میں لوگ ایسی زندگی کو قابلِ رشک              | <div style="border: 1px solid black; padding: 10px; text-align: center;"> <b>باب پنجم</b><br/> <b>(بعض ضمنی گوشے)</b> </div> |   |
| ..   | سمجھ لیتے ہیں۔                                   |  |   |
| ۱۹۳  | لیکن حقیقت میں نگاہیں جانتی ہیں کہ               | ۱۸۲  |   |
| ..   | اس کی اصلیت کیا ہے؟                              | ..   | (۱) حکیمِ الہی                                      |
| ..   | قارون کا انجام۔ ہلاکت                            | ۱۸۳  | (۲) شرحِ صدر  |
| ۱۹۴  | قارون اور تورات کا بیان                          | ۱۸۵  | حوصلوں کی بلندی، نگاہ کی کشادگی، ظرف                |
| ۱۹۴  | مورخ جوڑے فس کی شہادت                            | ..   | کی وسعت۔ شرحِ صدر کس طرح ہوتا ہے؟                   |
| ..   | قارون ہر چند قومِ موسیٰ میں سے تھا۔              | ۱۸۶  | احکامِ الہیہ کی اتباع اور تمت و استقلال             |
| ..   | لیکن اس کے مسلکِ فساد کی وجہ سے آئے              | ..   | کے ساتھ اتباع سے۔                                   |
| ..   | بھی فرعون اور ہامان کے زمرہ میں شمار             | ۱۸۷  | نبی اکرم کا شرحِ صدر                                |
| ..   | کیا گیا ہے                                       | ۱۸۸  | اسلام کے لئے مومنین کا شرحِ صدر                     |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون  |
|------|--|------|--|
| ۲۱۰  | مسلکِ خانقاہیت نے مسلمانوں کے قوائےِ عملیہ کو مضحک کر دیا ہے۔                  | ۱۹۵  | (۶) ہامان  |
| ۲۱۱  | اصل مسلکِ زندگی کیا ہے؟  | ۱۹۶  | بادشاہت کے ساتھ برہنیت کا غلبہ و اقتدار                |
| ۲۱۲  | سحر کے معنی جھوٹ   | ۱۹۷  | مصر میں اس کا تسلط اور شدید تھا۔                       |
| ۲۱۵  | نبی اکرمؐ کے متعلق کفار کی تہمت کہ حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی نے جادو کر دیا ہے! | ۱۹۸  | آمن دیوتا کے مندر کا بجاری گویا ایک سلطنت کا مالک تھا۔ |
| ۲۱۶  | لیکن یہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی موجود ہے۔                                      | ۱۹۹  | یہی قرآن کریم کا ہامان ہے۔                             |
| ۲۱۷  | (بخاری شریف کی ایک روایت)  | ۲۰۰  | یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی                           |
| ۲۱۸  | (۸) واقعہ "خضر"  | ۲۰۱  | (۷) حقیقتِ سحر   |
| ۲۱۹  | خضر کا نام قرآن کریم میں نہیں ہے۔  | ۲۰۲  | لفظِ سحر کے معنی جس کا سبب لطیف اور دقیق ہو            |
| ۲۲۰  | حضرت موسیٰؑ کا سفر   | ۲۰۳  | سحر کی ابتدائی تاریخ                                   |
| ۲۲۱  | خدا کے ایک بندے سے ملاقات  | ۲۰۴  | علمِ سحر کے معتقدین کا عقیدہ۔ عالمِ مثال               |
| ۲۲۲  | ان کی معیت میں سفر   | ۲۰۵  | اس کی سائنٹیفک توجہ                                    |
| ۲۲۳  | تین واقعات اور حضرت موسیٰؑ کے استفسارات  | ۲۰۶  | محققینِ مغرب کی تصریحات                                |
| ۲۲۴  | ان باتوں کی حقیقت  | ۲۰۷  | فنِ سحر کی بنیاد۔ قوتِ ارادی                           |
| ۲۲۵  | اس واقعہ سے پیری مریدی کے جواز (بلکہ وجوب) کی سند حاصل کی جاتی ہے۔             | ۲۰۸  | اور قرآن کریم کا بیان                                  |
| ۲۲۶  | نیز یہ کہ "مرشد" کی نگاہ بواطن پر ہوتی ہے                                      | ۲۰۹  | مسلمان اور سحر کاری                                    |
| ۲۲۷  | اس کی کسی حرکت پر حرف گیری نہیں کرنی چاہیئے۔                                   | ۲۱۰  | ورد، وظیفے، گنڈے، تعویذ، عملیات                        |
| ۲۲۸  | حضورؐ نے قرآن ہی کی تعلیم دی اور کھلی کھلی تعلیم دی                            | ۲۱۱  | سب قوتِ ارادی کے کرشمے ہیں۔                            |
| ۲۲۹  | جس میں کوئی راز اور پردہ داری نہ تھی۔  | ۲۱۲  | غیر مسلموں کی ساحرانہ سازش                             |
|      |  | ۲۱۳  | قرآن کی عظمت اس سے بہت بلند ہے                         |
|      |  | ۲۱۴  | قرآن کا غلط مصرف                                       |
|      |  | ۲۱۵  | اس قسم کی باتوں سے معیارِ فضیلت تقویٰ نہیں رہا۔        |

| صفحہ | مضمون                                    | صفحہ | مضمون  |
|------|--|------|--|
| ۲۲۲  | تسبیح سے مفہوم - پہاڑوں اور طیور کی      | ۲۲۸  | لیکن مسلمانوں میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ اصل دین |
| ..   | تسبیح سے مراد                            | ..   | درحقیقت "رموز و اسرار" ہی کا نام ہے            |
| ..   | ایک ضمنی گوشہ                            | ..   | تصوف کی عمارت اسی مفروضہ پر قائم ہے            |
| ..   | آپ فنِ اسلحہ سازی سے واقف تھے            | ..   | بخاری شریف کی ایک روایت                        |
| ۲۲۳  | حضرت داؤدؑ کے ایک فیصلہ کا ذکر           | ۲۲۹  | اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے      |
| ..   | آپ کے فیصلہ سے حضرت سلیمانؑ کا فیصلہ     | ..   | جو دنیا میں قرآنی نظامِ حکومت قائم کر سکے      |
| ..   | انہی قرار پایا                           | ۲۳۰  | لیکن مسلمانوں نے کیا کیا؟                      |
| ..   | مقدمہ کی تفصیل                           | ۲۳۱  | تسبیح فطرت اور تصوف، حکمتِ یونان کا            |
| ۲۲۵  | اس واقعہ پر افسانہ طرازیوں کی بنیاد      | ..   | تعطل آمیز اثر                                  |
| -    | محرف تورات کی خرافات                     | ۲۳۲  | علمِ انفس اور قرآن                             |
| ۲۲۸  | لیکن ہماری کتبِ تفسیر بھی اس سے ملوث ہیں | ۲۳۳  | علمِ کونی کا قرآنی مفہوم                       |
| ۲۲۹  | اور غضب یہ کہ ان لغویات کی بنیاد         |      |  |
| ..   | احادیث پر رکھی جاتی ہے۔                  |      |  |
| ۲۵۰  | یہ روایات کس طرح جزو دین بن گئیں         | ۲۳۹  | سطوتِ داؤدی و شوکتِ سلیمانی                    |
|      | حضرت داؤدؑ کا ضمنی تذکرہ                 |      | متلہ ق-م                                       |
|      | تورات کا ایک اور لغو قصہ                 |      |  |
| ۲۵۳  | حضرت سلیمانؑ                             | ۲۴۰  | طاہرات کے جانشین، حضرت داؤدؑ                   |
|      | ۹۵۰ ق-م                                  | ..   | آپ کو زبور عطا ہوئی تھی                        |
|      | حضرت داؤدؑ کے فرزند اور جانشین           | ۲۴۱  | وراثتِ ارضی اور اعمالِ صالحہ (ایک ضمنی گوشہ)   |
|      | علم و قوت کے مالک                        | ..   | آپ کو علم اور حکمت اور فیصلوں کی قوت           |
| ۲۵۴  |  | -    | عطا فرمائی گئی تھی                             |
|      |  | ۲۴۲  | اس تمام قوت و جبروت کے ساتھ خدا کے فرماں بردار |



| صفحہ | مضمون   | صفحہ | مضمون   |
|------|---|------|---|
| ..   | طرف انتساب!                                   | ..   | عظیم الشان سلطنت۔ سنگین قلعے۔ جہازات            |
| ۲۷۰  | ہاروت و ماروت                                 | ۲۵۵  | شیاطین و جنات مسخر تھے۔                         |
| ۲۷۱  | مملکت سلیمان کے خلاف سازشیں                   | ۲۵۵  | ان سے کیا مراد ہے؟                              |
| ۲۷۲  | جادو کا سہ چشمہ بابل                          | ۲۵۷  | جیوش و عساکر                                    |
| ۲۷۳  | یہودیوں میں دہا ربھی وہیں سے پھیلی            | ..   | منطق الطیر۔ گھوڑوں کے رسالے                     |
| ..   | لیکن اُسے منسوب کر دیا گیا حضرت سلیمانؑ       | ۲۵۸  | وادی نمل  |
| ..   | کی طرف  | ..   | قوم سبا   |
| ..   | ایک اور افسانہ۔ اسمِ عظم کی کرات              | ۲۵۹  | ان کی مرقہ الخالی اور بربادی کا مختصر تذکرہ     |
| ۲۷۴  | قرآن کریم نے ان تمام اتہامات کی تردید فرمادی  | ..   | بربادی کے اسباب۔ نشہ قوت کی بدستیاں             |
| ۲۷۵  | لیکن خود ہمارے ہاں کا لٹریچر؟                 | ۲۶۰  | ہموس استعماریت                                  |
| ..   | بخاری شریف کی روایت                           | ۲۶۱  | ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کا واقعہ              |
| ۲۷۶  | گھوڑوں والے واقعہ کے متعلق مزید تصریحات       | ۲۶۲  | ہڈ ہڈ کون تھا؟                                  |
| ..   |   | ..   | ہڈ ہڈ کی اصطلاح                                 |
| ۲۷۹  | <b>حضرت ایوبؑ</b><br><b>علیہ السلام</b>       | ۲۶۳  | حضرت سلیمانؑ کی طرف سے پیغام                    |
| ..   |   | ..   | اس پیغام کا جواب                                |
| ۲۸۰  | نسبی سلسلہ اور زمانہ                          | ۲۶۵  | ملکہ کا تخت اور "عقریت"                         |
| ۲۸۱  | قرآن میں آپ کا ایک واقعہ                      | ۲۶۷  | بلورین صحن کا واقعہ                             |
| ..   | سانپ کے کاٹنے سے آپ بیمار ہو گئے              | ..   | ملکہ کا ایمان۔ یہ ہے واقعہ کا ماحصل             |
| ۲۸۲  | علاج کے لئے آپ کو معدنی چشموں کا سراغ دیا گیا | ۲۶۸  | حضرت سلیمانؑ کا جانشین۔ ایک بے جان دھڑ!         |
| ۲۸۳  | ایک مشکل مقام اور اس کا قرآنی مفہوم           | ..   | ایک عمیق نکتہ۔ کھوکھلی لکڑی کی اطاعت!!          |
| ..   | پھر وہی افسانے۔                               | ۲۶۹  | حضرت سلیمانؑ اور موجودہ تورات کی افسانہ طرازیوں |
| ..   |   | ..   | سحر و کہانت کی خرافات اور ان کا حضرت سلیمانؑ کی |

| صفحہ | مضمون  | صفحہ | مضمون                                       |
|------|--|------|---|
| ۲۹۵  | اصحاب الرس                                       | ۲۸۵  | عزم یونسی                                   |
| ۲۹۶  | اصحاب الحجر                                      | ۲۸۶  | حضرت یونسؑ شکستہ ق م                        |
| ۲۹۷  | (ایک اہم ضمنی گوشہ)                              | ..   | صاحب صحیفہ یونانہ                           |
| ..   | مستشرقین کی طرف سے قرآن کے خلاف                  | ..   | آپ کی قوم نے تنذیر سے عبرت پکڑ لی           |
| ..   | ایک عجیب اعتراض                                  | ۲۸۶  | تورات کا بیان                               |
| ..   | یعنی قرآن کے بعض قصص دو واقعات تاریخی            | ۲۸۷  | قرآن کریم کا بیان                           |
| ..   | اعتبار سے قابل اعتماد نہیں                       | ۲۹۰  | اہل نینوا کی سرکشی                          |
| ۲۹۷  | قرآن کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھے جانے میں ذرا بھی | ..   | تنذیر کے بعد عبرت                           |
| ..   | تأمل نہیں لیکن اسے قیاسات کی میزبانوں میں        | ..   | لیکن دوبارہ سرکشی اور بربادی                |
| ..   | تو نہ تو لیتے؟                                   |      |   |
| ۲۹۸  | ان کے پاس میزان ہے تاریخ                         |      |   |
| ..   | لیکن موجودہ تاریخ، یقیناً کادرجہ کس طرح          |      |   |
| ..   | حاصل کر سکتی ہے؟                                 |      |   |
| ..   | اثری انکشافات اور تاریخی نتائج                   | ۲۹۱  | پنکھڑیاں                                    |
| ۲۹۹  | خود مغربی مؤرخین کے نزدیک تاریخ کی حیثیت         | ..   | حضرت ادریسؑ                                 |
| ۳۰۰  | قرآن پر کس طرح ایمان رکھنا چاہیے؟                | ۲۹۲  | حضرت الیاسؑ                                 |
| ۳۰۱  | تاریخ کے متعلق یہ زاویہ نگاہ غیر سائنٹیفک نہیں   | ..   | حضرت ذوالکفلؑ                               |
| ۳۰۳  | ذوالقرنین  | ..   | چند اقوام جن کی طرف مبعوث شدہ انبیائے کرامؑ |
| ..   | (۶۰۰ - ۵۰۰ ق م)                                  | ..   | کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے                   |
| ۳۰۴  | ذوالقرنین سے کون مراد ہے؟                        | ۲۹۳  | قوم شمع                                     |
|      |  | ۲۹۴  | اصحاب الاخدود                               |

| صفحہ | مضمون                                      | صفحہ | مضمون  |
|------|--|------|--|
| ..   | شمالی ہم، کاکیشیا کی طرف                   | ..   | زمانہ حال کی اثری تحقیقات کا رخ                    |
| ۳۱۲  | یہاں کے لوگوں نے دیوار بنانے کی درخواست کی | ۳۰۵  | غالباً اس سے مراد خورس (سائرس)                     |
| ۳۱۳  | دیوار تعمیر کر دی گئی۔                     | ..   | یعنی کچھ دیر پہلے!                                 |
| ۳۱۴  | بصار و حکم، تمکن فی الارض، شان و شوکت      | ..   | بخت نصر کے ہاتھوں یہودیوں کی تباہی اور سارت        |
| ۳۱۵  | خدا کا انعام ہے، لیکن یہ قوت کمزور         | -    | اس ہجوم ناامیدی میں اُمید کی کرن                   |
| ..   | کی حفاظت میں صرف ہوگی، اس سے               | ..   | دانیال نبی کا خواب                                 |
| ..   | دماخ میں تاجر کے بجائے خدا ترسی کے         | ۳۰۶  | اور خواب کی تعبیر                                  |
| ..   | جو ہر پید ا ہوں گے۔                        | ۳۰۷  | فارس کا شاہنشاہ سائرس                              |
| ۳۱۶  | سائرس مذہب زرتشت کا پیرو تھا۔              | ..   | بابل پر حملہ اور یہودیوں کی وارستگی                |
| ..   | یا جوج دما جوج کون تھے؟                    | ..   | ہیکل کی دوبارہ تعمیر                               |
| ۳۱۷  | وسطی ایشیا (سطح مرتفع پامیر) کے            | ۳۰۸  | اس کے بعد دامن کاکیشیا میں بسنے والی قوم کی درختوں |
| ..   | وحشی قبائل                                 | ..   | پرستہ ذوالقرنین کی تعمیر                           |
| ۳۱۸  | ستہ ذوالقرنین شہر دہند کے قریب             | ۳۰۹  | ذوالقرنین اور قرآن کریم                            |
| ..   | واقع تھی۔                                  | ..   | پہلی ہم جانب مغرب (لیڈیا کی طرف)                   |
| ۳۱۹  | ان کی آخری یورش تباہی بغداد کے وقت۔        | ۳۱۱  | پھر مشرقی ہم (جانب بلخ)                            |

### جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

مصنف: غلام احمد پرویز  
 ناشر: طلوع اسلام ٹرسٹ  
 B - 25 گلبرگ - 2 لاہور  
 قیمت:

نام کتاب: برق طور  
 طالع: خالد منصور نسیم  
 مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز  
 3/2 فیصل نگر - لاہور  
 ایڈیشن: چارم ۱۹۹۳ء (بلا ترمیم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش آہنگ

پروفیز صاحب کی مایہ ناز تصنیف 'معارف القرآن' کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۴۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۴۵ء تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئیں۔ جب ان جلدوں کے نئے ایڈیشنوں کی طباعت کا سوال سامنے آیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ ان میں سے ہر جلد فی ذاتہ خود مکمل ہے اس لئے انہیں موضوع کے اعتبار سے 'الک الگ چھاپنا چاہیے۔ چنانچہ انہیں ان پانچ جلدوں میں شائع کیا گیا۔ من ویزداں، ابلیس و آدم، جوتے نور، برقی طور، شعلہ مستور۔ ان کتابوں کے وہ ایڈیشن بھی ایک عرصہ ہوا ختم ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ اس دوران میں پروفیز صاحب کی جدید تصنیفات شائع ہو رہی تھیں اس لئے ان کے جدید ایڈیشنوں کی طباعت کی باری جلدی نہ آ سکی اگرچہ اس کے لئے شائقین مسلسل اصرار کرتے رہے۔ ان کے اس اصرار اور وقت کے تقاضا کے پیش نظر ان کی طباعت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ اس سے پہلے ابلیس و آدم اور جوتے نور شائع ہو چکی ہیں۔ برقی طور اب پیش خدمت ہے۔ شعلہ مستور اور من ویزداں کی بھی کتابت ہو چکی ہے۔ اگر کاغذ کے حصول میں کچھ آسانیاں پیدا ہو گئیں تو اُمید ہے وہ بھی جلدی چھپ جائیں گی۔ ان کے ساتھ اگر معراج النبوت، جہان فردا اور کتاب التقدير کو بھی شامل کر لیا جائے (جو طبع شدہ موجود ہیں) تو اس سے معارف القرآن کا سلسلہ مکمل ہو جاتا ہے۔ زیر نظر ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے جس میں انہوں نے ضروری ترمیم و تفسیح اور حروف اضافہ کیا ہے۔ ان کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس میں اکثر مقامات ایسے آئے گئے جن میں آپ کو قرآن کریم کے مرقعہ تراجم و تفاسیر سے اختلاف نظر آئے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ پروفیز صاحب نے ان آیات کا یہ مفہوم کس طرح سے متعین کیا ہے ان کی لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی طرف رجوع کرنا مفید ہے گا۔ یاد رکھئے! پروفیز صاحب قرآنی آیات کا جو مفہوم پیش کرتے ہیں وہ لغت اور خود قرآن کریم کی سند کے بغیر نہیں ہوتا۔ حسب معمول آیات کے حوالہ میں، اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر مثلاً (۳/۲۱) سے مراد ہے سورۃ آل عمران کی اکتالیسویں آیت۔

طلوع اسلام ٹرسٹ اپنی اس سعادت پر نازاں ہے کہ اسے ان پیش بہا تصانیف کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔ دیے پروفیز صاحب کی تصانیف کے جملہ حقوق انہی کے نام محفوظ ہیں۔ دالستکلام

فَاتَّخِذْنَا إِلَىٰ مِثْقَلِ إِصْرٍ إِنْ تَعِصَىٰ الْاِحْزَارَ

# بر قتل

عُوجُ وَوَالِ اَلْعَمَلِ كَا عَمْرٍ اَنْكِر مَرْفَعُ

از کلمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ  
جگر بخش گار فید و بہ سینا نرسید

# حضرت موسیٰ علیہ السلام

## داستانِ بنی اسرائیل

یوں تو قصصِ قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور ہوں جوں نگہ دور رس غور و تدبر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے، ان کے حقائق و رموز، زمانہ کی تیج و رتیج لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی، اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کا ایک سبق آموز مرقع بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے۔ تین گوشے نمایاں

**فسادِ آدمیت کے تین گوشے** | طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے: استبدادِ حکومت کی کسرش

طفیانیاں، برہنیت کی خواب آور فریب کاریاں اور سرمایہ داری کی

پُر سکوت خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت و بربریت کے ایسے مولناک عفریت فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دیر پا کی پُرسکون روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک ہینگ و اثر در موجود ہوں، وہاں مخلوق خدا پر کیا گزر رہی ہوگی؟ تاریخِ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس

شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ، ہامان،

**اور تینوں یکجا** | برہنیت کی اہلیسا نہ رو باہ بازیوں کا پیکر اور قارون، سرمایہ داری کی لغتِ کلہب

بڑا نمائندہ، تینوں یک جا اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلائی انسانیت، حضرات انبیائے کرامؑ کی انقلاب انگیز بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جو رواستباد سے چھڑا کر براہ راست قانونِ خداوندی کی اطاعت میں لے آئیں۔ جو قومیں اس قسم کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت کلیتہً کھو چکتی ہیں وہ اپنے اعمال کے فطری نتائج کی بنا پر ہلاک ہو جاتی ہیں۔ لیکن جن میں ہنوز ”صحت یابی“ کا امکان ہوتا ہے ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی نئی نسل میں صحت یابی کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ ایک بے کس و مظلوم قوم کو، ایک سرکش قوم کے دندانِ حرص و آزار پر پنجہ خویش سے چھڑانے کے لئے کس قدر کوہِ تمثال پیکرِ جبروت و جلال اور مظہرِ استقامت و استقلال، مصلحِ اعظم کی ضرورت تھی جو قانونِ خداوندی کی راہِ نمائی میں باطل کی ان انسانیت سوز قہرمانی قوتوں کے استیصال کے لئے مقابلہ میں آئے اور اپنی ضربِ کلیمی سے، استبداد و فرعونیت کے ان طاغوتی مجتہدوں کو پاش پاش کر دے۔ وہ تھی قوم اور یہ تھے اس قوم کی کشتی کے ناخدا! لہذا قرآنِ کریم جس کے پیشِ نظر، استبداد و قہرمانی کی طاغوتی قوتوں کی تخریب اور انسانیت کی سرفرازی و برومندی کا مقصدِ عظیم ہے، اس قوم کے احوال و کوائف اور اس داعیِ انقلاب کے تذکارِ جلیلہ کو جس قدر بھی شرح و تفصیل سے بیان کرتا ہوں اور ضروری تھا۔

**بنی اسرائیل اور یہودی** | ”جوئے نور“ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مرو خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ، فلسطین کے علاقہ ’JUDA‘ میں حکمران تھا۔ انہیں اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق عام طور پر باقی نہ رہی۔ اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن ”جوئے نور“ میں بیان کردہ قصہ حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ (حضرت یوسفؑ) نے اپنے والدِ بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی یہاں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے، پھلے۔ اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ یہ ہے وہ زمانہ جس سے ہمارے

موجودہ قصہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کا زمانہ قریب (۲۱۰۰ ق.م) تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ قریب (۱۴۰۰/۱۳۰۰ ق.م) قیاس کرنا چاہیے۔ قصہ حضرت یوسفؑ میں ہم فرعون کے لفظ سے آشنا ہو چکے ہیں۔ یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں، بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال (ق.م) سے لے کر سکندر کے زمانہ تک، فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں ہیگسوس (HYKSOS) کا خاندان برسر حکومت تھا جنہیں عمال فقہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی یہی خاندان مصر پر حکمران تھا۔ لیکن بعض علمائے اثریات و مکتشفین مصریات کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ابتدائی زمانے کے فرعون کا نام رمسیس ثانی (RAMESES II) تھا اور خروج کے وقت کا بادشاہ اس کا بیٹا منفتاح (Merneptah) تھا۔ اگرچہ بعض شواہد اس کی تردید کرتے ہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ منفتاح کے زمانہ کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل فلسطین میں متمکن ہو چکے تھے (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)۔ بہر کیف عام اندازہ یہی ہے کہ یہ زمانہ (۱۵۰۰ ق.م) سے پہلے کا ہے۔ یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآن کریم بحث نہیں کرتا، اس لئے کہ اس کا کام ان حقائق کو پیش کرنا ہے جو ان واقعات میں مضمر ہیں، نہ کہ وقائع نگاری۔

لے فراعنہ کا سب سے آخری خاندان اہل فارس کا تھا جسے سکندر نے (۳۳۲ ق.م) میں شکست دی تھی۔

۲۔ چرواہے بادشاہ۔ قیاس یہ ہے کہ دراصل یہ عرب قبائل ہی کی ایک شاخ تھی۔

۳۔ ڈاکٹر BREASTED کی کتاب A HISTORY OF EGYPT مصر قدیم کی تاریخ پر مشہور

تصنیف ہے (اس وقت میرے سامنے اس کا ۱۹۵۴ء کا ایڈیشن ہے) اس کی تحقیق کی رو سے میکسوس کا زمانہ

۱۴۸۸ سے ۱۵۸۰ ق.م تک کا تھا اور رمسیس ثانی کا عہد ۱۳۹۲ لغایت ۱۳۲۵ ق.م۔ منفتاح نے ۱۳۲۵ سے

۱۳۱۵ ق.م تک حکومت کی تھی۔



ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس چار سو سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل مصر میں ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے جو اہل مصر سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ جیسا کہ انسانی حکومتوں کا قاعدہ ہے، فرعون مصر اس

**فرعون کا خطبہ** ”اجنبی“ قوم کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ تورات میں ہے:-

لیکن اسرائیل کی اولاد بڑھ رہی تھی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور نہایت زور پیدا کیا اور وہ زمین ان سے معمور ہو گئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پایا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا، دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ اور ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جاویں۔ اس لئے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھ سے ستائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر توم اور رمیس بنانے پر انہوں نے جتنا انہیں دکھ دیا وہ زیادہ تر بڑھے اور فراواں ہوئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے سبب ناخوش ہوئے اور مصریوں نے خدمت کر دینے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کر دے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کرتے تھے مشقت کی تھیں۔ (خروج ۱-۱۴)

فرعون کے قلب و دماغ پر یہ خوف اس درجہ مسلط ہو گیا کہ اس نے یہیں تک اکتفا نہیں کیا بلکہ تورات کے بیان کے مطابق یہ حکم بھی دے دیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ان کی بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔

تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دینی جنابوں کو جن میں سے ایک کا نام سفہ اور دوسری کا نام فوتمہ تھا، بلا کر کہا۔ اور اس نے کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو اور تم انہیں پتھروں پر دیکھو۔ اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کرو اور اگر بیٹی ہو تو اسے چھوڑ دو۔



اسی قسم کا خوف لاحق ہوا ہو۔ ان کا گھرانہ بڑا معزز نظر آتا ہے۔  
بہر حال قرآن نے یَسُوْ مُؤْنُکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ کہہ کر ان تمام مظالم کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو ایک مستبد  
حاکم قوم، محکوم قوم پر روا رکھا کرتی ہے۔ یہ ہے وہ زمانہ جب حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا۔

**پیدائش حضرت موسیٰ** | حضرت موسیٰ کی پیدائش دارالسلطنت میں ہوئی۔ آپ پیدا تو ہوئے  
محکوم قوم کے گھرانے میں لیکن مشیت کا پروگرام کچھ اور تھا۔ قصہ  
حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ جب مشیت کو منظور ہوا کہ کنعان کا چرواہا، منصب حکومت پر متمکن  
ہو تو آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے کس طرح آپ کو مصری محلات میں پہنچایا گیا۔ یہاں بھی مشیت  
کو یہ منظور تھا کہ حضرت موسیٰ سیاست مصر کے رموز و اسرار سے واقف ہوں، اس لئے آپ کی ابتدائی  
پرورش و تربیت کے لئے بھی مصر کے شاہی محلات کو منتخب کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل محکومیت کی  
زندگی بسر کر رہے تھے اور محکومیت بھی ایسی ذلت و بے کسی کی، ان حالات میں انہیں امور مملکت میں حصہ  
لینے کا کوئی موقع نہ تھا۔ مستبد حکومتیں، غلاموں کو شریک حکم نہیں کیا کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ (بقول علامہ  
اقبالؒ) ان کے ”جوہر ادراک“ خرید لیتی ہیں۔ اندر میں حالات حضرت موسیٰ کے لئے امور سیاست و حکومت  
سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے مشیت ایزدی نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ آپ کی  
پرورش اس انداز سے ہو کہ رموز سیاست و مملکت سب آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ تورات میں چونکہ  
”ذبح ابناء“ سے مفہوم لڑکوں کا سچے مچ قتل کر دینا لیا گیا ہے اس لئے حضرت موسیٰ کی پیدائش کے سلسلہ میں  
وہاں مذکور ہے کہ فرعون نے اگرچہ مصری دایوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک  
کر دیا کریں۔ لیکن اس حکم کی شدت سے پابندی نہیں ہو رہی تھی۔

پردائی جنائیاں خدا سے ڈریں اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے انہیں حکم کیا تھا نہ کیا اور لڑکوں کو جیتا

رہنے دیا۔ (خروج ۱/۱۷)

قرآن میں ہے کہ بچے کی پیدائش پر (حضرت موسیٰ کی) والدہ کو تردد لاحق ہوا۔ اگر فرعون کا حکم  
بچوں کو سچے مچ قتل کرنے کا تھا تو یہ تردد بچے کی جان کی حفاظت کے لئے ہو سکتا  
**سپرد دریا** | لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر اس حکم سے مراد یہی تھی کہ معزز خاندانوں کے

بچوں کو ایسی ذلت کی حالت میں رکھا جائے جس سے ان کے جوہر مردانگی اور خصائص آدمیت تباہ و برباد ہو جائیں تو ایک حساس ماں کے لئے یہ چیز بھی کچھ کم وجہ پریشانی نہیں ہو سکتی۔ بہر حال قرآن میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی والدہ کو اس قسم کا تردد لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی برگزیدہ بندے (نبی) کی وساطت سے اس کی طرف یہ حکم بھیجا کہ وہ بچے کو دریا میں بہا دے۔

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا رَٰخَتْ عَلَيْهِ فَلَقِيْهِ  
فِي الْيَمِّ ۚ لَا تَخَافِ ۚ وَلَا تَحْزَنِ ۚ اِنَّا رَاٰدُوْهُ الْاِلٰكِ ۚ وَ جَاعِلُوْهُ  
مِّنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۸/۴)

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف یہ حکم بھیجا کہ بچے کو دودھ پلاؤ اور جب اس کے متعلق خوف (محسوس) ہو تو اسے دریا میں ڈال دو۔ اور (دیکھنا دریا کے سپرد کر دینے میں) نہ ڈرنا نہ غم کھانا۔ ہم اسے تیری طرف واپس لے آئیں گے اور اسے اپنے برگزیدہ رسولوں میں سے بنائیں گے۔

غور کیجئے اُمّ موسیٰ کو کس قدر تسکین دی جا رہی ہے اس لئے کہ کسی ماں سے یہ کہہ دینا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دے اس کے قلبِ حزیں میں اضطراب و بیتابی کا تلاطم اور یاس و الم کی قیامت برپا کر دینا تھا۔ خدا کا حکم ہی ایسا کر سکتا تھا۔ (اس سے نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا گھر انہ کس قدر خدا پرست تھا، یعنی اس کے احکام کا اطاعت گزار) چنانچہ وقت آنے حضرت موسیٰ کی والدہ نے بچے کو دریا میں بہا دیا۔ لیکن مامتا کی بے تابی! بیٹی سے کہا کہ ذرا دُور ہٹ کر دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہو اور دیکھتی رہو کہ بچے پر کیا گذرتی ہے۔

وَ قَالَتْ لِاُخْتِهِ قُصِّيْهِ ۚ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَ هُمْ  
لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲۸/۱۱)

اور (موسیٰ کی ماں نے) اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ سو وہ اسے دُور دُور سے دیکھتی رہی اور (فرعون کے لوگوں نے) محسوس بھی نہ کیا (کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے)۔

بچہ صندوق میں بے جا رہا تھا کہ ایک موج نے صندوق کو جانبِ ساحل پہنچا دیا جہاں وہ مصری لوگوں

کی نظر پڑ گیا جو (معلوم ہوتا ہے کہ) محلات شاہی سے متعلق تھے۔ انہوں نے بچے کو باہر نکالا اور  
 فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا ۖ إِنَّ فِرْعَوْنَ وَ  
 هَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِبِينَ ۝ (۲۸/۸)  
 پس فرعون کے لوگوں نے اسے لے لیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمن اور (موجب) غم و الم ہو۔  
 فرعون اور ہامان اور ان کے لاؤشکر بلاشبہ خطا کار تھے (اور ان کی خطا کاریوں کی سزا اس  
 بچے کے ہاتھوں ملنے والی تھی)۔

**کہاں سے کہاں؟** | وہ بچے کو محلات شاہی میں لے آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انہوں نے  
 (بچے کے خط و خال) سے اندازہ لگا لیا کہ وہ اسرائیلیوں کا بچہ ہے اس  
 لئے اسے نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ لیکن بچوں کے معاملہ میں فطرتِ نساہیت کا تقاضا  
 کچھ اور ہوتا ہے فرعون کی بیوی نے جب بچے کو دیکھا تو اپنے خاوند سے کہا کہ اسے مار نہ دیا جائے یا ذلیل  
 حقیر سمجھ کر پھینک نہ دیا جائے۔ اسے میں اپنی گود میں لے لینا چاہتی ہوں۔ (غالباً ان کے ہاں اس وقت  
 تک کوئی اولاد نہیں تھی)۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّةُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ ۖ عَسَى  
 أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ يَتَّخِذَ آلَ دَاوُدَ ۖ لَهُمْ لَآ يَشْعُرُونَ ۝ (۲۸/۹)  
 اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ (یہ بچہ) میرے لئے اور تیرے لئے آنکھ کی راحت (ہو سکتا) ہے۔  
 اسے مار نہ ڈالو (یا ذلیل نہ کرو) شاید وہ ہمارے لئے نفع کا موجب ہو یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنالیں۔  
 لیکن وہ نہیں جانتے تھے (کہ مشیت کے پروگرام کیا ہیں؟)۔

”وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ“ پر غور فرمائیے کہ قرآن کریم کا حسن بلاغت کس قدر دلآویز ہے۔ ایک واقعہ بیان ہو رہا  
 ہے لیکن ذہن کو کہانی کی دل چسپی میں کھونے نہیں دیا جاتا بلکہ اسے فوراً آل (نتیجہ) کی طرف منتقل کر دیا جاتا  
 ہے۔ تشبیہ سے گریز کا یہ اسلوب کس درجہ لطیف ہے؟

لے قرآن نے فرعون کی بیوی کے ایمان کی بھی شہادت دی ہے (۱۱/۶۶) اس لئے انسانی بچوں کے ساتھ یہ جذبہ محبت ایمان  
 کا تقاضا (یا نتیجہ) بھی ہو سکتا ہے۔

جب بیٹی نے ماں سے آکر کہا ہوگا کہ بچے کو فرعون کے لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں تو ماں کا دل بیم ورجا کی کش مکش میں جس قدر طلسم بیچ و تاب بنا ہوگا نظر ہر ہے۔ دیکھتے قرآن کریم نے اس نفسیاتی کیفیت کو کیسے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے:

وَ أَصْبَحَ فُجُودًا أُمِيرَ مُوسَىٰ فِرْعَاوْنُ ۖ إِنَّ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن  
رَبَّنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لَتَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲۸/۱۰)

اور موسیٰ کی ماں کا دل (صبر و شکیب سے) خالی ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ (دو فوراً اضطراب سے) اس راز کو افشا کر دیتی اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو کہ خدا نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا ہو کر رہے گا)۔

اگر ہم اس کے دل کو تھامے نہ رہتے تو بعید نہ تھا کہ وہ بوحسب محبت میں مصلحت کو شیوں کو یکسر بھول جاتی اور راز کو چھپانہ سکتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا سکون عطا فرما دیا کہ اس نے دل پر قابو رکھا۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰ کی بہن، صندوق کو دیکھتی جا رہی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ بہن نے وہیں تک ہی تعاقب نہیں کیا بلکہ محلات کے اندر تک رسائی کا انتظام بھی کر لیا (شاید خادمہ کی حیثیت سے پہنچ گئی ہوں یا پہلے ہی سے محل تک ان کی رسائی ہو۔ قرآن سے ایسا ہی پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد فرعون کی بیوی سے جو باحیث ہوتی ہے وہ اجنبیوں جیسی نہیں بلکہ متعارف حیثیت لئے ہوئے ہے)۔ محل میں فیصلہ ہو گیا کہ فرعون کی بیوی بچہ کی پرورش کرے گی۔ اب مشیت، اپنی تدبیر کی دوسری کڑی سامنے لے آئی۔ بہتیری اتائیں دودھ پلانے پر متعین کی گئیں لیکن بچہ ہے کہ کسی کی طرف دھیان ہی نہیں کرتا۔ فکر لاحق ہوئی کہ اب کیا کیا جائے؟ اسکا علاج بچہ کی بہن نے (بغیر بتائے کہ بچہ کون ہے) تجویز کر دیا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ  
بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ۝ (۲۸/۱۲)

اور ہم نے بچہ کو پہلے ہی سے دودھ پینے سے روک دیا۔ سو (اس کی بہن نے) کہا کہ کیا میں تمہیں ایسا گھرانہ بتاؤں جو اسے تمہارے لئے نہایت خیر خواہی سے پال پوس دے۔

یہ دودھ پلانے والی کون تھی؟ خود اُمّ موسیٰ۔

فَرَادَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَىٰ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ

اَللّٰهُ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۸/۱۳)

سو ہم نے موسیٰؑ کو (یوں) اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے (کہ مشیت۔ اپنی تدابیر کس طرح بڑے کار لایا کرتی ہے)۔

جب حضرت موسیٰؑ کو شرفِ نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس احسان کی بھی یاد دلائی تھی۔ (دیکھئے ۳۷-۲۰/۲۰)

**ایوان شاہی میں پرورش** | یوں حضرت موسیٰؑ نے ایوانِ شاہی میں پرورش پائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و بصیرت اور رموز و اسرارِ مملکت سے بہرہ یاب فرمایا۔  
وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَدَعْلَمًا ۖ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (۲۸/۱۴)

اور جب (موسیٰؑ) اپنی جوانی کو پہنچا اور (ہر طرح سے) توانا ہو گیا تو ہم نے اسے علم و حکم عطا کیا اور اس طرح ہم ان لوگوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔

”محسنین“ سے صاف ظاہر ہے کہ آپؑ کی کیفیتِ محلات میں پرورش یافتہ امیرزادوں کی سی نہ تھی جن کی زندگی بالعموم جوانی کی رنگین مستیوں میں شرابور ہوتی ہے۔ بلکہ آپؑ پر ماحول کا کچھ اثر نہ تھا اور آپؑ دماغی قابلیت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کی نعمت سے بھی سرفراز کئے گئے تھے۔ یہی ایک رسولؑ کی سیرت کا خاصہ ہے کہ وہ (زمانہ قبل از نبوت میں بھی) ماحول سے متاثر نہیں ہوتی۔ (تفصیل: ”ابلیس آدم“ میں وحی کے عنوان میں گزر چکی ہے)۔

اب ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی۔ ایک دن وہ سو فتنہ میں شہر کا چکر لگا رہے تھے کہ دیکھا ایک اسرائیلی اور ایک قبلی (قومِ فرعون کا فرد) **قبلی کا قتل** | آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے آپؑ سے فریاد کی۔ آپؑ نے اسے برحق سمجھتے ہوئے قبلی کے مکتا مارا۔ مارا تو مکتا ہی تھا لیکن اس میں ضربِ کلیبی کی جلالت پہناں تھی۔ قبلی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا ارادہ قتل کا نہیں تھا، محض تا دیبا مکتا مار دیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اس سے مرہی گیا آپؑ کو بہت افسوس ہوا۔ قرآن میں ہے۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ ۖ ..... قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ۝ (۱۵-۲۸)

وہ شہر میں اس کے باشندوں کی غفلت کی حالت میں داخل ہوا تو اس میں دو شخصوں کو لڑتے پایا۔ ان میں سے ایک اس کی قوم میں سے تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے تھا۔ جو اس کی قوم میں سے تھا اس نے موسیٰ سے اپنے دشمن کے خلاف مدد مانگی۔ پس موسیٰ نے (دوسرے) شخص کو غلطی پر سمجھتے ہوئے اسے ایک مٹکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (جب دیکھا کہ وہ تو مر ہی گیا تو فرطِ تاسف سے کہا کہ اوہو) یہ تو شیطان کے عمل کی وجہ سے ہو گیا۔ وہ یقیناً دشمن اور گھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے۔

عرض کیا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے۔ سو تو میری حفاظت فرما۔ سو اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی کہ وہ غفور الرحیم ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ میرے رب! اس لئے کہ تو نے مجھ پر (اس حفاظت سے) انعام کیا ہے میں (اب) کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔

آخری آیت سے تشریح ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ قصور دراصل اسرائیلی کا تھا۔ لیکن اس سے پہلے آپ کو اس کا علم نہ تھا۔ اس لئے کہ جو شخص دیدہ و دانستہ کسی مجرم کی حمایت کرے اسے اپنے کئے پر تاسف و ندامت نہیں ہوا کرتی۔

**اسرائیلی کی حمایت کیوں تھی؟** | یہ بھی واضح رہے کہ اسرائیلی کی حمایت کسی نسلی عصبیت کی بنا پر نہ تھی۔ ہم شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ ہزار انبیائے کرام کے نزدیک نسلی عصبیت، حتیٰ کہ خون کے رشتے بھی، کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک بگاڑت اور بیگانگی کا معیار حق و باطل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کی تبلیغ کے لئے ان کی بعثت ہوئی ہے۔ (اور ان کا طرزِ عمل نبوت ملنے سے پہلے بھی اپنی اصولی تعلیم کے خلاف نہیں ہوتا)۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں قبلی مستبد قوتوں کے مالک تھے اور اسرائیلی بے حد مظلوم و مقہور۔ اس لئے آپ پر مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت ضروری تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ آپ بھی نسلی اعتبار سے اس قوم سے متعلق



تھے جو مظلوم تھی۔ ورنہ اگر قبلی مظلوم اور اسرائیلی بالادست ہوتے تو آپ یقیناً قبیلوں کے طرفدار ہوتے یا اگر اسرائیلی مظلوم تھے تو خواہ آپ قبلی النسل ہی کیوں نہ ہوتے آپ مظلوموں کی حمایت کرتے۔ اس لئے آپ نے جب قبلی کو مٹکا مارا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ دوسری قوم کا فرد تھا، بلکہ اس لئے کہ قبیلوں کے مظالم اور اسرائیلیوں کی مظلومیت ایک ایسی مسلمہ حقیقت تھی جس کے لئے بدابہتاً کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن بعد میں تأسفِ ندامت اس لئے تھا کہ ایک کلمہ کے ماتحت اسرائیلی کو مظلوم کیوں سمجھ لیا اور اصل بات کی تحقیق کیوں نہ کی؟

دوسرے دن حضرت موسیٰ پھر شہر میں جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی کسی اور سے جھگڑ رہا ہے۔ اُس نے آپ کو پھر مدد کے لئے پکارا۔ آپ نے کہا کہ تم بڑے جھگڑالو ہو۔ ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے ہو۔

فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ  
يَسْتَصْرِحُهُ ۖ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ ۝ (۲۸/۱۸)

موسے (دوسرے دن) صبح شہر میں آیا۔ ڈرتے ڈرتے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے (یہ جاننے کے لئے کہ کل کے واقعہ کا شہر میں کیا چرچا ہے۔ وہ اس طرح جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا) وہی شخص جس نے اس سے کل مدد مانگی تھی اسے مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ موسے نے اسے کہا کہ تو بڑا غلط کار ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی نے جب کیفیت بیان کی تو حضرت موسیٰ کو یقین ہو گیا کہ آج وہ فی الواقعہ مظلوم ہے اور قبلی اس پر زیادتی کر رہا ہے۔ ورنہ اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ اسرائیلی مجرم ہے تو حضرت موسیٰ کبھی اس کی حمایت کے لئے آگے نہ بڑھتے اس لئے کہ ابھی کل ہی آپ نے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ (کہ میں مجرموں کا کبھی مددگار نہیں بنوں گا)۔ اس لئے آپ اسرائیلی کو مجرم جانتے ہوئے اس کی مدد کے لئے کبھی نہیں بڑھ سکتے تھے۔ آپ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کل کے واقعہ قتل کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ اس لئے یہ قبلی دستِ قضا کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر چلا آیا۔

لے واضح رہے کہ قرآن کریم کسی قصہ کی تمام کڑیاں بیان نہیں کرتا بلکہ ان کڑیوں کو چھوڑ جاتا ہے جو قصہ کے سیاق و سباق کا لازمی نتیجہ ہوں اور نفسِ واقعہ یا قصہ کے کرداروں سے واقف انسان انہیں باسانی پُر کرے۔ واقعہ زیرِ نظر میں آیت ۱۵ اور ۱۹ کے درمیان اتنا حصہ محذوف ہے کہ اسرائیلی نے جب واقعہ بیان کیا تو حضرت موسیٰ کو یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقعہ مظلوم ہے اس لئے آپ اس کی حمایت کے لئے آگے بڑھے۔ اس قیاس کی دلیل وہی وعدہ ہے جو آپ نے اپنے رب سے کیا تھا اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْبُطْشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۖ قَالَ يَمُوسَىٰ  
أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَوْسِ قَبْلَ ۚ إِنَّ تَرِيدُ إِلَّا  
أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَوْسِ ۚ وَمَا تَرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ۝

(۲۸/۱۹)

جب (موسےؑ نے) ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لے جو (اُن) دونوں کا دشمن تھا (یعنی قبطی) تو اس (قبطی) نے کہا کہ اے موسے! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر دے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ تیرے تو یہ ارادے دکھائی دیتے ہیں کہ ملک میں (سب سے زیادہ) جابر تو ہی ہو جائے۔ تو تو اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔

یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ فرعون اور اس کے اراکین سلطنت کو حضرت موسےؑ کے اسرائیلی ہونے کا علم ہو چکا تھا یا نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ مظلوم اسرائیلیوں کے متعلق آپ کا جذبہ ہمدردی اور انصاف کی ترادد میں اسرائیلی اور قبطی کے درمیان عدم امتیاز ان لوگوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ہوگا۔ وہ اس فکر میں ضرور ہوں گے کہ کوئی واقعہ ملے تو آپ پر ہاتھ ڈالا جائے اور اس "فتنہ" کو وہیں دبا دیا جائے۔ اب جو یہ واقعہ سامنے آگیا تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مشورہ کیا کہ حضرت موسےؑ کو قبطی کے قتل کے **سازش** جرم میں قتل کر دیا جائے تاکہ یہ مستقل کانٹا لگ ہو جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی نیک طینت اللہ کا بندہ بھی تھا جو دل سے حضرت موسےؑ کی اس انصاف پسندی اور مظلوم نوازی کا قدر دان تھا۔ قبل اس کے کہ ارباب حکومت کا مشورہ، فیصلہ کی صورت اختیار کرے وہ بھاگا بھاگا آیا اور حضرت موسےؑ کو اطلاع کر دی کہ ان کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔

وَجَاءَ دَجْلُ بْنُ أَقْصَا الْمَدْيَنَةِ يَسْعَىٰ ذَا قَالَ يَمُوسَىٰ إِنَّ  
الْمَلَأَ يَأْتِمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنَّي لَكَ مِنَ  
الْمُصْلِحِينَ ۝ (۲۸/۲۰)

اور شہر کے آخری کنارہ کی طرف سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ اے موسے! بڑے بڑے لوگ (اراکین سلطنت) تیرے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیا جائے۔ سو تو (یہاں سے) نکل جا۔ میں تیرے نیر خواہوں میں سے ہوں۔

چنانچہ اس پر حضرت مولیٰ مصر سے نکل آئے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۚ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ  
الظَّالِمِينَ ۝ (۲۸/۲۱)

سو (مولیٰ) ڈرتے ہوئے اس کی نگرانی کرتے ہوئے (کہ پیچھے سے کوئی آن نہ پکڑے) وہاں سے  
نکل پڑا اور عرض کی۔ اے میرے رب! مجھے ان ظالموں سے بچائے رکھو۔

مصر کے بعد مدین اور منزل دو نوں متعین تھے۔ مدین کی طرف رخ کر لیا اور نگاہیں آسمان کی طرف  
اٹھائیں کہ بھولے بھٹکوں کو وہیں سے نشانِ راہ مل سکتا ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تَلَفَّأَ ۚ مَدِينَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي  
سَبِيلَ ٱلسَّبِيلِ ۝ (۲۸/۲۲)

اور جب (مولیٰ نے) مدین کی طرف رخ کیا تو کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھے سیدھے راستے  
پر لگا دے گا۔

چلتے چلتے مدین کی بستی کے قریب پہنچے۔ زبردست مظلومیت اور بالادست کا استبداد جو مصر میں چھوڑ آئے  
تھے یہاں بھی موجود تھے۔ پیادہ پر اہل مدین اپنے موشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔  
مدین کا پیادہ ”قوت کا حق مستبد“ (MIGHT IS RIGHT) زبردست اپنے  
موشیوں کو آگے بڑھا رہے تھے اور دو کمزور اور ناتواں لڑکیاں اپنے جانوروں کو الگ لئے کھڑی تھیں کہ ان کے  
موشی پانی پی جائیں تو تلچھٹ ان کے جانوروں کے حصّے آجائے۔

وَلَمَّا دَرَدَ مَاءَ مَدِينَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةٌ مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ ۚ وَ  
وَجَدَ مِنْ دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۚ قَالَتَا  
لَنُفِيقَ ۚ حَتَّىٰ يُصَدَرَ ٱلرَّسَالُ ۚ سَكَتَ ۚ وَابْجُونا شَيْخًا كَبِيرًا ۝ (۲۸/۲۳)

لے (گندہ شہ صفحہ کا فٹ نوٹ) ”سول لائن“ کی طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑا آدمی تھا۔ جی بھی تو اسے  
ارکانِ سلطنت کی اس سازش کا علم تھا۔

اور جب (موسےؑ) مدین کے پیاد پر پہنچا تو وہاں کچھ لوگوں کو (موشیوں کو) پانی پلاتے دیکھا۔ (آدمیوں کے علاوہ) دو عورتوں کو بھی دیکھا جو (اپنے جانوروں کو) روک رہی تھیں۔ موسےؑ نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے (یوں الگ کھڑی ہوئی اپنی بکریوں کو روک کیوں رہی ہو؟) انہوں نے کہا کہ جب تک (یہ) چرواہے اپنے جانوروں کو نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلا سکتیں۔ (اس لئے کہ ہم کمزور عورتیں ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن، اشارہ ہی اشارہ میں کتنی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ان کی بھیڑیں یاس سے بے تاب ہیں اس لئے بھاگ بھاگ کر پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں (انہیں معلوم نہیں کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کی بھیڑیں ہیں اس لئے انہیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ امیروں اور طاقتوروں کے موشیوں کے ساتھ پانی پی سکیں۔ لیکن لڑکیاں اس حقیقت سے باخبر تھیں۔ اس لئے بھیڑیں آگے بڑھ رہی تھیں اور یہ انہیں روک رہی تھیں)۔

دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا جائے گا جب تک انسان خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا نہیں سیکھے گا!

بہر حال، حضرت موسےؑ نے جب یہ بات سنی تو آپ آگے بڑھے اور ان کمزوروں کے جانوروں کو خود پانی پلایا اور پھر وہیں سائے میں آکر بیٹھ گئے اور دل میں کہنے لگے کہ بہر زمینے کہ رفیقہ آسمان پیدا است

مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق و انصاف کے بجائے قوت و استبداد کا حکم نافذ تھا۔ جی میں تھا کہ کسی ایسی زمین میں جاسوں جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو لیکن یہاں تو کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں طاغوتی قوتیں درندوں کی طرح پھری نہ پھری ہوں۔

فَسَفَى لَهُمَّا ثُمَّ تَوَلَّى إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ۝ (۲۸/۲۴)

سو اس نے ان عورتوں کے (موشیوں کو) پانی پلایا اور پھر سایہ کی طرف لوٹ آیا اور (یہ سب ماجرا دیکھ کر) عرض کیا کہ اے میرے رب! تو جو بھلائی میری طرف بھیجے میں اس کا

غور کیجئے۔ یوں تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے (بلکہ یوں کہیے کہ سلسلہ داستان کے ضمنی گوشہ کی ایک ہلکی غور کیجئے۔ یوں تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے) لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اسی کڑی | **فطرت کی فیاضیاں اور انسانی تصرفات** | اس ذرہ میں کتنی بڑی حقیقتوں کے آفتاب

جھلک رہے ہیں۔ مبدار فیض نے اپنی کرم گستری سے جو چیزیں نوع انسانی کی پرورش کے لئے بلا مزد معاوضہ عطا کی ہیں، طاغوتی قوتیں ان پر بھی اپنا تسلط جمالیتی ہیں اور کمزوروں کا ان میں کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ مستبد قوتیں انہیں اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور باقی انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کی یہ وسیع و عریض زمین، دریاؤں کے زرخشاں پانی، زمین کے خزانوں و دفائن سب خدا کی عطا فرمودہ نعمتیں ہیں جو کسی انسان نے اپنے کسب و ہنر سے پیدا نہیں کیں۔ لہذا ان پر ذاتی قبضہ ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ لہذا ان کی تقسیم اس طرح نہیں ہونی چاہیئے کہ جو صاحب قوت و اقتدار ہو وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے قبضہ میں کر لے اور کمزور و ناتواں نان شبینہ تک کے بھی محتاج ہو جائیں۔ ان کی تقسیم انسانی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ جسے جس قدر ضرورت ہو اسے اس قدر مل جائے۔ اس لئے رزق کے سرچشموں پر کسی کا انفرادی قبضہ اور ملکیت جائز نہیں قرار پاسکتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟  
کون لایا کھینچ کر پچھتسم سے باد ساز گار؟ خاک یہ کس کی ہے کہاں کا ہے یہ نورِ آفتاب؟  
کس نے بھردی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے کھلائی ہے نئے انقلاب؟

وہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

لیکن یہ حقیقت منتظر اس وقت تک لباسِ مجاز میں نہیں آسکتی جب تک مبدار فیض کی ان کرم گستریوں کی تقسیم انسانوں سے چھین کر اسی مبدار فیض کے سپرد نہ کر دی جائے جو ان تمام چیزوں کا حقیقی مالک اور رب العالمین ہے۔ اسی کا نام حکومتِ خداوندی ہے جس کے قیام و بقا کے لئے آسمانی رشد و ہدایت کے

سلسلہ کی ضرورت پڑی۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔

لڑکیاں اپنے باپ کے پاس آئیں اور اس واقعہ کا ذکر کیا۔ واقعہ تھا بھی قابلِ ذکر۔ اس لئے کہ ”قوت“ کا کمزوروں کی مدافعت میں صرف ہونا کسی اور دیس کی ریت تھی۔ ان کی بستی میں اس روش سے کون آشنا تھا؟ وہ اپنے گھر میں بے شک اس اصول کے چرچے سنتی ہوں گی۔ لیکن باہر کی دنیا میں ایسا صاحبِ قوت و سطوت کہاں دکھائی دیتا ہوگا۔ جوابی قوت کو بیچاروں اور در ماندوں کی حمایت میں صرف کر دے؟ باپ نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ، ایسے سعادت اطوارِ محسن کو گھر لے آؤ۔

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۖ قَالَتْ إِنَّ ابْنِي يَأْتِي الْغُلَاقَ  
لِيُخْرِجَنِي ۖ أَجْرًا مَّا سَقَيْتَ لَنَا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ ۖ وَ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ  
قَالَ لَا تَخَفْ ۖ قَفْ يَخْوَفَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ (۲۸/۲۵)

سوان دور لڑکیوں، میں سے ایک (نہایت شرم و حیا سے مونسے کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد نے آپ کو بلایا ہے تاکہ آپ نے جو ہمارے (موشیوں کو) پانی پلایا ہے اس کا اجر خدمت دیں۔ سو جب (مونسے) اس کے پاس آیا اور اس سے اپنی مرگندشت بیان کی تو اس نے کہا کہ خوف مت کھاؤ۔ تم ظالموں (کی گرفت) سے بچ گئے۔

جب حضرت مونسے وہاں ٹھہر گئے تو ایک لڑکی نے اپنے والد سے تجویز کیا کہ اس صالح نوجوان کو اپنے ہاں ملازم کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَأْبَتِ اسْتَأْجِرُهُ ۖ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ  
الْقَوِيُّ الْآمِنُ ۝ (۲۸/۲۶)

ان میں سے ایک لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! اسے (اپنے ہاں) کارندہ کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ بہترین کام کرنے والا ثابت ہوگا۔ (اس لئے کہ یہ) قوی بھی ہے اور امین (دیانت دار) بھی۔

آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ معتمد علیہ کے لئے کیا کیا جوہر ضروری ہیں؟ صاحبِ قوت ہو، تاکہ وہ ہر طرح کا انتظام کر سکے اور اس کے ساتھ ہی امین بھی ہو۔

لڑکیوں کے والد نے تمام معاملہ پر غور کر کے ایک عمدہ شکل پیدا کی۔

قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنِكَحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَى أَنْ  
تَأْجُرَنِي ..... سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ (۲۸/۲۷)

اس نے (موسے سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تیرے  
ساتھ کروں اس شرط پر کہ تو آٹھ سال تک میری نوکری کرے۔ پھر اگر تو دس سال پورے کر دے  
تو یہ تیری طرف سے (حسن معاملہ) ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھ پر (ناجائز) بوجھ ڈالوں۔ اگر اللہ نے  
چاہا تو تو مجھے اپنے لوگوں میں پائے گا۔

حضرت موسے نے کہا بہت اچھا۔

قَالَ ذَلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَوْدَحَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ  
عَلَيْ ۖ وَ اللَّهُ عَلَى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ۝ (۲۸/۲۸)

(موسے نے کہا) کہ یہ تیرے اور میرے درمیان (عہد) ہوا۔ جو کسی مدت (آٹھ یا دس سال  
کی) میں پوری کر دوں مجھ کوئی پابندی (یا زیادتی) نہ ہوگی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر خدا  
کار ساز ہے۔

(”ہوئے نور“ میں) حضرت شعیبؑ کے قصہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قیاس یہ ہے کہ یہ صاحب بزرگوار  
جن کے ہاں حضرت موسےؑ قیام پذیر ہوئے حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے  
لئے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ وہ فرعون کے محلات میں پرورش پا کر سیاست کے رموز و اسرار سے واقف ہو  
جائیں۔ اب یہ سبیل پیدا کر دی کہ سیاست کو حکومت خداوندی میں بدلنے کے قریبے سیکھ جائیں حضرت شعیبؑ  
کے ہاں کی ملازمت محض گلہ بانی ہی نہ تھی بلکہ کلیم اللہی کی تمہید تھی ے

اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر

شہانی سے کلیسی دو قدم ہے (اقبال)

حضرت موسیٰؑ اپنی مدت معینہ تک مدین میں رہے (۲۰/۴۰)۔ جب یہ منزل  
بھی طے ہوئی تو اب سلسلہ آگے بڑھا۔ چرواہوں کی زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے

مدین کے بعد

کہ اپنے ریوڑ کو لئے لئے مختلف چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ آج اس جنگل میں، کل اس نخلستان میں ایک پھوٹا سا نیمہ چند ضروریات کی چیزیں، سہ پر اللہ کا آسمان، سامنے اس کی کھلی ہوئی زمین، صاف ہوا، مصفا پانی۔ اسی انداز میں، حضرت موسیٰ شہابی سے جہانباہی کے طریقے سیکھ رہے تھے کہ اب ایک اور منزل سامنے آئی۔ اندھیری رات، جاڑے کا موسم، جنگل کا سماں، اپنی بستی سے دُور کوہِ طور کے دامن میں، شاید راستہ بھولے ہوئے، دُور پہاڑ پر آگ دکھائی دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں سے آگ کا انگارہ بھی لاتا ہوں اور راستہ کا اتا پتا بھی۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ  
نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا تَعَلَّقَتْ أَتْيَكُمْ مِّنْهَا بَخْبَرٍ  
أَوْ جَذَ وَفٍّ مِّنَ النَّارِ تَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۸/۲۹)

سو جب موسیٰ نے (مدین میں) اپنی مدت معینہ پوری کر لی اور اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر چلا تو طور کی جانب آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تمہیں وہاں سے (راستے کی) کوئی خبر لا دوں یا آگ کا انگارہ تاکہ تم تاپ سکو۔

یہ سورہ قصص کی آیت ہے۔ لیکن سورہ ظہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اس لئے تجلی گاہِ طور پہلے اس سورت کی متعلقہ آیات دیکھئے۔ فرمایا۔

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۖ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ  
امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا تَعَلَّقَتْ أَتْيَكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجْدُ  
عَلَى النَّارِ هُنَّ ۝ (۲۰/۱۰-۹)

۱۰ (اے پیغمبر) موسیٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دُور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا ”ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ میں جاتا ہوں ممکن تمہارے لئے ایک انگارے آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے“

حضرت موسیٰ، آگ کے نشان پر نگاہ رکھے اپنے دھیان میں چلے جا رہے تھے کہ کسی پکارنے والے نے آپ کا نام لے کر پکارا۔ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يٰمُوسَىٰ ۝ (۲۰/۱۱)

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا۔ اے موسیٰ!



اس سنان جنگل میں، جہاں کوئی واقف معلوم نہیں ہوتا تھا اپنا نام سنکر ٹھٹک کر رہ گئے کہ اتنے میں پکارنے والے نے خود ہی اس استعجاب کو رفع کر دیا۔ آواز آئی۔

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ، فَاحْلُمْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (۲۰/۱۳)  
میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی ہوتی اتار دے۔ تو طوئی کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔

اس آیت سے عام طور پر وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو ترجمہ سے ظاہر ہے لیکن جب ہم وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ دنیا میں عام طور پر حقائق کائنات کے معلوم کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے، یعنی وہ کسی ایک معاملہ کو لیتی ہے، اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرتی ہے، اس فیصلہ پر عمل کرتی ہے اور پھر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ غلط ہونے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے اور پھر اس پر تجربہ کر کے دیکھتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بہت لمبا بھی ہوتا ہے اور گونا گوں مشکلات کا حامل بھی۔ اس کے برعکس، وحی، انسان کو پہلے ہی دن بتا دیتی ہے کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کونسا غلط۔ اس لئے وحی کی راہ نمائی سے سفر زندگی کی طول طویل راہیں سمٹ کر بہت مختصر ہو جاتی ہیں۔ طوئی کے یہی معنی ہیں، لپٹی ہوئی، سمٹائی ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ تو اب عقل کے تجرباتی طریقوں سے نکل کر وحی کی سمٹی ہوئی مقدس وادی میں پہنچ گیا ہے اس لئے اب تو اس لمبے سفر کے ساز و سامان (نَعْلَيْكَ) کو الگ کر کے اطمینان سے بیٹھ جا۔

وَ أَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝ (۲۰/۱۳)

اور دیکھ! میں نے تجھے (ایک عظیم مقصد کے لئے) چُن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن۔

وہ اولین وحی کیا تھی؟

إِسْمِي أَنَا اللَّهُ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي ۚ ذَرِكُمُ الصَّلَاةَ

لِذِكْرِ اسْمِي ۝ (۲۰/۱۴)

میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی حاکم اور معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت (محکومیت اطاعت) اختیار کر اور میرے قانون کو غالب کرنے کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔

**قیام حکومت خداوندی کی بنیاد** | یعنی قیام حکومت خداوندی کی وہی بنیادی تعلیم جو اس سے پیشتر تمام حضرات انبیائے کرامؑ کی زبانی ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے ٹھکانا جائز نہیں۔ عبودیت اسی کی اختیار کی جائے گی اور اس عبودیت (یعنی اللہ کی محکومیت) کا نظام، الصَّلَوة سے قائم ہوگا۔ اس انقلاب عظیم کی اولین منزل، سرکش قوتوں کا استہلاک ہوگا کہ جب تک لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (ہر طاغوتی قوت سے انکار) کی تکمیل نہ ہوگی إِلَّا اللَّهُ (اللہ کی محکومیت) کا ظہور نہیں ہوگا۔ اس لئے:-

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لَنَجْزِي كُلَّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ (۲/۱۵)

یاد رکھو! کہ تمہارے ہاتھوں سے ایک انقلاب عظیم رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب (جو اس وقت تک غیر مرئی طور پر منازل طے کرتا چلا آ رہا تھا) اب نکھر کر سامنے آجائے۔ اس انقلاب سے مقصود یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی محنتوں کا پورا پورا بدلہ مل جائے۔

وہ وقت اب قریب آنے والا ہے کہ سرکش قوتوں کے اعمال کے فطری نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں۔ مستبد قوتوں کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے جاتا ہے۔

دَانَهُ اِيْنِ مِىْ كَارِ دَاْلٍ حٰصِلٌ مُّبْرَدٌ

لیکن اس انقلاب کے بعد جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے ظہور میں آئے گا، ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں سلب و نہیب کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ کوئی مستبد قوت کسی سے کچھ چھین نہیں سکے گی۔ اس کے بعد ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جو آئے والے راستہ میں بڑی خطرناک گھائی تھی۔ ایک طرف بنی اسرائیل کے متعلق علم تھا کہ ان کی خوئے غلامی نے ان کے ایمان و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر رکھا ہے اس لئے وہ اس جانگسل کشاکشِ حق و باطل میں قدم قدم پر ہمت ہار بیٹھیں گے۔ اس لئے یہ واضح کر دیا کہ ان کی بزدلی اور دُور ہمتی، عدم استقلال و فقدانِ استقامت، ضعفِ ایمان اور کمزوریِ عمل، حضرت موسیٰؑ کے راستہ میں سنگِ گراں بن کر حائل نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف، قوم فرعون تھی جو اس انقلاب کی سب سے بڑی مزاحم بننے والی تھی۔ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں

لے یہ نظامِ صلوة کے ذریعے کس طرح قائم ہوگا اس کے لئے ”نظامِ بلوہیت“ دیکھئے۔

پر زور پڑتی تھی۔ ان کی طرف سے شدید ترین مخالفت کا یقین تھا۔ لہذا یہ بھی بتا دیا کہ ان کی اس مخالفت سے یہ خیال کبھی دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ چلے ان سے مفاہمت کر کے بین بین کا راستہ اختیار کر لیا جائے۔ حق اور باطل میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں حقیقتیں ہیں جن کی طرف اس ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَذَارَىٰ ۚ (۲۰/۱۴)  
پس دیکھ! ایسا نہ ہو کہ جو شخص ہمارے قوانین پر یقین نہیں رکھتا اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے چلتا ہے وہ اس نظام کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ اس سے بر ملا کہہ دو کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

غور کیجئے۔ کتنی اہم حقیقت ہے جسے اشاروں ہی اشاروں میں یوں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں وہی قوم کامیاب و کامران ہوگی جو اپنی خواہشات و مقتضیات نفس اور امیال و عواطفِ قلب کو جذبہ حصول مقصد کے تابع رکھے، خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو اس انقلاب کے راستہ میں سب گراں بن کر حائل ہو گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اس واقعہ کے عمومی مفہوم کو سامنے لے آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے کون سی حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی مفہوم کو لیجئے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَمَا رَتَّلَكَ بِمِيزَانٍ ۚ (۲۰/۱۷)

اور "اے موسیٰ! تیرے دہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۖ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ أَهْشُرُ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي ۚ وَ لِي فِيهَا مَلَابِطٌ أُخْرَىٰ ۚ (۲۰/۱۸)

عرض کیا، میری لٹھی ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے (میری بکریوں کے لئے

پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔  
آواز آئی۔

قَالَ اَلْقَهَا يَمُوسٰى ۝ (۲۰/۱۹)  
حکم ہوا ”اے موسیٰ اسے ڈال دے۔“

انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

قَالَقَهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ (۲۰/۲۰)  
چنانچہ موسیٰ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک  
سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۚ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْاُولٰٓئِ ۝ (۲۰/۲۱)  
حکم ہوا ”اب اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔ ہم اُسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔“

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ ۖ تَخْرُجُ بَيْضًا ۚ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ  
اٰيَةً اٰخَرٰى ۝ (۲۰/۲۲)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو  
چمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطورِ اعجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی  
نشانوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِيكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝ (۲۰/۲۳)

”یہ نشانیاں اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت  
کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔“

دوسرا مفہوم | یہ تو ہے ان آیات کا عمومی مفہوم۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو  
بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کا یہ انداز ہے کہ وہ غیر محسوس

حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مقامات میں، الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں پر محمول نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ جس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اسے سامنے رکھ کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام دے دیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ ذَا مَا قُلْتُكَ بِمِثْلِكَ يَمْوَسَّى (۲۰/۱۷) اے موسیٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاطِ نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے جواب میں کہا کہ بارِ الہا! یہ احکام کیا ہیں؟ (۲۰/۱۸) یہ تو میرے لئے سفرِ زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ اَتَوَكَّؤُا عَلَیْهَا میں اب انہی کے آسے سے چلوں گا۔ وَ اَهْتَشُّ بِهَا عَلٰی غَیْبِیْ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل کو) بھنجوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَ لَیْ فِیْہَا مَآرِبٌ اُخْرٰی (۲۰/۱۸)۔ ان کے علاوہ معاملاتِ زندگی بھی جو میرے سامنے آئیں ان میں ان سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلْقِہَا یَمْوَسَّى (۲۰/۱۹)

اس وافر شوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں، ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے (اَلْقِہَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی) (۲۰/۲۰)۔ خدا نے کہا کہ موسیٰ اس خیال سے مت گھبراؤ، انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْہَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سنگلاہ فلاں کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنادیں گے۔ سَنُعِیْدُہَا سِیْرَتَہَا اَزْدٰی (۲۰/۲۱) اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ تو نہایت سکون و سکوت اور دل جمعی سے اپنی دعوت کو نہایت روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان تمام مشکلات سے محفوظ و مصون باہر نکل آئے گا۔ وَ اضْمُرْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضًا مِنْ غَیْرِ سُوْرٍ (۲۰/۲۲) تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہے، یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیاً نہ حیثیت سے نشان اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے نشان۔ لِیُزِیْکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۲) یہ احکام ہم تجھے اس لئے دیتے ہیں کہ تجھے دکھادیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہوگا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں۔ ان احکام و ضوابط اور ان کی

اس طرح تبیین و تشریح کے بعد حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ

إِذْ هَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (۲۰/۲۳)

اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی پادشاہ مصر) کی طرف جا۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔

طغی کے لفظ پر غور فرمائیے اور قرآنی بلاغت کے اعجاز پر وجد کیجئے۔ سرکشی و معصیت کوشی کی تمام کف بردہاں طغیانوں کو کس طرح ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جب حضرت موسیٰ نے سنا کہ وہ ہم جس کے سر کرنے کے لئے انہیں مامور کیا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہے تو اس کی توفیق کے لئے بھی اسی باب عالی کے سامنے جھولی پھیلا دی عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي..... إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا (۲۰/۳۵-۳۵)

موسیٰ نے عرض کیا ”اے پروردگار! میرے سینے میں ایسی وسعت اور کشاد عطا فرمادے کہ (بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کے لئے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آ سکے)۔ میری زبان کی گہر بھی کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ نیز میرے گھروالوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا بوجھ بٹانے والا بنادے کہ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے۔ وہ میرے کلام میں میرا شریک ہو۔ ہم دونوں مل کر تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرم عمل رہیں اور تیرے قانون کو غالب کرنے میں بیش از بیش قدم اٹھا سکیں اور تو ہم دونوں کی حالت سے اچھی طرح باخبر رہے۔

**زبان کی گہر کشائی** | سینہ کی فراخی (شرح صدر) وسعت ظرف اور دشواری منزل کی آسانی کے ساتھ، زبان کی گہر کشائی کی بھی دعا مانگی گئی۔ اس لئے کہ

ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں وہ طاقت نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر سخن خطابت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کی تائید سورہ قصص کی چونتیسویں آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا (۲۸/۳۴)

”میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیج دے کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے۔“

پھر ان آیات میں نُسَبِحْكَ (تاکہ ہم تیری تسبیح کریں) اور ذَنْ کُرْ لَکَ (ہم تیرا ذکر کریں) کے نچروں پر بھی غور کیجئے۔  
**تسبیح و ذکر کا مفہوم** | حضرت موسیٰؑ کے ذمہ فریضہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں فرعون اور اس کے  
 طاغوتی لشکر کو شکست دیں اور بنی اسرائیل کو غلامی و محکومی کی پستیوں  
 سے نکال کر، حکومت و سطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانین خداوندی پر رکھیں۔  
 اس عظیم الشان ہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کی التجا کی اور اپنے قوت بازو یعنی حضرت ہارون  
 کو بھی ساتھ مانگا۔ اور یہ اس لئے تاکہ وہ عظیم الشان ہم سر ہو سکے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ  
 الفاظ آئے ہیں کہ ”تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں۔“ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی تسبیح اور  
 ذکر سے صحیح مفہوم کیا ہے؟ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ و استیلا (یعنی فساد) کو مٹا کر اس کی جگہ حکومت خداوندی  
 کا قیام و بقار، یہ ہے تسبیح اور یہ ہے ذکر۔ نہ کہ زاویوں اور خانقاہوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، سر ہزاروں  
 ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہرتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر  
 کرنے پر قانع رہنا۔ وہ تسبیح و ذکر تھا مردانِ خود آگاہ و خدا مست کا اور یہ تسبیح و ذکر ہے ان کا جو کشمکش زندگی سے  
 مٹنے موڑنے کا نام ”معرفت“ و ”حقیقت“ رکھ لیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

اندازیہاں گر چہ بہت شوخ نہیں ہے      شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات  
 یاد سب افلاک میں تجمیرِ مصل      یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات  
 وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست  
 یہ مذہب ملاً و جمادات و نباتات

حضرت موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں اس درگاہ عاجز نواز سے ارشاد ہوا کہ  
 قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُوءَ كَلَمٍ يٰمُوسٰی (۲/۳۶)  
 ارشاد ہوا، اے موسیٰؑ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اس لئے کہ جو کچھ مانگا گیا ہے وہ تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہے جس کے لئے تدبیر الہی کی مختلف کڑیاں

لے تسبیح و ذکر کے معانی اور مفہوم کے لئے لغات القرآن دیکھئے۔

اس سے پیشتر سامنے آچکی ہیں۔

وَلَقَدْ مَدَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۖ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ  
يُؤْمِسِي ۝ (۳۷-۲۰/۳۰)

اور (مجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیسا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اس وقت کیا ہوا تھا، جب ہم نے تیری ماں کی طرف یہ حکم بھیجا تھا کہ بچے کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے، دریا اسے کنارہ پر دھکیل دے گا۔ پھر اسے وہ اٹھالیکا جو میرا دشمن ہے۔ نیز اس بچہ کا بھی دشمن۔ اور (اے موسیٰ!) ہم نے اپنے فضلِ خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لئے تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے۔ تیری بہن جب وہاں سے گزری تو (یہ ہماری ہی کار فرمائی تھی کہ) اس نے (فرعون کی بیوی سے) کہا، میں تمہیں ایسی عورت بتا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچے کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔ پھر دیکھ ایسا ہوا کہ تُو نے (مصر میں) ایک آدمی مار ڈالا۔ ہم نے تجھے اس معاملہ کے غم سے نجات دی اور تجھے مختلف کٹھالیوں میں تپایا (تاکہ تو کندن بن جائے) پھر تو کئی برس تک مدین کے لوگوں میں رہا۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد، موسیٰ ایسا ہوا کہ تو ہمارے پیمانے پر پورا اُترا (اور ہم نے تجھے نبوت سے سرفراز کیا)۔

سب کچھ اندازے کے مطابق | اتنی مختلف منازل سے گزر کر اے موسیٰ! اب تو ہمارے متعین کردہ اندازے کے مطابق اس مقام پر آ پہنچا ہے۔ ”علیٰ قدس“

کے الفاظ پر غور فرمائیے، یعنی جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ محض اتفاقیہ امور نہیں، بلکہ اللہ کے متعین فرمودہ پیمانوں اور اندازوں کے بالکل مطابق ہو رہا ہے۔ اب اتنی آزمائشوں کے بعد

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۚ (۲۱/۲۰)

اور (دیکھ اس طرح) میں نے تجھے اپنے لئے (یعنی اپنے خاص کام کے لئے) بنایا اور تیار کیا ہے۔

یعنی ”تجھے اپنے لئے تیار کیا ہے۔“ دیکھئے! کتنے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کو مقامِ نبوت کے لئے وہی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ جو ہر عظمیٰ کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی کہ نبوت ہر کس و ناکس کو یونہی



نہیں مل جاتی، بلکہ اس کے لئے پیچیدہ نبوت کو مختلف منازل سے گزار کر اس کی خودی کی تکمیل کی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے منصبِ جلیلہ پر سرفراز کیا جاتا ہے۔ یہ قول بے خبراں ہے۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔ پیغمبری ہر ایک کو یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ قدرت اسے پہلے دن سے پیغمبری کے لئے تیار کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ اس کے مقرر کردہ اندازے کے مطابق، اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ (تَحَرُّجُ نَبِيِّكَ عَلَى قَدَرِ تَحْوِيلِ)

**عبادت کا مفہوم** | پھر لِنَفْسِي پر بھی غور کیجئے (یعنی تمہیں اپنے لئے تیار کیا ہے)۔ حضرت موسیٰ جس مقصدِ جلیلہ کے لئے تیار کئے گئے تھے وہ سرکش قوتوں کا استہلاک اور کمزور قوم کو ابھار کر قوانینِ خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے مقامِ حکومت و سطوت تک پہنچانا تھا۔ بالفاظِ دیگر، یہ مقصد، قیامِ حکومتِ الہیہ تھا۔ اس مقصد کو اللہ تعالیٰ نے ”اپنا مقصد“ قرار دیا ہے۔ اب اسے اس ٹکڑے سے ملائیے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (۵۱/۵۲) یعنی جن و انس کی پیدائش کی غرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبودیت (محکومیت) اختیار کریں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”عبادت“ سے مفہوم کیا ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے لئے وقف ہو جائے اور اللہ کے لئے وقف ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی کا ہر سانس قیام و بقائے حکومتِ خداوندی میں صرف ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اپنے لئے وقف کر لیا ہے، یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کے لئے جس کا تفصیلی پروگرام یہ ہے کہ

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذٰلِكَ ۝ (۲۰/۲۲)

اب تو اور تیرا بھائی دونوں میرے احکام کو لے کر جاؤ اور دو دیکھنا! ان کی تعمیل میں ذرا سستی نہ کرنا۔

یعنی اس مقصد کی تکمیل یوں ہوگی۔ یہاں پھر ذکرِ کالفظ قابلِ غور ہے اور اس تشریح کی تائید کر رہا ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

اِذْهَبَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰ ۝ فَقُوْلَا لَهُ قُوْلًا لَّيْنًا لَّعَلَّهٗ

يَتَذَكَّرُ ۝ اَوْ يَخْشٰى ۝ (۲۰/۲۳ - ۲۴)

ہاں، تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون) فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ کرشی میں بہت بڑھ چلا ہے۔

پھر جب اس کے پاس پہنچو تو (سخنی سے پیش نہ آنا) نرمی سے بات کرنا۔ (تمہیں کیا معلوم؟) ہو سکتا ہے وہ اس طرح بات کو سمجھ لے یا اپنی غلط روش کے عواقب سے ڈر جائے۔

**دعوت انقلاب کے دو مقام** | دعوت حق و صداقت کے سلسلہ کی پہلی کڑی پر غور فرمائیے۔  
یعنی فرعون کے پاس پہنچو تو پہلے نرمی سے سمجھانا۔ شاید اس کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ صحیح بات کو سمجھ لے اور اپنے انجام و عواقب سے ڈر جائے۔ ایک داعی حق و صداقت کی پہلی آواز، نرمی اور نصیحت کی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے سرکش قوتوں پر کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ وہ اپنی معصیت کوشی میں اور زیادہ دلیر ہو گئی ہیں تو پھر ضرب کلہی کی باری آتی ہے جس کے لئے عصا کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ

عصا نہ ہو تو کلہی ہے کارِ بے بنیاد  
جو زخمِ مرہم سے مندمل نہ ہو اس کا علاج، نوکِ نشتر کے سوا اور کچھ نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے، شکنجوں میں کنا ہی پڑتا ہے۔

**مزید ہدایات** | ادھر حضرت موسیٰ کو یہ حکم ملا اور حضرت ہارون کو مصر میں اشارہ مل گیا کہ وہ جا کر اپنے بھائی سے ملیں۔ چنانچہ وہ ان سے راہ میں آکر مل گئے۔ اب واقعہ کی مزید کڑیاں اس زمانہ سے متعلق ہیں جب دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے تھے۔

قَالُوا رَبَّنَا إِنَّا لَخَافُ أَنْ يَفْزُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ (۲۰/۴۵)

دونوں نے عرض کیا: ”پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں عجلت نہ کرے۔  
یہ خوف کچھ بیجا نہ تھا۔ ادھر قبرمانی قوتوں کا ایک بھرتا ہوا سیلاب، جیوش و عساکر، تلوار و سنان، ترمود و فرعونیت کے ساز و سامان کی شکل میں موجزن اور ادھر (یوں سمجھئے کہ) دو گڈریئے، لیکن جو قوت ان کے ساتھ تھی وہ فرعون اور اس کے جنود و عساکر کو کہاں میسر تھی۔ فرمایا۔

قَالَ لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمَا أَسْمَعُ دَآرِیَہ (۲۱/۱)

ارشاد ہوا، کچھ اندیشہ نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں سب کچھ سنا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں۔

فرعون کے پاس بے دھڑک جاؤ۔

فَاتَيْلُهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ  
دَلَّا تَعَذِّبُهُمْ ۚ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلٰی  
مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ۝ (۲۰/۴۷)

تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس  
بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر دے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کے احکام لے کر  
تیرے پاس آگئے ہیں۔ اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر امن و سلامتی کی بشارت ہے لیکن جو اپنی ضد پر اڑ جائے تو  
إِنَّا قَدْ أُوحِیَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ ۖ وَتُؤْتٰی ۝ (۲۰/۴۸)  
جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے، تو ہم پر وحی اُتر چکی ہے کہ اس کے لئے تباہی کا پیام ہے۔

ان دونوں ٹکڑوں میں اسلام کی پوری خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں۔ جو سیدھی راہ اختیار کرے، وہ امن و سلامتی  
میں ہے اور یہی وہ جنتِ ارضی ہے جس کے لئے ابنِ آدم مارا مارا پھر رہا ہے اور اپنی ہر ناکام جستجو کے بعد  
تھک کر پکار اٹھتا ہے کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اسلام قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کو امن و سلامتی کی جنت عطا کرتا ہے جو سرکشی اختیار  
کرے اور دوسرے انسانوں کو اپنے پنجنے استبداد میں جکڑے رکھنا چاہے، تو اس کے لئے ہلاکت و بربادی  
کا رسوا گن عذاب ہے۔

اس کے بعد اس داستانِ انقلاب کی اگلی کڑی آتی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے

کہ قرآنِ کریم کے جن دیگر مقامات میں اتنا حقیقہ بیان ہوا ہے انہیں بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ مفہوم بالکل

واضح ہو جائے اور تمام جزئیات سامنے آجائیں۔ سورہ قصص کی آیت  
مزید بکھر ہوئے موتی

۲۹ پہلے لکھی جا چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کس طرح

اُگ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف بڑھے۔ اس سے آگے ہے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَتُوسِّلَ إِلَيْهِ أَنَا اللَّهُ ذُبُّ الْغَالِبِينَ ۝ (۲۸/۲۰)  
 سوجب (موسیٰ) اس آگ کے شعلہ کے قریب آیا تو وادی کے دائیں جانب سے درخت کے بابر  
 مقام سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، رب العالمین۔

سورہ طہ میں اسے ”وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى“ (۲۰/۲۸) کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرمادی کہ ندائے  
 جمال وادی کے دائیں جانب، جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَلَمَّا رَاَهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَ  
 لَمَّ يُعَقِّبْ ۖ يَمُوسَىٰ أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ۝ (۲۸/۲۱)  
 (آواز نے کہا کہ اے موسیٰ!) اپنا عصا پھینک دے (موسیٰ نے عصا پھینک دیا اور) جب اسے ملتا ہوا  
 دیکھا، گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ موڑ کر اس طرح لوٹا کہ پھر پیچھے مڑ کر (نہ دیکھا)۔ (آواز آئی) اے موسیٰ!  
 آگے بڑھو، مت ڈرو۔ تم امن پانے والوں میں سے ہو۔

سورہ طہ میں اسے حیتہ (سانپ) کہا گیا ہے۔ یہاں ”كَأَنَّهَا جَانٌّ“ کہہ کر وضاحت فرمادی کہ وہ ”گویا سانپ“  
 تھا۔ مندرجہ بالا ترجمہ، آیت کے الفاظ کے ظاہر مفہوم کی رو سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر  
 ان الفاظ کو بطور استعارات لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ کو مختلف احکام دے کر کہا کہ ان احکام کو جو  
 تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں جا کر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰ نے جب اس ہم اور اس  
 سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ ہم نہیں، ایک اژدہا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔  
 اس خیال سے، حضرت موسیٰ نے اس ہم سے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوئے، یعنی اس  
 خوف کی بنا پر اپنے دل میں اس ہم کے لئے آمادگی نہ پائی۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰ! ڈرو نہیں، تمہیں کوئی گزند  
 نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔

أَسْأَلُكَ بِذَلِكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۚ وَاضْمُمْ  
 إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ۖ فَذَرْكَ بُرْهَانٍ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ  
 وَمَلَأَتْهُ مِنْهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ۝ (۲۸/۲۲)

اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال، وہ بغیر کسی غیب کے سفید ہو کر نکلے گا اور خوف میں اپنا بازو اپنے

(پہلو) سے چٹالو۔ یہ دوروشن دیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے اراکین سلطنت کی طرف ہیں۔ وہ نافرمان لوگ ہیں۔

سورہ طہ میں آیات کہا گیا تھا، یہاں برہان فرمایا۔ سابقہ انداز کے مطابق ۱۰ اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ کو بشارات کے احکام دے کر کہا گیا کہ انہیں لوگوں کے سامنے ہدایت دل جمعی سے پیش کرنا۔ انہیں یہ احکام بڑے خوش آئند دکھائی دیں گے اور اگر کہیں خوف کا مقام آئے تو پھٹ پھٹانا نہیں بلکہ اپنے بال دپر سمیٹ کر مقابلہ کے لئے تیار ہو جانا اور اپنی جماعت کی تنظیم اچھی طرح سے کرنا (۲۸/۳۲)۔ یہ دونوں قسم کے احکام (تذیرات و تبشیرات) تیرے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے اہل دربار کے لئے دلائل ہیں۔ وہ لوگ سخت غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

اس پر حضرت موسیٰ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝ وَ آخِي هَارُونُ هُوَ أَفْضَمُ مِنِّي لِلسَّانَاءِ فَأَدُسُّهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّرْبُونِ ۝ (۲۸/۳۲-۳۳)

عرض کیا اے میرے رب! میں نے ان میں سے ایک شخص کو مار دیا تھا۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے اور میرا بھائی ہارون جو مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ ۝ (۲۸/۳۵)

(اللہ نے کہا) ہم تیری قوت بازو تیرے بھائی کے ساتھ مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کے لئے ایسی قوت فراہم کر دیں گے کہ وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ سو تم ان احکامات کو لے کر جاؤ۔ تم اور جو تمہاری پیروی کریں گے غالب آئیں گے۔

دیکھئے! کس وضاحت اور یقین سے کہا گیا کہ جاؤ! ہماری طرف سے قوت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی اور تم

اور تمہارے متبعین، اس سرکش و جابر قوم پر غالب آجاؤ گے۔

سورۃ نمل میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا ۖ سَأَتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ

أَتِيكُمْ بِشَهَابٍ مِّنْ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۴/۷)

جب موسیٰ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ میں وہاں سے تمہارے لئے کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی جلتا ہوا شعلہ تاکہ تم تپ سکو۔

جب حضرت موسیٰ آگ کے نشان کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۖ وَ

سُبْحَنَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۴/۸)

سو جب (موسیٰ) آگ کے قریب آیا تو آواز آئی کہ بابرکت ہے وہ (مقام) جس میں آگ ہے اور اس کا ارد گرد بھی اور اللہ رب العالمین اس تصور سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی خاص مقام میں گھرا ہوا ہے۔

مقصود یہ بتانا تھا کہ یہ مقام (طور) اور اس کے ارد گرد کا علاقہ (ارض فلسطین) بڑی بابرکت زمین ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف انبیاء کرام کی وساطت سے پیغامات خداوندی کا عام چرچا ہوا تھا اور اب بھی یہ علاقہ (کچھ عرصہ بعد) نظام خداوندی کی آماجگاہ بننے والا ہے، جب بنی اسرائیل، فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر کے یہاں آباد ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ برکات و سعادت ان خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں، خدا تبارک العالمین ہے، اس لئے اس کی رحمتیں تمام خطہ ارض پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصور سے بہت بلند ہے کہ اس کی ربوبیت کو کسی خاص علاقہ یا خاص نسل میں محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا:-

يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۲۴/۹)

اے موسیٰ! میں اللہ غالب، حکمت والا ہوں!

”عَزِيزُ الْحَكِيمُ“ کی صفت خداوندی پر غور فرمائیے۔ غالب اور حکمت والا۔ جس عظیم الشان ہم کو سر کرنے کے

لئے حضرت موسیٰ کو مامور کیا جا رہا تھا اس کے لئے ایسے غالب و حکیم خدا کی تائید و نصرت کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَأَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَلَمَّا رَاَهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا ۚ وَكَانَ يُعَقِّبُ ۖ يَمُوسَىٰ لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخِيفُ لَدُنِّي الْمُرْسَلُونَ ق ۝ (۲۴/۱۰)  
اور (اے موسیٰ!) اپنا عصا ڈال دے (اس نے ایسا ہی کیا)۔ سو جب اسے ملتا ہوا دیکھا گویا وہ سانپ ہے، تو (موسیٰ) پیٹھ موڑ کر اٹھا پھر گیا (اس طرح) کہ پیچھے (مڑ کر بھی نہ دیکھا)۔ (اللہ نے کہا) اے موسیٰ! ڈرو نہیں۔ ہمارے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔

یہاں بھی کَانَهَا جَانٌّ (گویا کہ وہ سانپ تھا) فرمایا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ "ہمارے حضور ہمارے رسول ڈرا نہیں کرتے" رسول تو ایک طرف عام لوگوں سے بھی اگر کوئی لغزش ہو جائے اور اس کے بعد وہ ندامت سے جھک جائیں اور اپنی برائی کو بھلائی سے بدل دیں تو ہم ان کے لئے سامان حفاظت مہیا کر دیا کرتے ہیں۔  
إِنَّ مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۴/۱۱)  
لیکن جو زیادتی کرتا ہے (پھر برائی کے بعد) اسے (اسے) نیکی سے بدل دیتا ہے، تو میں بخشنے والا، رحمت کرنے والا ہوں۔

پھر فرمایا۔

وَأَدْخُلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضًا مِّنْ غَيْرِ سُوءٍ قَفِ فِي تَسْمِعِ  
أَيْتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِينَ ۝ (۲۴/۱۲)  
اور (اے موسیٰ) اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال (دیکھو گے کہ وہ) بغیر کسی نقص کے سفید ہو کر نکلے گا۔ یہ فرعون اور اس کی قوم کی طرف (ہماری) نو نشانیوں میں سے ہے (اس لئے کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔ ان تسع آیات (نو نشانیوں یا احکام) کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ (آیات زیادہ ۱۲ کو اگر استعارہ کے انداز میں لیا جائے تو ان کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے)۔

لے ہو سکتا ہے کہ یہاں قطعی کے قتل کے واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اگرچہ حضرت موسیٰ نے اسے قتل نہیں کیا تھا لیکن نادانستہ ایک مجرم کی حمایت ہو گئی تھی۔ اس زیادتی کو بعد میں حضرت موسیٰ کی پیشانی کے عرق انفعال نے تبدیل بہ حسنات کر دیا تھا۔

متذکرہ صدر مقامات میں تفصیل سے ذکر ہے۔ لیکن سورۃ نازعات میں ان تفصیل کو اجمال میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ فرمایا۔

هَلْ أَشْتَكُ حَدِيثُ مُوسَى ۝ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ إِذْ هَبَّ رِيحٌ فَغَمَمَتْ إِشْتَهَ طَغَى ۝ (۱۵-۱۴/۴۹)

(اے مخاطب!) کیا تجھے موسیٰ (کے واقعہ) کی خبر پہنچ چکی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے وادی مقدس طوی میں پکارا (اور کہا کہ) فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ مد سے نکل گیا ہے۔

سورۃ شعراء میں ہے۔

وَ إِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ اِنِ اثْنِ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَوْ يَسْتَفْقُونَ ۝ (۱۰-۱۱/۲۶)

اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ ظالم قوم کی طرف جاؤ یعنی قوم فرعون کی طرف (اور ان سے پوچھو کہ) کیا وہ قوانین خداوندی کی نگہداشت نہیں کریں گے؟

حضرت موسیٰ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُكَلِّمُنِىْ ۝ وَ يَضِيقُ صَدْرِىْ ۝ وَ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلَىْ هٰرُونَ ۝ (۱۲-۱۳/۲۶)

عرض کیا، اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں (اور اس سے) میرا سینہ تنگ ہو جائے اور میری زبان نہ چلے (تو اس کے لئے) تو ہارون کی طرف (میری مدد کے لئے) پیغام (وحی) بھیج۔

سورۃ ظہ کے الفاظ میں، حضرت موسیٰ نے دُعا مانگی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ (۲۵/۲۰) ”اے اللہ! میرا سینہ کھول دے“ یہاں اس اہم ذمہ داری کے بوجھ کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے شرح صدر کی آرزو، دعا رب کر لب پر آگئی۔ پھر حضرت موسیٰ نے سورۃ ظہ میں عرض کیا تھا کہ ”میری زبان کی گرہ کشائی فرما دیجئے تاکہ وہ میری بات سمجھ لیں“ (۲۶-۲۸/۲۰)۔ یہاں اپنے عجز بیان کے متعلق کہا کہ لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ اس لئے حضرت ہارون کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا (۳۳/۲۸)۔ (وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے)۔

اس کے بعد عرض کیا کہ ایک بات اور بھی ہے۔



وَلَهُمْ عَلَىٰ ذَنْبٍ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونَهُ (۲۶/۱۵)

وہ میرے ذمہ ایک قصور دھرتے ہیں۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

دیکھئے! حضرت موسیٰ نے یہ نہیں کہا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ قتل عمد کے مرتکب نہیں تھے بلکہ وہ حادثہ محض اتفاقی تھا۔ لیکن ایسا کہ پہلے آچکا ہے (حکومت فرعون کی ارباب بست و کشاد آپ پر قتل عمد کا الزام دھر کر آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے)۔ (ملاحظہ ہو آیت (۱۵-۲۱/۲۸) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دونوں بھائی جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

قَالَ كَلَّا ۖ فَاذْهَبَا بِأَيْتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ (۲۶/۱۵)

(ارشاد ہوا کہ) ہرگز (خطرہ کی کوئی بات) نہیں۔ تم دونوں ہمارے احکام کے ساتھ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ (سب کچھ) سننے (دیکھنے) والے ہیں۔

یہ تھے وہ واقعات جو سہ طور لہرانے والی برقی تجلی کے دامن میں آگ کی تلاش میں نکلے ہوئے (حضرت) موسیٰ کو پیش آئے۔

**طور سے واپسی** اہل خانہ انتظار میں ہوں گے کہ آپ آگ لے کر آئیں! انہیں کیا معلوم کہ وہاں سے کونسی زندہ حرارت مل گئی ہے جو افسردہ کے خون میں ہی نہیں بلکہ پوری قوم

کی رگ جلاں میں برقی تپاں بن کر دوڑ جائے گی۔ حضرت موسیٰ اس مقصد عظیم کو دل میں لئے جس کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا، مصر کی جانب تشریف لے چلے۔ غور کیجئے! یہاں سے بھاگے تھے تو کس حالت میں اور اب لوٹے ہیں تو کس انداز سے! اس وقت فرعون اور اس کے ارباب حکومت کی سازش سے بچ کر نکلے تھے اور اب مراجعت ہوئی ہے تو بایں منطکہ انقلابات کی ایک دنیا جلو میں ہے اور سینے میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمحل نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کی آمد اور ان کے ارادوں کی اطلاع **دربار فرعون میں** بنی اسرائیل اور فرعون کی حکومت کو مل چکی ہوگی۔ بہر حال آپ فرعون کے پاس

پہنچے اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرِعُونَ رَأْيِي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۲۷/۱۰)

موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں

جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

”میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ اور نہ کہوں گا۔ مطالبہ میرا فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر، خدا کے فرستادہ کے حوالہ کر دے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر، خدا کی محکومیت میں لائے اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے۔“

حَقِيقٌ عَلٰی اَنْ لَّا اَقُوْلَ عَلٰی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقُّ ط قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ فَارْسِلْ مَعِيَ بَنِيْ اِسْرٰٓئِيْلَ ۝ (۱۰۵/۴)

مجھ پر لازم ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہوں، مگر یہ کہ سچ ہو۔ میں تیرے پروردگار کی طرف سے (سچائی کی) روشنی دلیلیں لایا ہوں۔ سو بنی اسرائیل کو (آئندہ اپنی غلامی پر مجبور نہ کر، اور) میرے ساتھ رخصت کر دے۔

اس مقام کے علاوہ حسب ذیل آیات میں اس بات کو دہرایا گیا ہے۔

(۱۰/۴۵ : ۹۴ - ۱۱/۹۴ : ۲۵ - ۲۳/۲۶ : ۲۵ - ۲۵/۳۶ : ۱۶ - ۲۶/۱۴)

(۲۳ - ۲۴/۲۴ : ۱۴ - ۲۴/۲۲ : ۵۱/۳۸)

حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے ہی کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مصری بُت پرست تھے اور ان کے بادشاہ شان الوہیت کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ بُت پرستی کا مسلک یہ ہے کہ مختلف صفات باری تعالیٰ کے لئے مختلف دیوتا تصور کر لئے جاتے ہیں اور پھر ہر دیوتا کا مجسمہ تراش کر ان سے وہی کچھ مانگا جاتا ہے جس کا اسے دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔ بارش برسانے والا دیوتا، ہوائیں چلانے والا دیوتا، اولاد دینے والا دیوتا، دُقس علیٰ ہذا۔ پھر ہر قبیلہ اور ہر قریہ کا جدا جدا دیوتا اور الگ الگ ”خدا“ ہوتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے کہا کہ میں اپنے (یا تمہارے) رب کی طرف سے پیغامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے ہی سوال کیا کہ

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يٰمُوسٰی ۝ (۲۰/۴۹)

”اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟“

کون سے رب کی طرف سے؟ کون سے خدا کی جانب سے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے چار لفظ کہے ہیں۔

اور غور کیجئے تو کس طرح بساط کائنات کے چاروں گوشے ان کے اندر سمٹ کر آگئے ہیں، فرمایا:-  
 قَالَ رَبَّنَا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ۝ (۲۰/۵۰)  
 موسیٰ نے کہا، ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی، پھر اس کی  
 راہ نمائی کی۔

**حضرت موسیٰ کا جواب** | وہ رب جس نے ہر شے کو خلقت عطا فرمائی، غور کیجئے، ہر شے کا پیدا  
 کرنے والا۔ یہ نہیں کہ صرف بارش برسائے والا، اولاد عطا فرمانے والا، بلکہ  
 اس وسیع و عریض کائنات میں جس شے کا بھی تصور کر سکو اس کا خالق اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ پیدا کرنے کے  
 بعد ہر ایک شے کو جس منہا تک پہنچنا ہے وہاں تک کی راہ نمائی کرنے والا۔ سلسلہ ارتقاء کی اولین اور آخری کڑیوں  
 کا مالک کہیے! ایسے خدا کی موجودگی میں کسی شے کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی اور "خدا" کی ضرورت لاحق ہو  
 سکتی ہے؟

حضرت موسیٰ نے جو کہا تھا کہ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۱/۴) اور اس کے جواب میں فرعون  
 نے پوچھا تھا کہ وہ "رب" کونسا ہے تو اس میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ فرعون کا دعویٰ  
 تھا (اور دنیا کے ہر "فرعون" کا یہی دعویٰ ہوتا ہے) کہ اَنَا رَبُّكُمْ اَوْ عَلٰی بَعْضِ ۹/۳۹، لوگوں کو میں سامانِ زندگی عطا  
 کرتا ہوں اس لئے میں ہی ان کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ نے جو کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں  
 تو اس سے فرعون کے اس دعوئے ربوبیت کی بھی تردید کر دی۔ اس لئے فرعون نے دُہرا کر پوچھا کہ وہ کونسا رب  
 ہے جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ اس سرزمین میں "رب" تو میں ہی ہوں۔

بہر حال فرعون نے سوچا تھا کہ حضرت موسیٰ کو اس اُلجھاؤ میں اُلجھالے گا۔ لیکن جواب ایسا مسکت اور جامع  
 ملا کہ سستی بھول گیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ سے کترا کر دوسری طرف نکل جائے۔ کہنے لگا اُچھا!  
 یہ بتاؤ کہ جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان میں سے کون راہِ راست پر تھا اور کون گمراہ۔ خدا کے  
 ہاں اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ کس کی نجات ہوئی اور کون عذاب میں مبتلا ہے۔ فلاں فلاں بزدلوں میں  
 سے کون چھوٹا ہے اور کون بڑا؟

یہ تخلیق و ہدایت کے متعلق (ابلیس و آدم میں) وحی کے تابع بھی لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْفُرُودِ الْوَلِيِّ ه (۲۰/۵۱)

فرعون نے کہا، ”پھر ان کا کیا حال ہے جو پچھلے زمانوں میں گزر چکے ہیں؟“

یہ سوال ایسا تھا کہ اس کے جواب سے فرقہ واری اور گروہ سازی کی ہزارا فراق انگیز راہیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے فرعونی سیاست کی وسیع کاری کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب حضرت مولیٰ اس قوم کے اسلاف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ وہ گمراہ تھے تو فرعون اپنے اہل دربار اور عوام سے کہے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح ان کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں حضرت مولیٰ کا مخالف بنا دیا جائے گا اور یوں وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے وہ آئے ہیں، نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے مخالف بادشاہ کے مکالمہ میں ”جوئے نور“ میں دیکھ چکے ہیں، حضرات انبیائے کرامؑ کا مسلک، مجادلانہ نہیں ہوتا داعیانہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ بحث و مناظرہ کے لفظی گورکھ دھندے سے بچ کر اہل انداز سے حقیقت کشائی کر دیتے ہیں جس سے پوچھنے والا ساکت بھی ہو جائے اور مطمئن بھی۔ حضرت مولیٰ نے جواب میں فرمایا:

قَالَ عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ه (۲۰/۵۲)

مولیٰ نے کہا، ”اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کہ کھویا جائے یا بھول میں پڑھ جائے۔“

جواب کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے اور حقائق و معارف کی اس بصیرت افروز دنیا میں جذب ہو جائیے فرمایا کہ اسلاف کا علم، نوشتہ الہی میں ہے اور وہ نوشتہ ایسا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور سہو کا امکان نہیں۔ اس لئے مجھے (یا تمہیں) اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا حال (اُن کے ساتھ) اُن کے رب کے علم میں ہے۔ لیکن تمہارے لئے فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ کا قانون مکافاتِ عمل ایسا حکم گیر اور محیطِ کل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غلطی کا امکان نہیں۔ اس لئے فکر اپنی اپنی کرنی چاہیئے۔ ہماری

لے یہ آیہ جلیلہ حیات بعد الممات کے اہم مباحث سے متعلق ایک بنیادی اصول بھی بیان کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نکتہ ایک مبسوط تشریح کا محتاج ہے اس لئے اس کا بیان ”کتابِ آخرت“ میں آئے گا۔

نجات کے لئے ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں بزرگ بڑا ہے یا فلاں اور فلاں کی نجات ہوگی یا نہیں۔ ان کے متعلق ہمارے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ ہم دعا کریں کہ

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذِیْ خَوَائِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُونَا بِالْاِیْمَانِ (۵۹/۱۰)  
اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔

ان کے اعمال کے متعلق ہم سے باز پرس نہ ہوگی۔

قُلْتَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُونَ  
عَمَّا كَانُوا یَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۴۱)

یہ اُمت تھی جو گزر چکی۔ اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماد گے۔ تم سے اسکی کچھ پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟

اُن کے اعمال اُن کے ساتھ، ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ اس لئے اس فکر کی کیا ضرورت ہے کہ ان کا کیا حال ہے؟ فکر یہ کرو کہ ہمارا کیا حال ہوگا؟

**آیہ عبرت!** | حضرت موسیٰؑ کے اس جواب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے فرعون کی چال کس طرح ناکام بنا کر رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ آج مسلمان تہمت

افتراق کے جس جہنم میں مبتلا ہیں کیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی نہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اسلاف پرستی کے اس سوال کے جواب میں (جو فرعون نے کیا تھا) وہی طریق اختیار کریں جو زبان وحی سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ رَفِیْ کِتَابِ (۱۶۶) ایک ایک کے متعلق عدالت کی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور (معاذ اللہ) خدائے احکم الحاکمین کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیتے ہیں؟ اس پر باہمی تکفیر و تفسیق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں، ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کی ماننے والی اُمت واحدہ، سینکڑوں فرقوں میں بٹ کر علی شریعت دیتی ہے اور قیامت بالائے قیامت کہ تخریب و تشیع اور فرقہ سازی اور گردہ بند کی ان تمام مذہبوں کو کشتیوں کا نام "خدمت اسلام" رکھا جاتا ہے! یا للجب!!

بہر حال، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس سوال کا بھی ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات

بن نہ پڑی۔ چونکہ اس جواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف اشارہ کیا تھا اس لئے اس کی مزید تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا جس سے قانونِ کائنات کی ہمہ گیری سے قانونِ مجازات پر استدلال کیا جاتا ہے، یعنی مبدار سے معاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی) آپ نے فرمایا:-

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَ سَلَكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا .....  
وَمِنْهَا نَخْرِجُكُمْ قَارَةً أُخْرَىٰ ۖ (۵۳-۵۵/۲۰)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین پکھولنے کی طرح پچھادی، نقل و حرکت کے لئے اس میں راہیں نکال دیں، بادلوں سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں؟ اس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں لوٹا جاتا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

سورہ شعرا میں بھی اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۳/۲۴) فرعون نے پوچھا کہ رب العالمین کون ہے۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا إِنَّ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ۝ (۲۴/۲۳) (موسیٰ نے کہا کہ وہ پستیوں اور بلندیوں کا اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہیں، رب ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو تو۔ ظاہر ہے کہ اس الہ حقیقی کا عقیدہ، نہ صرف قوم فرعون کی اصنام پرستی ہی کو جڑ سے اگھڑ دیتا تھا بلکہ خود فرعون کے مزعومہ دعویٰ ربوبیت کو بھی خاک میں ملا دیتا تھا۔ اس لئے کہ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۲۳/۴۹) **فرعون کا دعویٰ ربوبیت** (میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں) اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ

پہلے کہا جا چکا ہے، ایک فرعون موسیٰ ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا میں ہر مستبد قوت اپنے دہرہ و اقتدار کو اپنی راہوں سے قائم کرتی ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اور پھر بھوکے انسانوں سے جو جی میں آئے ہنوا اور کرا لیتی ہے، ورنہ انسان اگر اپنی روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو تو کسی کے سامنے جھکے کیوں؟ فرعون کے دعویٰ ربوبیت کی بھی یہی بنیاد تھی۔ اس لئے جب حضرت موسیٰ نے کہا کہ میرا خدا رب العالمین ہے یعنی

کائنات کی ہر شے کا پروردگار اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں تفصیل سے بتا دیا کہ خدا کس طرح مخلوق کے لئے سامانِ رزق بیتا کرتا ہے (۵۳ - ۵۵/۲۰)۔ تو فرعون نے اپنے حواریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ ”سنئے ہو، یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ (۲۵/۲۶) فرعون کے اس استفسار میں ایک طرف تضحیک کا پہلو بھی ہے، لیکن دوسری طرف اپنے اربابِ حکومت کی توجہ اس انقلابی روح کی طرف بھی منعطف کرادی گئی ہے جو حضرت موسیٰ کے اس دعوائے ایمان میں جھلک رہی تھی۔ جس شخص کا ایمان یہ ہو کہ کائنات کی کسی شے کا پروردگار خدائے بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی نہیں، وہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے بھلا کب جھکنے دے گا۔ فرعون کی نگاہوں نے حضرت

اور اس دعوے کا ابطال | موسیٰ کے اس سادہ سے جملہ میں انقلابِ آسمانی کی وہ تمام بجلیاں بھانپ لیں جو اس قسم کے ایمان کے سحاب میں بیتاب ہوتی ہیں۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس استہزاء آمیز تنقید کو اسی حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے اور فرمایا۔ قَالَ رَبُّكُمْ ذَرَبْتُ أَبَايَكُمْ الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۶/۲۷) ”وہ اللہ! تمہارا رب اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے،“ اس ٹکڑے میں درحقیقت ضمناً فرعون کے اس ”نشر“ کا بھی جواب تھا کہ تم انسانوں کی ربوبیت کے مدعی ہو، حالانکہ تم اور تمہارے آباء و اجداد (جنہیں تمہاری طرح ہی دعویٰ تھا) سب اپنی پرورش کے لئے بھی اسی بارگاہِ صمدیت کے محتاج تھے (اور ہیں)۔ سو جب تم خود اپنی پرورش کے لئے کسی اور کے محتاج ہو تو تم دوسروں کی پرورش کیا کر سکتے ہو؟ فرعون نے پھر اہل دربار کی طرف دیکھا اور کہا کہ سنئے ہو! اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے آباء و اجداد (یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کا بپتی تھی) اس کے نزدیک سب محتاج ہیں۔ کیا اس قسم کی باتیں کوئی سلیم العقل انسان کر سکتا ہے؟

قَالَ إِنَّ دَسُؤْلَكُمْ إِلَيْنِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۝ (۲۷/۲۸)

فرعون نے کہا کہ یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے (سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ) دیوانہ ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس جگر پاش تنقید سے پھر اسی بے رخی کا برتاؤ کیا جس کی درحقیقت وہ سزاوار تھی اور اپنے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں ہی کا پروردگار نہیں، بلکہ ساری دنیا میں بسنے والی مخلوق کا رب ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۝ إِنَّ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۲۸/۲۹)

موسیٰ نے کہا کہ وہ خدا، مشرق و مغرب اور ان کے مابین جو کچھ ہے، سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم

(کچھ بھی عقل رکھتے ہو تو اس حقیقت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں)۔

**تخویف کا اوجھا حربہ** | فرعون یہ کچھ سنا جا رہا تھا اور غم و غصہ سے یہ سچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ اس کے دعویٰ ربوبیت کی یوں پے در پے دھجیاں بکھری جا رہی ہیں اور بھی اس کے اراکین سلطنت کے سامنے تو کھسیانہ ہو کر اس حربہ پر اتر آیا جو مستبد قوتوں کے پاس آخری ”دلیل“ ہوتا ہے۔ کہا

قَالَ لَیِّنِ اتَّخَذْتَ إِلَهًا غَيْرِي لَوَجَّعْتُكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ۝ (۲۹/۲۶)

فرعون نے کہا کہ اگر تو میرے سوا کسی اور کو الہ (حاکم تسلیم کرے گا تو قید و بند میں جکڑ دوں گا۔ دیکھئے! سیاست فرعون اور حکمت کلہی کی تمام تفصیل کس طرح اس مختصر مکالمہ کے اندر جھل جھل کر رہی ہیں۔ دنیا میں فرعون قوتیں، انسانوں سے اپنی ”معبودیت“ تسلیم کرانا چاہتی ہیں اپنے مزعومہ دعویٰ ربوبیت کی بنیاد پر اور حکمت کلہی ان کے دعویٰ ربوبیت کی حقیقت کو بے نقاب کر کے ان کی ”معبودیت“ کے زعم باطل کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شروع سے آج تک دنیا میں یہی کش مکش جاری ہے اور جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز  
چراغ مصطفویٰ سے شہداء بولہبی

**سلسلہ صید و صیاد** | یوں تو دنیا میں ہر شکار میں لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک اس وقت پہنچتی ہے جب ایک انسان کا شکار دوسرا انسان ہو۔ یہ وہ لہو ہے جو منہ سے لگے نہیں چھوٹتا۔ تاریخ نوع انسانی پر غور کیجئے تو یہ اسی سلسلہ صید و صیاد کی ایک خوب نکال استا نظر آئے گی۔ قوم بنی اسرائیل، مصریوں کے پیچھے آہنی میں ایک بے بس شکار کی طرح تڑپ رہی تھی حضرت موسیٰ کا مطالبہ اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس مظلوم شکار کو چھوڑ دو اور اجازت دو کہ میں انہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں جہاں یہ انسان آزادی کی فضائے بیط میں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ بنظر معقولیت (یعنی بنگاہ انسانیت) دیکھئے تو اس پر اہل فرعون کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ لیکن اگر وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے تو پھر اپنی ہوس حکمرانی کی تشنگی کس طرح بجھاتے! مستبد قوتیں صرف اپنے معاملات کی درستی کے لئے ہی اپنی حکومت قائم نہیں کرتیں بلکہ انہیں اپنے جذبہ حکومت کی



تسلیم کے لئے کسی دوسری قوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے خون کی رنگینی ان کے قصرِ دولت کی آرائش و زیبائش کے کام آ سکے۔ اس لئے اس قسم کی مستبد قوتیں کبھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ محکوم قوم ان کے نظامِ حکومت سے نکل کر .. .. اپنا جہدِ اکابرانہ نظام قائم کر لے۔ اس لئے کہ اس سے وہ

**فرعون کی جیلہ کاریاں** | محکوم قوم برابری کے درجہ پر آجاتی ہیں، محکوم نہیں رہتی اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، مستبد قوم کی حکومت کے لئے کسی محکوم قوم کا وجود ضروری ہوتا ہے جسے وہ مختلف جیلوں اور حربوں سے دبائے رکھے۔ یہی کچھ فرعون نے کر رکھا تھا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۸/۴)

فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ (وہ کرتا یہ تھا کہ) وہاں کے رہنے والوں کی مختلف پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا۔ (اس غرض کے لئے وہ بنی اسرائیل کے) بیٹوں کو قتل کر دیتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا۔ وہ یقیناً بڑے مفسدین میں سے تھا۔

اس آیتِ جلیلہ کے غوامض پر غور کیجئے۔ مفسدِ اربابِ حکومت کی دسیسہ کاریوں کی طولانی فہرست چند لفظوں میں سمٹ کر آگئی ہے۔ گروہ سازی اور پارٹی بندی،

**دسیسہ کاریاں اور گروہ سازی** | وہ بنیادی حربہ ہے جس پر ابلیسی نظام کے قیام کا دار و مدار

ہوتا ہے۔ (جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا) اور ان میں سے ایک خاص جماعت کو کمزور رکھنے کی ہر ممکن کوشش، تاکہ وہ ابھرنے نہ پائے اور ان کی اکثریت نہ ہو جائے (يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ) اور اس طرح جب ان میں، کا سب افراد کی کمی ہو جائے تو ان کی معاشی حالت بھی کمزور ہو جائے اور یوں رفتہ رفتہ ان کی متاعِ غیرت و حریت اور نقدِ اخلاق و عصمت کو ایک ایک کر کے لوٹ لیا جائے یا ان میں سے جو لوگ ایسے نظر آئیں جن میں جرات و حریت کے جوہر ہوں انہیں ذلیل و خوار کیا جائے اور جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں انہیں معزز و مقرب بنا دیا جائے۔ اس طرح اس محکوم قوم پر احسان بھی رکھا جائے کہ اس سے کس قدر فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دبائے بھی رکھا جائے۔ یہ ہے وہ فسادِ آدمیت جو فرعون نے نظامِ حکومت کا

خاصہ ہوتا ہے (إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ) اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے ضربِ کلیمی اور حزبِ اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ غور کیجئے! کہنے کو تو یہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کی ایک قوم کی داستاں ہے لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی حقائق ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوا کرتے۔ یہ حقیقت آج بھی اسی طرح تازہ اور زندہ ہے جس طرح آج سے چار ہزار سال پہلے تھی۔ قرآن، حقائق سے بحث کرتا ہے جو فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طاغوتی سیاست کی جن مہرہ بازیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ سے متعلق نہیں ہیں۔ اہلیس شروع سے آدم کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ وَفِيهَا آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، حضرت موسیٰؑ نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ مطالبہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسا نہیں تھا جسے آسانی تسلیم کر لیا جاتا۔ اس کی مخالفت میں تو ہر ممکن قوت صرف ہو جانی چاہیے تھی اور ایسا ہی ہوا۔

پھر حضرت موسیٰؑ کا دوسرا مطالبہ کہ خدائے واحد کی حکومت اختیار کرو، فرعون کے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جس روش پر آباء و اجداد کے وقت سے چلے آ رہے تھے، اس کا چھوڑ دینا! جس حکومت اور "شانِ خداوندی" کو اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اسے تیاگ دینا!! جس نشہ قوت و ثروت میں صدیوں سے ہدمست چلے آ رہے ہیں اسے ترک کر دینا!! کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے بڑی قربانی اور بڑے حکم ایمان کی ضرورت تھی۔ قوم فرعون بھلا اسے کس طرح آسانی سے قبول کر لیتی؟ اگر ایسے مطالبات اتنی آسانی سے قبول کر لئے جایا کرتے تو دنیا میں باطل شکن بازوؤں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟

قوم فرعون سے ان مطالبات کی مخالفت اور سخت مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن مشیت کو یہ منظور تھا کہ جس مظلوم قوم کو اس درجہ کمزور و ناتواں بنا دیا گیا ہے اسے دنیا میں سرفرازی عطا کرے۔ (کیونکہ ان میں ہنوز اس سرفرازی کی صلاحیت باقی تھی)۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ  
إِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۚ وَنُفَصِّلَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ دَنَرِي  
فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ مَجْنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝ (۵-۲۸/۶)

اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک میں یوں کمزور بنا دیا گیا تھا اور انہیں (قوموں کا) پیشوا بنائیں اور انہیں (قوم غالب کے تخت و تاج کا) وارث بنائیں اور انہیں ملک میں متمکن کر دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر اس (مال) کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس (کے تصور) سے وہ لرزاں تھے۔

**خدا کا احسان کیا ہوتا ہے؟** | دوسری آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے، اہل فرعون کو یہی خوف تھا کہ بنی اسرائیل کسی دن اُبھر کر سامنے نہ آجائیں۔ اسی لئے وہ انہیں پکھلنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن مشیتِ خداوندی نے یہ اعلان کر دیا کہ بالآخر وہی ہو کر رہیگا جس سے وہ یوں لرزاں تھے۔ بنی اسرائیل اُبھرے اور فلسطین اور اس کے گرد و نواح کی زمینوں پر (جو اس زمانہ میں حکومت مصر کی باجگزار ریاستیں تھیں) قابض ہو گئے۔ یہ تھا کمزوروں پر اللہ کا احسان۔ لیکن کیا یہ احسان یونہی بیٹھے بٹھائے سایہ فگن ہو گیا تھا؟ اس کے جواب کے لئے ابھی چند صفحات کا اور انتظار کیجئے۔ جب وہ ٹکڑا سا منہ آئے گا تو اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ احسان کن جاں گداز اور صبر آزمایا ماحول سے گزرنے کے بعد وہ سر فرازی ہوا تھا۔

**دعوتِ موسیٰ کا استقبال** | بہر حال، یہ تھا حضرت موسیٰ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسول ہو اور اس مقصد کے لئے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے آزاد کر کے لے جاؤ۔ لیکن اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی مامور من اللہ ہو! قَالَ اِنْ كُنْتَ جَاءْتَنِي بِآيَةٍ ۖ فَلْتَرْبِهْآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۱۰۸) فرعون نے کہا کہ اگر تو واقعی کوئی نشانی لے کر آیا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے، تو پیش کر۔ حضرت موسیٰ کے پاس نشانات موجود تھے۔

فَاَلْقَىٰ عَصَاهُ ۖ فَاِذَا هِيَ تَلْعَبَانُ مِثْلَ نَجْمٍ ۝ وَنَزَعَ يَدَهُ ۖ فَاِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (۱۰۹-۱۰۸)

اس پر موسیٰ نے اپنی لالٹھی ڈال دی، تو اچانک ایسا ہوا کہ ایک نمایاں اثر ہوا ان کے سامنے تھا!

اور اپنا ہاتھ (جیب سے) باہر نکالا تو اچانک ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کے لئے سفید چمکیلا تھا۔ یہ ترجمہ ان الفاظ کے ظاہر معنوں کے اعتبار سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر ان الفاظ کو استعارہ لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زورِ دُرّوں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت و شدت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانین خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار و تابناک ہوگا۔ ان دلائل کی درخشندگی و تابناکی ہر دیدہ بینا کو نظر آتی چلی جا رہی تھی۔

اربابِ حکومت نے جب یہ کچھ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ ؕ يَرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ  
مِنْ أَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝ (۱۰۹-۱۱۰/۷)

فرعون کی قوم کے سردار (آپس میں) کہنے لگے کہ یہ تو کوئی بڑا سحر کار ہے۔ یہ چاہتا ہے (کہ اپنے زور و  
سے کام لے کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لے اور) تمہیں ملک سے نکال باہر کرے (اور خود مالک بن جائے)۔

اب بتلاؤ کہ اس بارے میں تمہاری صلاح کیا ہے؟

اس کے بعد فرعون سے کہا۔

قَالُوا أَرْجِهْ وَ أَخَاهُ وَ أَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ؕ يَأْتُواكَ  
بِكُلِّ سِحْرِ عَلِيمٍ ۝ (۱۱۱-۱۱۲/۷)

چنانچہ انہوں نے (باہم مشورہ کے بعد) فرعون سے کہا ”موسے اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے  
کر روک لے اور (اس اثنار میں) نقیب روانہ کر دے کہ (مملکت کے) تمام شہروں سے سحر کار  
مذہبی علماء کو اکٹھا کر کے تیرے حضور لے آئیں“۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس مقام پر ہم فقط اتنا دیکھیں گے کہ فرعون اور اس  
کی قوم کی طرف سے اس دعوت کا استقبال کس طرح ہوا۔ قرآن کریم مختلف مقامات پر اس گوشہ کے متنوع پہلوؤں  
کو سامنے لایا ہے۔ سورہ اعراف کی متعلقہ آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ سورہ یونس میں ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُبِينٌ ۝ (۱۰/۷۶)  
 پھر جب ہماری جانب سے ان پر سچائی نمودار ہو گئی، تو کہنے لگے، ”یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے، صریح جادو“ (یا کھلا ہوا باطل)۔

اس کا جواب حضرت موسیٰ کی طرف سے کیا ملا؟ فرمایا۔  
 قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هَذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ۝ (۱۰/۷۷)

موسیٰ نے کہا کہ تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہو گئی، ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ سحر ہے؟ حالانکہ سحر کار (یا باطل پرست) کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

**اسلاف پرستی** | اس بصیرت افروز دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ بھلائے اس کے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے، علم و عقل کی راہ چھوڑ کر فوراً اس روش کی طرف آگئے،

جیسے ہم (ہوئے نور میں) اُمم سابقہ کے تذکرہ میں دیکھ آئے ہیں، یعنی اسلاف پرستی کا اندھا جذبہ  
 قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَلْفِتْنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمُ الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ ۖ وَمَا نَحْنُ بِكُم بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰/۷۸)  
 انہوں نے (جواب میں) کہا کہ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے۔ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں۔

اسلاف پرستی کی عقیدت اور اپنی قوت و حکومت کا نشہ! انھیں کس طرح چھوڑا جاسکتا تھا؟ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ مُّبِينَاتٍ فَنَسَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَٰمُوسَىٰ مَسْحُورًا ۝ (۱۴/۱۰۱)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے موسیٰ کو نو آشکارا نشانیاں دی تھیں جب وہ بنی اسرائیل میں ظاہر ہوا تھا۔ تو بنی اسرائیل سے دریافت کرو (کہ کیا ماجرا گذرا تھا) فرعون نے اس سے کہا تھا کہ

اے موسیٰ! میں خیال کرتا ہوں ضرور تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے؟ (یا تو باطل پرست ہے)۔  
 (ان نشانوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) دوسری جگہ ہے۔

فَتَوَلَّىٰ بِرْكُنْهٖ وَ قَالَ سِحْرٌ اَوْ مَجْنُونٌ ۝ (۵۱/۳۹)  
 سو فرعون نے (دعوتِ کلیبی سے) اپنی قوت (د حکومت کے گھمنڈ پر) روگردانی کر لی اور کہا کہ (یہ) یا تو  
 جادوگر (باطل پرست) ہے اور یا مجنون۔

سچ ہے! قوت کے نشہ میں عقل دہوش کی باتیں ایسی ہی نظر آ کر تی ہیں جیسے رنگین چشمہ میں سے  
 ہر شے رنگدار نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُ مَا اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رُبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ  
 بِصَآئِرٍ ۚ وَ اِنِّیْ لَآ طُنُكٌ يُّفَرِّعُوْنَ مَثْبُوْرًا ۝ (۱۴/۱۰۲)

موسیٰ نے اس پر کہا کہ تو یقیناً جان چکا ہے کہ یہ احکام مجھ پر کسی اور نے نہیں اتارے مگر اُسی نے  
 جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔ اور ان میں (عبرت و تذکیر کے لئے) سمجھنے بوجھنے کی روشنی ہے۔ اور  
 اے فرعون! میں تو سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا ہے۔

کیسی کھری کھری سی بات کہہ دی کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی سے نظر آ رہا ہے کہ تمہاری ہلاکت کے دن قریب  
 آچکے ہیں۔ غور کیجئے! یہ اس مستبد بادشاہ سے کہا جا رہا ہے جس کے نام کی نسبت سے دنیا میں کُرشِ د  
 عدوان متعارف ہے، یعنی فرعونیت، رعوت اور تکبر کی شدید ترین صورت کا نام بن چکی ہے، لیکن جو مردِ خدا  
 صرف قوانینِ خداوندی سے ڈرنے والا ہو، اس کے سینے میں کسی اور کا ڈر کیسے آ سکتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ،  
 خوف تو شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ ہمیدہ است

خوف را در شرک مضمردیدہ است

سورہ طہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے نہایت مسکت دلائل سے واضح کر دیا کہ وہ کس خدا کے فرستادہ  
 ہیں تو فرعون نے کہا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا

يَسْخَرُكَ يَمْوَسَّىٰ ۝ (۲۰/۵۴)

اس نے کہا ”اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور (یا باطل پرستازہ زور بیان سے) ہمیں ہمارے ملک سے باہر کر دے؟“

سورہ مومنین میں، سرداران حکومت کی طرف سے ایک ایسا جواب منقول ہوا ہے جو حقائق و معارف کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتا ہے۔

فَقَالُوا أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَقَوْمُهُمْ لَنَا

عِبْدٌ ذُنَّ ۝ (۲۳/۴۴)

وہ (آپس میں) کہنے لگے، کیا ہم اپنی ہی طرح کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ ان کی قوم ہماری عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کئے ہوئے ہے۔

پہلے حصہ میں ہے کہ کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں جو ہماری رسولوں کی بشریت پر اعتراض

یہی طرح کے دو انسان ہیں! یہ وہ اعتراض ہے جو اس سے پیشتر بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں (اور جس کی تشریح جوئے فرد میں گزر چکی ہے) یعنی انسانوں کی عجوبہ پسند طبیعت اسے پسند کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی کہ انہی جیسا ایک انسان خدا کا رسول ہو سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ تمام اقوام و ملل نے اپنے اپنے ”بانیان مذاہب“ کو انسانیت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا اور پھر ان کی طرف ایسے ایسے ”طلسم ہوش ربا“ کے سے افسانے منسوب کر دیئے جنہیں شکر انسان جادو کے جزیروں میں پہنچ جائے۔ یہی اعتراض قوم فرعون نے کیا۔

لیکن اس اعتراض کا دوسرا حصہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا

محکوم کی بصیرت؟ کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو اس قوم کے فرد ہیں جو خود ہماری محکوم ہے غور کیجئے، حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت کو چند سادہ الفاظ میں کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں حاکم قوم کے نزدیک، محکوم قوم کی کوئی بات درخور اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ قوم غالب کی ہر ادائیں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے جسے مغلوب قوم بلا سوچے سمجھے اختیار کئے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی اس قوم کا تمدن اور وہی اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ سچی کہ اس محکوم قوم کے خیالات، نظریات و معتقدات بھی وہی کچھ

ہو جاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابلِ ستائش ہوں۔ وہ دیکھتی ہے تو اُن کی آنکھوں سے، سنتی ہے تو اُن کے کانوں سے اور سوچتی ہے تو اُن کے دماغ سے لَحْمٌ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اُذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (۴/۱۴۹)۔ دل میں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، اُولَٰئِكَ كَاٰلُ نَعَامٍ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۴/۱۴۹) ”یہ (انسان نہیں) حیوان میں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ“ اس لئے کہ اُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۵ (۴/۱۴۹) ”یہ لوگ (اپنے آپ سے) بے خبر ہیں“

لیکن ان کے برعکس، قوم غالب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بات ان کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ محکوم قوم کے ہاں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے! اور سچ پوچھئے تو وہ ایسا سمجھنے میں چنداں مورد الزام بھی قرار نہیں پاسکتے۔ ”درخت اپنے پھل سے پیچا ناجاتا ہے“ بھوکا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس دنیا بھر کے افلاس اور محتاجی کا حتمی علاج موجود ہے تو اسے کون ہوشمند صحیح تسلیم کرے گا؟ اس لئے جو قوم عملاً غلام ہو، اس کی بات پر اعتماد کون کر سکتا ہے۔ بقول حکیم الامتؒ:۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی جسے زیبا کہیں آزاد بندے سے وہی زیبا  
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مروانِ حر کی آنکھ ہے بینا

**آج کا مسلمان آئینہ کے سامنے** | آج مسلمان حیران ہے کہ اسلام جب ایک حقیقت ثابت ہے تو اسے دنیا بے غل و غش قبول کیوں نہیں کر لیتی۔ لیکن

یہ کہتے وقت وہ کبھی نہیں سوچتا کہ دنیا، اسلام کو اس کے پیش کرنے والوں کی حالت سے جانچتی ہے جن پیش کرنے والوں کی حالت یہ ہو (جو ہماری آج ہے) تو ان کی بات سننا کون پسند کرے گا۔ وہ جہاں بھی جائیں گے یہی جواب پائیں گے کہ اَنُؤْمِنُ بِبَشَارَتِنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عِدٌ ۙ (۱۲۳/۴۱) کیا ان کی بات پر ایمان لے آئیں جو دنیا میں انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں! اگر اس نسخہ گیمیا میں ایسا ہی حیات بخش اثر ہے جیسا یہ بتاتے ہیں تو ان کی اپنی حالت کیوں ایسی ناگفتہ بہ ہو رہی ہے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا کوئی جواب بن نہیں پڑ سکتا۔ اسلام کو پیش کرنے کا حق صرف اس قوم کو حاصل ہے جس کی اپنی حالت اسلام کے درخشندہ نتائج کی زندہ دلیل ہو، نہ کہ ان بھکاریوں کا جو اپنی روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہوں۔ انھیں تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیئے



کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہرِ عالم تاب، گہن میں آرہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ  
 تاننداری از محمدؐ زنگہ بو  
 از درودِ خود میالا نام او  
 کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان و قلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا  
 جاسکتا ہے؟

**احسانات کی یاد دہانی** | پھر لوٹیے اصل قصہ کی طرف! سورہ شعراء میں اس واقعہ کے ضمن میں  
 ایک اور ایسی بات آگئی ہے جو دنیا میں سیاستِ فرعونؒ کی ہم حقیقت  
 اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت  
 دے دی جائے تو فرعونؒ نے کہا کہ ”موسیٰ! تو اور اس قسم کی بغاوت کی باتیں! عالانکہ تجھے یاد ہونا چاہیے کہ ہم  
 نے کس ناز و نعمت سے تیری پرورش کی اور پھر تو یہاں سے کتنا بڑا جرم کر کے بھاگا تھا! اس پر بھی ہم نے تجھ  
 سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔ تو بڑا ہی احسان فراموش واقع ہوا ہے؟“

قَالَ أَلَمْ نَرْبُّكَ فِتْنًا وَرَيْدًا ۖ وَ لَبِثْتَ فِتْنًا مِّنْ عَمُرِكَ سِنِينَ ۝ ۵

فَعَلْتَ فَعَلْتَكَ الْيَتَّىٰ فَعَلْتَ وَ أَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ ۵ (۱۸-۲۴/۱۹)

فرعونؒ نے کہا کیا ہم نے بچپن سے تیری پرورش نہیں کی؟ اور پھر تو ہمارے ہاں اپنی عمر کے کتنے ہی

برس رہا (کیا یہ احسان بھی بھلا دیا؟) اور پھر تو نے وہ (جرم) کیا جو تجھ سے سرزد ہوا تھا (اس پر بھی ہم

نے مواخذہ نہیں کیا) اور تو (فی الواقعہ بڑا ہی) ناشکر گزار ہے۔

فرعونؒ کے طعن کا دوسرا حصہ چونکہ ایک جرم کو آپ کی طرف منسوب کر رہا تھا اس لئے آپ نے پہلے اسی کی  
 طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذَا ۖ أَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ۝ فَفَرَدْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ

فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا ۖ وَ جَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ ۵ (۲۰-۲۴/۲۱)

(موسےؑ نے) کہا کہ وہ واقعہ تو مجھ سے نادانستہ ہو گیا اور بھاگا تھا (یوں کہ مقتول چونکہ تمہاری

قوم کا فرد تھا اس لئے) مجھے ڈرتھا کہ تم انصاف نہیں کرو گے اور مجھے قتل بالعمد کا مجرم قرار دے کر موت کی سزا دیدو گے۔ اس کے بعد اللہ نے مجھے حکم عطا فرمایا اور اپنے رسولوں میں سے بنادیا۔  
(اور میں تیری طرف آگیا۔)

”ہاں! میں بھاگ گیا تھا!! اس لئے نہیں کہ میں واقعی قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور اپنے آپ کو اس جرم کا مجرم سمجھتا تھا، بلکہ اس لئے کہ تیرے ظلم و ستم اور تیرے اربابِ حکومت کی سازش سے ڈرتا تھا کہ ان کے اثر کے ماتحت فیصلہ حق و انصاف کی رُو سے نہیں بلکہ دوسرے رجحانات و مقتضیات کے مطابق ہونا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ مجھے اللہ کی طرف سے عطا ہوا اس سے وہ تمام خوف دُور ہو گیا۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تمہارے خاندان نے میری پرورش کی تو اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

وَقَدْ نَعِمْتَ تَمَنُّهَا عَلَىٰ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ (۲۴/۲۲)

اور یہ ہے تمہاری وہ نعمت جس کا احسان تو مجھ پر جتنا ہے کہ تو نے (تمام) بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟

غور فرمائیے! حضرت موسیٰ نے کیسی حقیقت کشا بات کہی ہے؟ مستبد حکومت کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کے چند ایک ممتاز افراد کو نوازی ہے تاکہ وہ اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکیں اور پھر ان کی ساری کی ساری قوم کو محکومی کے شکنجے میں کسے رکھتی ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جس احسان کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد کی پرورش کی اور اس کی قیمت اتنی وصول کر رہے ہو کہ ساری کی ساری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے؟ کیا اسی کا نام احسان ہے؟

فرعون نے جب یہ تمام باتیں سنیں تو بھانپ گیا کہ حضرت موسیٰ انقلابات کی کتنی دنیا میں اپنے ساتھ لائے ہیں، کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سُن لیا! یاد رکھو۔

قَالَ لَئِنْ آتَخَذْتُ إِلَهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ

(۲۴/۲۹)

اگر تم میرے سوا کسی اور کو سزاوارِ حکومت سمجھو گے تو یقیناً تمہیں قید کر دوں گا۔

حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس میرے دعوے کے ثبوت میں کھلی کھلی دلیلیں موجود ہوں تو کیا تو پھر بھی اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہے گا؟

قَالَ اَوْ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ۚ (۲۴/۳۰)  
(موسے نے کہا) کہ بھلا اگر میں تیرے سامنے کوئی کھلی ہوئی (دلیل) لے آؤں تو؟  
فرعون نے کہا۔

قَالَ فَلْتِمَّ بِيَّ اِنْ كُنْتَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۲۴/۳۱)  
کہا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو لے آ (جو کچھ تجھے لے آنا ہے)۔

اس پر۔

فَاَنْفَىٰ عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۚ وَنَزَعَ يَدَهُ فَاِذَا هِيَ  
بَيْضَاءُ لِّلنَّظَرِیْنَ ۚ (۲۴/۳۲-۳۳)

(موسے نے) اپنا عصا ڈالا تو (دیکھو) وہ ایک صاف صاف اژدھا بن گیا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ  
ناظرین کے لئے (بالکل) سفید تھا۔

ان الفاظ کو اگر استعارہ کے رنگ میں لیا جائے تو ان کا جو مفہوم ہوگا اسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے (اُسے  
ہر مقام پر دہرانے کی ضرورت نہیں)۔

اس پر فرعون نے اراکین سلطنت سے کہا۔

قَالَ لِلْمَلَآئِكَةِ اِنْ هٰذَا لَیْسَ عَلَیْكُمْ ۙ فَاِذَا تَأْمُرُونَ ۝ (۲۴/۳۴-۳۵)

(فرعون نے) اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے کہا کہ (یقیناً) یہ ایک بہت بڑا باطل پرست ہے۔  
اور اس کے ارادے یہ ہیں کہ اپنے باطل کے زور پر تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کرے۔ سو  
(کہو) کہ تمہارا کیا فیصلہ (یا حکم) ہے۔

انہوں نے کہا۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاۤءُ وَاَبْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۚ یٰۤاَتُوْكَ  
بِكُلِّ سَمَآءٍ عَلَیْمٍ ۝ (۲۴/۳۶-۳۷)

انہوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو ہملت دیدے اور شہروں میں نقیب بھیج دے کہ وہ ہر ایک مذہبی عالم کو تیرے پاس لے آئیں۔

اس سلسلہ میں سورہ اعراف کی جو آیات پہلے گزر چکی ہیں ان میں کہا گیا تھا کہ ارباب حکومت نے باہمی مشورہ کیا اور پھر فرعون سے کہا کہ پیشواؤں کو جمع کراؤ۔ یہاں فرمایا ہے کہ اراکین سلطنت سے پوچھا تو انہوں نے ایسا مشورہ دیا۔ بات ایک ہی ہے۔ فرعون نے ان سے پوچھا، انہوں نے باہمی مشورہ کیا اور فرعون کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی۔ سورہ نمل میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ قوم فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ کی صداقت و حقانیت کے دل سے قائل ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی ضد اور قوت و حکومت کے نشہ کی بدستی کی بنا پر انکار کئے جا رہے تھے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۱۳-۲۴)

سو جب ان کے پاس ہماری بصیرت افروز دلیلیں آئیں تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا سحر ہے اور (محض) ظلم اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دلوں نے ان (کی صداقت) کا یقین کر لیا تھا۔ تو دیکھو! (ایسے) مفسدین کا انجام کیا ہوا؟

**استہزاء** | نشہ کسی قسم کا ہو چونکہ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، اس لئے وہ سطح انسانیت سے گر جاتا ہے اور پھر ہر سخیہ اور متین بات کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہ اس کی بربادی کی آخری علامت ہوتی ہے۔ قوت کا نشہ دوسرے نشوں سے کچھ کم فائر العقل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب فرعون اور اس کے ارباب دولت سے حضرت موسیٰ کے دلائل باہرہ کا کوئی مقول جواب بن نہ پڑا تو آپ کا مذاق اڑانے لگے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ۝ (۴۷-۴۸)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف

بھیجا۔ سو اس نے کہا کہ میں خدائے رب الغلین کی طرف سے رسول ہوں۔ سو جب وہ ہمارے احکام لے کر ان کے پاس گیا تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

سورہ قصص میں ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رِحْلَةٌ مِّمَّنْ تَرَىٰ  
وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۸/۳۶)

سو جب موسیٰ ہمارے واضح احکام کے ساتھ ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک ایسا جھوٹ ہے جو وضع کیا گیا ہے اور ہم نے اپنے آباء و اجداد میں ایسا کہیں نہیں سنا۔

یعنی قوم فرعون نے کہا کہ رب العرش اور اس کی طرف سے مرسلین و مامورین! یہ ایک افسانہ ہے جسے (حضرت) موسیٰ نے یونہی وضع کر لیا ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ نے فرمایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِي ۖ وَ مَنْ  
كَوْنُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ (۲۸/۳۷)

اور موسیٰ نے کہا، میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور جس کا انجام نہایت اچھا ہونے والا ہے۔ یقیناً ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس کے جواب میں فرعون نے اراکین سلطنت سے کہا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهِ غَيْرِي ۚ فَأَوْقِدْ  
لِي يَهَامُنْ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا نَعْلِي ۚ أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ  
مُوسَىٰ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَ أَتَىٰ رَاظِنُهُ مِنَ الْكُذِبِ بَيْنَ ۝ (۲۸/۳۸) (نیز ۳۶-۳۷/۴۰)

اور فرعون نے کہا، اے سردارو! میں اپنے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں سمجھتا سو اے ہامان! میرے لئے مٹی پر آگ جلاؤ (یعنی پڑاؤ میں اینٹیں پکادو) پھر ایک محل تیار کرو تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے خدا کو (آسمان پر جھانک لوں اور اس طرح اس کی) خبر پاؤں۔ میں یقیناً اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔

لیکن فرعون اور اس کے ارباب حکومت کا یہ مزاح خود اپنے آپ سے کھتا۔ وہ بزرگم خویش حضرت موسیٰ سے مذاق کر رہے تھے لیکن تقدیر ان کے اعمال کے نتائج دیکھ کر ان پر ہنس رہی تھی۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمْ وَيَمْدُ هُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (۲/۱۵)

(حالانکہ) حقیقت یہ ہے کہ انہی کے ساتھ تمسخر ہو رہا ہے کہ اللہ (کے قانون جزا و سزا) نے نئی ٹھیلی چھوڑ رکھی ہے اور وہ سرکشی (کے طوفان) میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

بہر حال، فرعون نے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کے باوجود، حضرت موسیٰ کی تکذیب کی اور ان اصولوں سے سرکشی برقی جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ سورۃ نازعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے ارشاد فرمایا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰی اَنْ تَزْكٰى ۚ وَ اِهْدِيكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَكُوْنُ ۚ

(۱۸ - ۴۹/۱۹)

اس سے کہو کیا تو چاہتا ہے کہ تیری تطہیر کر اور تزکیہ نفس ہو جائے اور میں تجھے تیرے رب کی طرف راہ دکھاؤں اور تو اس طرح (اپنے موجودہ طرزِ عمل کے عواقب سے) ڈرے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ اس کی طرف گئے اور قَازِمَةُ الْكُبْرٰی ۝ (۴۹/۲۰) "فرعون کو ایک بہت بڑی نشانی دکھائی" لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور حضرت موسیٰ کی دعوتِ انقلاب سے سرکشی اختیار کی۔ فَكَذَّبَ وَ عَصٰی ۝ (۴۹/۲۱) اور مُنۡہ پھیر کر چل دیا۔ ثُمَّ اٰذۡبَرۡ یَسۡعٰی ۝ (۴۹/۲۲) اور اپنی رمایا کو جمع کیا اور منادی کرادی۔ فَحَسَّرَ مَنَادٰی ۝ (۴۹/۲۳) کیا منادی کرائی؟ یہ کہ یاد رکھو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمْ الْاَوْ عَلٰی ۝ (۴۹/۲۴) سو یاد رکھو! میرے سوا کسی اور کی کوئی بات نہ ماننا۔

سورۃ زخرف میں اس "منادی" کی مزید تفصیل دے دی گئی ہے۔

وَ قَادٰی فِرْعَوْنُ فِی قَوْمِہٖ ..... اِنَّہُمْ کَاٰثِرٌ قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝

(۵۱ - ۲۳/۵۴)

اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کر دیا کہ اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں؟ اور کیا یہ نہ میری جو میرے زیرِ اقتدار بہہ رہی ہیں (میری ملکیت میں نہیں؟) کیا تم یہ چیزیں دیکھتے نہیں ہو؟ بلکہ میں اس (دعوتِ انقلاب کو لے کر آنے والے) سے (کہیں) بہتر ہوں۔ یہ تو کمزور سا انسان ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا۔ (اگر یہ اتنا بڑا انسان تھا تو)

اس پر سونے کے کڑے کیوں نہ اتارے گئے یا اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہ آئے۔  
چنانچہ وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ عقل و فکر سے کام نہ لے لیں اور آنکھیں بند کر کے اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ اور اصل تو یہ ہے کہ وہ خود ہی سختی رہنا چاہتے تھے اور وہ نافرمان لوگ تھے۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر تصور میں لائیے ان جذبات کو جن سے متاثر ہو کر اُس نے یہ اعلان کیا ہوگا۔ اَکُنْ لِّی مِلْکٌ مِّثْلُ مِثْطَرٍّ؟ کیا یہ مملکت مصر (اور اس کی حکومت) میری نہیں؟ کیا اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں نہیں؟ کیا تم یہ کچھ نہیں دیکھ رہے؟ قوت و شوکت کے سب سامان ایک طرف اور دوسری طرف (نقل کفر، کفر نباشد) یہ ذلیل و کمزور سا انسان جو اچھی طرح (مہذب انسانوں کی طرح) بات بھی نہیں کر سکتا جس کے پاس ایک پیسہ تک نہیں اور دعوائے یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو اس کے جلو میں آسمان کے فرشتوں کے پرے کیوں نہیں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی اس کی بات نہ سنے۔ قوم کی کیا مجال تھی جو اس فرعونی حکم سے سرِ تابی برتی (حالانکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) وہ دل سے حضرت موسیٰ کی صداقت کے معترف تھے ماس قوم نے اپنے بادشاہ ہی کی اطاعت کی۔ اس لئے کہ قوم بھی تو یہی ہی تھی جیسا خود فرعون۔ اِنَّهُمْ کَانُوا قَوْمًا فَسِیقِیْن ۝ (۴۳/۵۴)

بھریہ چیز بھی قابل غور ہے کہ حضرت موسیٰ نے کس قدر گہرا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کے پیش نظر فرعون کو ایسے اعلانات کی ضرورت پڑی۔ غور فرمایا آپ نے کہ ایک داعی انقلاب، رسولِ برحق کی آواز میں کس قدر زلزلہ ایگزیکٹ ہوئی ہے کہ وہ دلوں کی بستیوں کو ہلا دیتی ہے۔ دنیا میں علمبردارانِ حق و صداقت کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ غیر فدائی نظام ہائے زندگی میں ایسا زلزلہ پیدا کر دیں کہ ہر طاغوتی قوت بلبلا اٹھے!

پھر اس نکتہ کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ فرعون نے کہا کہ اگر یہ شخص صاحبِ شمت و دولت ہوتا تو بھی اس کی بات سن لی جاتی! لیکن یہ "غیر مہذب" سا مفلس و نادار انسان اور دعویٰ اس قدر بلند آہنگ! یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم قومِ لوح کے زمانہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔

فرعون نے اپنی بوکھلاہٹ میں یہ سب کچھ کہا لیکن بایں ہمہ اسے خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰ کی

## قوتِ کلیمی

دلکش تعلیم اور اس کی تائید میں ایسے واضح دلائل کہیں اس کی قوم کو متاثر نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے اس کا علاج یہی سوچا کہ اپنی قوم کے پیشوایان مذہب کے ساتھ اس کا مناظرہ کرایا جائے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ باوجود اپنی (بظاہر) بے سہ سامانی کے، حضرت موسیٰ اپنے اندر کتنی بڑی قوت رکھتے تھے کہ فرعون کو یہ جرأت ہی نہیں پڑی کہ انہیں پکڑ کر قتل کرادے یا قید کر دے۔ سیرتِ بلند کی قوت بڑی بے پناہ ہوتی ہے۔ محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو، بس ایک کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر سرکشی و استبداد سب قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

مردِ محکم ز زورِ لا تخف — ما بمیدان سرِ بجیب او سرِ بکف  
پادشاہں در قباہائے سریر — ز رور و از سہم آں عریاں فقیر  
بہر حال، فرعون نے حکم دیا کہ ملک کے ساحرین کو اکٹھا کیا جائے۔ اب حق و باطل کی کشمکش کا ایک نیا میدان سامنے آیا۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَوْحًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ  
الْغَالِبِينَ ۝ (۷/۱۱۳)

چنانچہ ساحرین فرعون کے حضور آئے۔ انہوں نے کہا ”اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ملنا چاہیئے۔

مقابلہ واقعی اہم تھا اس لئے انعام کا مطالبہ بے جا نہ تھا۔ فرعون نے کہا:

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ كُنتُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ (۷/۱۱۴)

فرعون نے کہا ”ضرور ملے گا اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہو جاؤ گے۔“

اس سے بڑا انعام اور کیا حاصل ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کا تقریب حاصل ہو جائے۔ تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں ساحرین قوم فرعون کے مقابلہ کا واقعہ

## ساحرین سے مقابلہ

بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے سامنے آنے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اگر عصا اور یدِ بیضا کے متعلق قرآن کریم کے الفاظ کے ظاہرِ اعمیٰ لئے جائیں تو یوں نظر آئے گا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ مقابلہ قوم فرعون کے جادوگروں سے تھا۔ انہوں نے میدان میں جادو کے



زور پر رستیوں کو سانپ بنا کر دوڑتا ہوا دکھایا اور حضرت موسیٰ کے عصا نے اڑدھا بن کر ان رستیوں کو نگل لیا۔ لیکن اگر قرآنی الفاظ کو استعارات پر محمول کیا جائے تو پھر بات یوں ہوگی کہ وہ مقابلہ قوم فرعون کے مذہبی علماء سے تھا۔ انہوں نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں دلائل پیش کئے اور اپنے زور بیان سے انہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا۔ لیکن حضرت موسیٰ کے دعاوی، خداوندی قانون اور ان کی تائید میں دلائل ”میںرہ“ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بلکہ وہ پیشوایان مذہب حضرت موسیٰ کی صداقت کے معترف ہو کر آپ پر ایمان لے آئے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) میں ان الفاظ کے مجازی مفہوم کو ترجیح دیتا ہوں اس لئے میں نے ان آیات کا مفہوم اسی انداز سے پیش کیا ہے۔ جو حضرات ان الفاظ کے ظاہری معنی لینا چاہیں، وہ متعلقہ آیات کا ترجمہ قرآن کریم کے کسی نسخے سے دیکھ لیں۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ آپ ضرور ان کا مجازی مفہوم لیں۔

اب تمہید کے بعد آگے بڑھتے۔ سورہ طہ میں ہے کہ اس معرکہ کے لئے جشن کا دن مقرر کیا گیا تھا اور ذرا دن چڑھے کا وقت تاکہ لوگ ضروریات سے فارغ ہوں اور مجمع زیادہ رہے۔

فَلَمَّا يَدْنَكَ بِسَخِيرٍ مِّثْلِهِ فَأَجْعَلْ يَمِينَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا ۖ  
نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ  
وَ أَنْ يُخْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝ (۵۸ - ۵۹/۲۰)

اچھا ہم بھی اسی طرح تیری سحر طرازیوں کا جواب سحر طرازیوں سے دیں گے۔ ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کرے۔ نہ تو ہم اس سے پھریں نہ تو۔ دونوں کی پوزیشن برابر ہوگی؛ موسیٰ نے کہا۔  
”جشن کا دن تمہارے لئے مقرر ہوا۔ دن چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں“

چنانچہ معاملہ طے کر کے، فرعون ان سے الگ ہوا اور اب اپنی تدابیر کی تکمیل کی فکر کرنے لگا۔

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدًا ثُمَّ أَتَىٰ ۝ (۶۰/۲۰)

پھر فرعون نے اُن سے رُخ پھیرا اپنی تمام تدابیر کو مجتمع کیا، پھر وقت مقررہ پر مقابلے کے لئے نمودار ہوا۔

جب مقابلہ کا دن آیا تو حضرت موسیٰ نے مجمع کو (یا ان کے مذہبی پیشواؤں کو) مخاطب کر کے کہا۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَيَّ اِلٰهًا كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ

بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مِّنْ اِفْتَرٰی ۝ (۲۰/۶۱)

موسیٰ نے (ان سے) کہا کہ افسوس تم پر (تم کیا کر رہے ہو) دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔ جس کسی نے جھوٹی بات بنائی وہ ضرور ناسرور ہوگا۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

فَتَنَّا زَعَمُوْا اَمْ رَہُمْ بَیْنَهُمْ اَسْرَدُوْا ۝ الْجَوٰی ۝ (۲۰/۶۲)

یہ سن کر وہ آپس میں رد و کد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

اربابِ حل و عقد نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰ تو مقابلے سے پہلے ہی میدان مارے جا رہے ہیں تو جمع (یا مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ دونوں بھائی کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہیں۔ گوش ہوش سے سنو۔

قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰیۤنِ لَیْسَ عَزِیْزٌ یُّرِیْدُنِ اَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ

لَیْسَ عَزِیْزٌ هٰمًا وَّ یَذْهَبًا یَطْرُقُ یَقْتِکُمْ ۝ الْمُثَلٰی ۝ فَاجْمِعُوْا کَیْدَکُمْ لَکُمْ اَنْتُمْ

صَفًا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مِّنْ اَسْتَعٰلٰی ۝ (۲۰/۶۳ - ۶۴)

پھر (دوبارہ) بولے کہ یہ دونوں بھائی باطل مذہب کے پیشوا ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی فریب کاریوں

کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف و عظمت کے مالک ہو جائیں

پس اپنے سارے داؤ جمع کرو اور پرا باندھ کر ڈٹ جاؤ۔ جو آج بازی لے گیا، وہی کامیاب ہوگا۔

دیکھئے! کس طرح ان کے جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے تاکہ حضرت موسیٰ کی موعظت نے جو اثر پیدا کیا تھا

اسے زائل کر دیا جائے اور انہیں ہر شخص اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کا دشمن خیال کرنے لگ جائے۔ "یہ

نہ صرف تمہارا ملک ہی چھیننے کی فکر میں ہیں بلکہ اس بلند و بالا تہذیب و تمدن کے مٹا ڈالنے کی بھی تدبیریں

سوچ رہے ہیں جس کے تم وارث ہو۔ آنکھیں کھولو! کس سوچ میں ہو!! دیکھو کہ یہ دونوں بھائی کس انقلاب

کی ٹھانے بیٹھے ہیں!!"

سورہ شعراء میں ہے۔

فَجُمِعَ السَّعٰرَةُ لِیُنْقِذَ یَوْمَ مَّغْلُوْبٍ ۝ (۳۶/۲۸)

سو جادوگر وعدہ کے مطابق، مقررہ دن پر جمع ہو گئے۔

جادوگروں کے علاوہ عوام کو بھی دعوت شمولیت دی گئی تھی۔

وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُمْ مُجْتَمِعُونَ ۚ لَعَلَّآ نَتَّبِعُ السَّعَوَةَ  
إِنْ كَانُوا هُمْ الْغَالِبِينَ ۝ (۳۹-۲۶)

اور لوگوں سے کہا گیا کہ کیا تم لوگ جمع (نہ) ہو گے۔ اگر ہمارے مذہب ہی پیشوا غالب آگئے تو ہم انکا جلوس نکالیں گے (اور یوں دھوم سے ان کی عزت افزائی کی جائے گی)۔

اس کے بعد ان کے مذہب ہی پیشواؤں کی اس درخواست کا ذکر ہے جسے ہم سورہ اعراف کی متذکرہ صدر آبات میں دیکھ آئے ہیں۔ (دیکھئے (۳۱-۳۲)؛ (۴/۱۱۴)۔

اب مقابلہ شروع ہوا۔

**مقابلہ** | قَالَ اَلْقُوا ۚ فَلَمَّا اَلْقَوْا سَحَرُوا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ  
وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَزِيزٍ ۝ (۴/۱۱۶)

موسے نے ان سے کہا کہ ابتدا تم ہی کرو۔ سو جب انہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا، تو ان کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس طرح انہوں نے بڑے مکروہ فریب کا جال بچھا دیا۔

(تشریح ان امور کی اخیر میں ملے گی) اس کے بعد۔

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى مُوسٰى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ۚ  
(۴/۱۱۷)

اور (اُس وقت) ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم اپنی تنذیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرو۔ جب انہوں نے انہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریب باطل ملیا میٹ ہو کر رہ گیا۔

”عصائے موسیٰ“ باطل کی نظر فریب ”رستیوں“ کو نگل گیا اور اس طرح

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ فَغُلِبُوا هُنَالِكَ وَ  
انْقَلَبُوا صَٰغِرِينَ ۚ (۴/۱۱۸-۱۱۹)

اس طرح سچائی ثابت ہوئی اور ان کا کیا کرا یا سب غارت ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرعون اور اس کے درباریوں کو

اس مقابلہ میں مغلوب ہونا پڑا اور (فتح مند ہونے کی جگہ) اُلٹے ذلیل ہوئے۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی اس مناسطہ کا ذکر (قریب قریب) انہی الفاظ میں آیا ہے، دیکھئے ۷۹-۸۲/۱۰؛ ۷۵-۲۰/۶۹؛ ۲۳-۲۶/۴۵؛ آیت (۲۰/۶۹) میں ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا انداز بیان اس قدر سحر آفریں تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے دلائل (محض لغاطی کے زور پر) اثر انداز نہ ہو جائیں اور اس طرح وہ کامیاب ہو جائیں۔ لیکن خدا نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے دلائل ان اثرات کو زائل کر دیں گے۔

**ساحرین کی نگاہیں** | تماشاویوں کی نگاہوں نے تو فقط اتنا ہی دیکھا کہ ”ساحرین کے چھوٹے چھوٹے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کا اڑدھانگل گیا، لیکن ساحرین کی آنکھوں نے اس سے کچھ زیادہ دیکھا۔ انہوں نے جب اپنے مذہب کا موازنہ حضرت موسیٰؑ کے دلائل سے کیا تو انہوں نے علی وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ موسیٰؑ کا پیش کردہ دین حق پر مبنی ہے جب انہوں نے اس طرح حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیا تو حق و باطل الگ الگ نکھر کر سامنے آ گئے۔ تجلیاتِ طور کی ایک ایسی کبلی کو ندی کہ جہالت و ضلالت کے ظلمت انیگز پر پڑے یک لخت اٹھ گئے۔ ان کی نگہ بصیرت نے خالق ارض و سموات کی نشانیوں کو بلا حجاب و نقاب دیکھ لیا اور وہاں انداز میں سجدہ میں بٹھک گئے۔

وَأَنقَبُوا لِّلشَّجَرَةِ الْمُبْعِدِينَ ۝ (۷۹/۱۲۰)

اور پھر ایسا ہوا کہ (موسیٰؑ کی سچائی دیکھ کر) باطل پیشوا بے اختیار

سجدے میں گر پڑے۔

یہ وہ سجدہ تھا جس سے زمین و آسمان رقص میں آجائے، جس سے باطل کے ”ہر خدا“ کی اصلیت آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جائے، وہ سجدہ جس کے متعلق

**اور سجدہ**

اقبالؑ نے کہا ہے کہ

مسلمانم و آزاد از مکانیم      بروں از خلقہ نہ آسمانیم  
بہائے ہر خداوندے بدانیم      بہا آموختند آں سجدہ کزدے

سجدہ سے اُٹھے اور کہا۔

قَالُوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ رَبِّ مُوسٰی وَ هٰرُونَ ۝

(۱۲۱-۱۲۲/۴) ذ (۲۰/۶۰) ذ (۲۶/۲۸-۲۷)

انہوں نے کہا کہ ”ہم اس پر ایمان لائے جو مجملہ کائنات کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔  
کیا درخشندہ تقاطع ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں قربان  
کردی جائیں۔ وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا  
اُٹھے۔ یہی تھا وہ سجدہ جس کے لئے مردانِ حق آگاہ کی آہ سحر گاہی ان التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ بابِ  
رحمت پر دستک دیتی ہے کہ

خواہم این جہاں و آں جہاں را      مرا این بسکہ دامنِ منرِ جاں را  
سجدے دہ کہ از سوزِ سورش      بوجد آدم زمین و آسماں را  
یہی وہ سجدہ تھا جس نے انہیں وہ جرأت عطا کر دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ کے سامنے سے مفران  
آگے بڑھ جائیں۔ ہم غلامانہ ذہنیت کے خوگر اس سجدے کی لذت کو کیا جانیں ؟  
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے  
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

**فرعون کی شعلہ باری** | ہم ساحرین کے تیتر انگیز جذبہ ایمان کے کیف بار و نشاط اور  
منظر میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون  
کی قلبی کیفیت کا بھی جائزہ لے لیں کہ اس پر اس غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدانِ مبارزت  
میں ساحرین کے سحر کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب دیکھا کہ خود ساحرین ”مونسے کے خدا“  
پر ایمان لے آئے ہیں (یعنی بزعیم فرعون دشمن سے جاملے ہیں) تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے دل و دماغ  
کی حالت کیا ہو گئی ہوگی! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت! شکست اور ایسی رسوا کن شکست!! وہ ایک  
پھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بردہاں سیلاب کی طرح اُٹھا کہ ہیں! میری موجودگی میں ایسی کھلی  
ہوئی بغاوت!

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذِنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكْرُكُمْ وَاَنْتُمْ فِي الْمَدِيْنَةِ لَخٰفِرُوْنَ مِنْهَا اَهْلَہَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۳۳)

فرعون نے (غضبناک ہو کر) کہا کہ مجھ سے اجازت لئے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور ایک خفیہ سازش ہے جو تم نے (دل جُل کر) دارالسلطنت میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو۔ اچھا، تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

کسی مسلک کو صحیح جان کر اس پر ایمان لے آنا انسان کے اپنے دل کے فیصلہ پر موقوف ہونا چاہیئے۔ لیکن استبداد بھلا اس کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ کی عقل و بصیرت اور قلب و دماغ کا فیصلہ کچھ ہو، کرنا وہ ہوگا جس کا حکم دیا جائے گا۔ اسی لئے فرعون نے کہا کہ "میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے؟" پھر جیسا کہ مستبد حکومتوں کا قاعدہ ہے، ساحرین کے اس عمل کو خود ایک سازش قرار دے دیتا تاکہ انہیں بغاوت کے الزام میں مآخوذ کر لیا جائے۔ ساحرین کا ایمان علی وجہ البصیرت تھا۔ لیکن چونکہ اس سے قہر حکومت میں ترزل واقع ہوتا تھا اس لئے اسے سازش قرار دے دیا گیا، جس کی سزا فرعون کی "عدالت" میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ

لَوْ قَطَعْنَا اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَوُصَلَبْتُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۳۴)

میں ضرور ایسا کروں گا کہ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں، پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں۔

سورہ طہ میں فرعون کے قول کا دوسرا حصہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ساحرین کے اس فعل سے عوام پر بے حد بُرا اثر پڑا ہے تو معاملہ کو مشتبہ بنانے کے لئے یہ مشہور کر دیا کہ یہ ساحر (درحقیقت) حضرت موسیٰؑ کے شاگرد ہیں اور اس لئے ان کی آپس میں ملی جھگڑت ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذِنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَيْنُكُمْ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَا قَطْعَ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ۚ وَلَا وُصْلَ بَتَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۚ وَتَعْلَمُوْنَ اَيْنَا اَسَدُ عَذَابًا وَّاَوْ اَسْفٰی ۝ (۲۰/۷۱ نیز ۲۶/۴۹)

فرعون نے کہا کہ "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا بڑا بے جس سے

تم نے سحر کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اچھا، دیکھو، میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیر پا ہے۔

**ساحرین کا ایمان** | جو رداستبداد کی ان قہر مانی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا! اب ساحرین کے کوہِ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا تابناک منظر بھی دیکھئے۔ اب ساحرین بھی وہ نہیں تھے جن کا اندازہ فرعون نے کیا تھا۔ وہ اب خدا نے جی و قیوم پر علی و جبر البصیرت ایمان لا چکے تھے اور یہ وہ ایمان ہے جسے پھر دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

جب اس انگارہ خالی میں ہوتا ہے یقین پیدا

تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الایں پیدا

دنیا میں ساری قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے، اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں۔ شکست و کامرانی کا بنیادی مدار قاطبۂ ساز و سامان پر نہیں، یقین و عدم یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہو گا وہی دنیا میں کامیاب و شاد کام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین، ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے اور ایمان ہو، اَللّٰهُ وَاحِدٌ اَلْفَرَّادُ پر، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہٹا سکتی۔ لہذا، فرعون کی دھکی، ایمان و ایقان کے ان آہنی پیکروں پر کیا اثر کر سکتی تھی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے

جسے حق نے کیا ہونیستان کے واسطے پیدا

فرعون نے اپنے انتہائی غضب و جلال میں کہا کہ ”تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا، تمہاری تنکا بوٹی کر دوں گا۔ ڈرو میرے غضب سے! خوف کھاؤ میرے انتقام سے!“ لیکن اس سے ان استقلال و استقامت کے مجتہدوں پر کیا اثر ہوا؟ انہوں نے ایک نحیف سی ہنسی سے فرعون کی طرف نکتہ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کر دیں؟

قَالُوا لَنْ نَّؤْمِنَ بِكَ عَلٰی مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ ۖ الَّذِي فَطَرَنَا... (۲۳/۲۴)

انہوں نے کہا کہ جس خدا نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ دلائل و بصیرت کی بنا پر ہمارے سامنے

آگیا، اس پر ہم (اب) تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔

”فرعون“! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تحویف و ترہیب کی شعلہ باریاں، ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ فَاَقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ ط (۲۰/۷۲) جو کچھ فیصلہ کرنا چاہتا ہے، کر ڈال، جو تیرے جی میں آئے، کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ اسی طبعی زندگی تک ہی گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ اِنَّمَا تَقْضِي هُنَا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ط (۲۰/۷۳)۔ تو صرف اسی دنیا کی زندگی تک ہی حکم دے سکتا ہے، ہم اپنے اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اب اس ایمان سے ہمیں کوئی پھیر نہیں سکتا۔“

اِنَّا اَمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَا اَلَسَّ هَتٰنَا عَلَیْهِ مِنَ السَّلٰطِطِ  
وَ اللّٰهُ خَدِیْطٌ وَ اَبْقٰی ۵ (۲۰/۷۴)

ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے کہ وہ ہماری سابقہ لغزشوں کے اثرات سے ہمیں معفو فرما دے۔  
بالخصوص سحر آفرینی کی اس خطا کو شی سے تو نے مجبور کیا تھا (ہمارے لئے) اللہ ہی بہتر ہے اور  
وہی باقی رہنے والا ہے۔

سرا سرحدین، فرعون کو یہ جواب دے رہے تھے اور آسمان کے فرشتے محو تحیر، بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے تھے کہ اے الہ العالمین! تیرا ارشاد بجا تھا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۰/۷۳) اسی آدم کی ذریت میں جسے ابلیس نے پہکانے اور پھسلانے کا یوں دعویٰ کیا تھا، ایمان اور ایقان کے ایسے فولادی پیکر بھی موجود ہیں، جن کی کیفیت یہ ہے کہ

چو مرگ آید بتسم برب ادست

سورۃ اعراف کی آیات (۱۲۵ — ۱۲۸) اور سورۃ شعراء کی آیات (۵۰ — ۵۱) میں بھی اسی واقعہ کو دہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں نے فرعون کی دھمکیوں کا جواب کس قدر حقارت کی ہنسی سے دیا۔  
ایک ایمان یہ تھا اور ایک ایمان اس انداز کا کہ

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ كَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرٌ اَطْمَاقًا  
بِهِ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ اِنْ اَقْلَبَ عَلٰی وَجْهِهِ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا  
وَ الْآٰخِرَةَ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۵ (۲۲/۱۱)



اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو لوگ اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) کو اختیار کرتے ہیں مگر دل کے جماد سے نہیں۔ اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچ گیا، تو مطمئن ہو گئے۔ اگر کوئی آزمائش آگئی، تو اُلٹے پاؤں اپنی (بے یقینی) کی حالت کی طرف لوٹ گئے۔ وہ دنیا میں بھی نامراد ہوئے اور آخرت میں بھی۔ اور یہی ہے جو آشکارا نامرادی ہے!

علیٰ وجہ البصیرت ایمان اور "پیدائشی مسلمان" کے ایمان میں یہی فرق ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ما بیدار سر بجیب، اُد سربکف

|                               |                               |
|-------------------------------|-------------------------------|
| دارد اندر سینہ تکبیر اُمم     | در جبین اوست تقدیر اُمم       |
| قبلہ ماگہ کلیا، گاہ دیر       | او نخواہد رزق خویش از دست غیر |
| صبح و شام ما بفکر سازد برگ    | آخرا ما چیست؟ تلخہائے مرگ     |
| در جہان بے ثبات اور اثبات     | مرگ اُور از مقامات حیات       |
| اہل دل از صحبت ما مضمل        | رگل ز فیض صحبتش دارائے دل     |
| کار ما وابستہ تخمین و ظن      | اُو ہمہ کردار و کم گوید سخن   |
| ماگدایاں کو چہ گرد و فاقہ مست | فقر اُو از لآلہ تیغی بدست     |
| ما پر کاہے اسیر گرد و باد     | ضریش از کوہ گراں جوئے کشاد    |
| محرم اُوشو، ز ما بے گانہ شو   |                               |
| خسانہ ویراں باش صاحب خانہ شو  |                               |

—————

ایسے کھلے ہوئے فیصلے کے بعد، ہونا یہ چاہیے تھا کہ تمام قوم حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آتی لیکن اسلاف پرستی کی اندھی عقیدت، حکومت کا نشہ، محکوم قوم کے فرد کی طرف سے دعوت، پھر فرعون کا خوف، یہ ایسے موانع تھے جو حق و صداقت کی قبولیت میں حائل تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کے بعد بھی فرعون کے حکم ہی کا اتباع کیا۔ (۹۶-۱۱/۹۸)

لیکن حضرت موسیٰؑ کے سامنے قوم فرعون کی تنذیر ہی نہ تھی،

بنی اسرائیل کی تنظیم و تربیت

بلکہ اس سے بڑا مقصد، خود بنی اسرائیل کی تنظیم و تعلیم تھی۔

قوم فرعون کے ساتھ جو معاملہ درپیش تھا وہ تو اس عظیم سکیم کا تخریبی پہلو تھا جس کے لئے حضرت موسیٰ مامور ہوئے تھے۔ تعمیری پہلو خود بنی اسرائیل کی تربیت تھی اور حضرت موسیٰ اس سے غافل نہیں تھے۔ حکومت خداوندی کے قیام کے لئے صرف استبدادی قوتوں کی ہلاکت و بربادی ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان قلوب و اذان کی تعمیر و تطہیر بھی ضروری ہے جن کے ہاتھوں اس کہنہ عمارت کی شکست و ریخت کے بعد آسمانی حکومت کا قصر مشید تعمیر ہونا ہے۔ اگر ساری زندگی، طاغوتی قوتوں کی تخریب میں ہی صرف کر دی جائے تو یہ فقط حصہ لاِ اللہ ہوگا، اِلا اللہ کا پہلو سامنے نہ آئے گا۔ اس کے لئے ساتھ ہی ساتھ قوم کی تعلیم و تربیت بھی نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل صدیوں سے غلامی کے شکنجے میں جکڑے چلے آ رہے تھے۔ اس لئے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی، عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ نوگر ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلی احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ کے سامنے،

### غلاموں کی ذہنیت

یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ دشوار گزار اور صبر آزما تھا۔ (تفصیل ان امور کی خروج مصر کے بعد کی داستان میں ملے گی) اس لئے وہ انہیں بار بار تاکید کرتے تھے کہ ذرا عزم و استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ۔ انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُؤْتِيْهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادٍ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۴/۱۲۸)

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا ”خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں) جھک نہ رہو۔ بلاشبہ زمین (کی پادشاہت صرف) خدا ہی کے لئے ہے۔ یہ اس قوم کو ملتی ہے جو اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق اسے لینا چاہے (کشمکش خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو) مال کا کامیابی انہی کی ہوتی ہے جو اس کے قوانین کی نگہداشت کریں۔

لیکن ان پیکر ان آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑانا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور شکوہ سنجہ ہوتے کہ ”تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب آرام سے گزرے گی۔ لیکن اب تو مشکلات اور بھی بڑھ گئیں۔ تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے!“ حضرت موسیٰ ارشاد فرماتے کہ کیوں گھبراتے ہو، ذرا حوصلہ سے کام لو، عقوڑی سی استقامت دکھاؤ، پھر دیکھو کیسا انقلاب آتا ہے؟ (۱۷۹/۷)۔ لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر غلامی کے جراثیم پیوست ہو چکے ہوں، جن کے نہ سینے میں دل ہو، نہ دل میں زندہ آرزوئیں ہوں تو

### نوجوانوں کی طرف سے لبیک

غلامی میں پختہ تر ہو چکے ہوں، ان پر بھلا ان حیات اور خطبات و پیغامات کا کیا اثر ہو؟ قوم کے بڑے بوڑھے اپنے دماغوں میں انقلابی تصورِ شاذ ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی تعمیر اسی آب و گل سے ہوتی ہے جو غلامی کے عناصر سے مرکب ہوتے ہیں، البتہ اگر ان کے جوہرِ انسانیت بھی بالکل کچلے نہ جا چکے ہوں تو نوجوانوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ انہیں زندگی بخش قالب میں ڈھال لیا جائے۔ قوموں کی زندگی میں انقلاب ہمیشہ نوجوانوں کی قوتِ بازو کا رہن منت ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ کے پیغامِ حیات اور پر لبیک انہی نوجوانوں کی طرف سے ہوا۔ بڑے بوڑھے سب فرعون کے خوف سے لرزاں و ترساں رہے۔

فَمَا أَمَّنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّتُهُ ۖ مِمَّنْ قَوْمُہٗ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّمَّنْ فِرْعَوْنُ  
وَمَلَأَہُمْ أَنْ يَفْتِنَہُمْ ۖ وَإِنْ فِرْعَوْنُ لَعَالٍ فِی الْاُفُصِّ ۚ  
وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ۝ (۱۷۸/۱۰)

اور موسیٰ نے پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ جو اس کی قوم کے نوجوانوں کا تھا اور ان کا ایمان نہ لانا فرعون اور اس کے سرداروں کے خوف کی وجہ سے تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ وہ انہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دیں اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش (بادشاہ) تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ (ظلم و استبداد میں) بالکل چھوٹ تھا۔

یہی وہ ملکہ نوجوانانِ آہن گداز تھا جو حضرت موسیٰ کے پیغامِ انقلاب انگیزہ کا مخاطب تھا۔  
وَقَالَ مُوسَىٰ يُقْوِمُ إِنْ كُنْتُمْ اٰمِنْتُمْ بِاٰلٰہِہٖ فَعَلِیْہِ تَوَكَّلُوْا

إِنْ كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ ۝ (۱۰/۸۳)

اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو، تو یا تم مجھے اس پر بھروسہ کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو۔

اور یہی تھا وہ گروہ جس کی طرف سے اس خطاب کا جواب ان الفاظ میں آیا تھا۔

فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً ۖ لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۖ  
وَجَعَلْنَا بَرِحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (۱۰/۸۴-۸۵)

انہوں نے کہا ”ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا (ہم دعا کرتے ہیں کہ) پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لئے آزمائشوں کا موجب نہ بنائے (کہ اس کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں کمزوری دکھائیں) اور اپنی رحمت سے ایسا کریں کہ ہم اس کافر گروہ سے نجات پا جائیں۔

**تدریجی تبدیلیاں** (تفصیل ان امور کی چند صفحات آگے چل کر ملے گی) یہ بھی یاد رہے کہ منزلِ حکومت سے عملِ آزادی تک پہنچنے میں راستہ میں سینکڑوں مراحل

سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی جست میں پورے کا پورا مرحلہ انقلاب طے ہو جائے۔ اس لئے کسی انقلابی تحریک کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ پہلے ہی قدم میں آخری منزل تک جا پہنچے گی، غلط ہے۔ تبدیلی ہمیشہ آہستہ آہستہ رونما ہوا کرتی ہے (اگرچہ حضراتِ انبیائے کرامؑ کے باب میں یہ تدریج بھی ایسی برق رفتار ہوتی ہے کہ عام حالات میں جو تبدیلی برسوں میں پیدا ہوا، وہ ان کے زیر تربیت، دنوں میں رونما ہو جاتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ، قلب و نگاہ میں تبدیلی ہوتی ہے تدریج، چنانچہ ارشاد ہے کہ

وَ اذْهَبْنَا اِلٰى مُوسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوِّاْ لِّقَوْمِكُمْ بِمَضْرُبٍ مُّبِيْنٍ  
وَ اجْعَلُوْا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً ۚ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَ بَشِّرِ  
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۸۷)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون پر وحی کی کہ سروسنت اپنی قوم کی سکونت مصر ہی میں رہنے دیں اور ان کے گھروں ہی کو تربیت گاہ بنالیں اور اس طرح نظامِ صلوٰۃ کے قیام کی ابتداء یہیں سے کر دیں اور جو ایمان لائے ہیں انہیں کامیابی کی بشارت دیں۔

ظاہر ہے کہ استخلاف فی الارض کی آخری منزل تو یہ ہو گی کہ ”ساری زمین مسجد“ ہو جائے۔ لیکن اس کی

ابتدا یہ ہے کہ اپنے گھروں ہی کو تربیتی مرکز بنالیا جائے اور وہیں اقامتِ صلوٰۃ کی بنیاد رکھ دی جائے۔ عیسیٰ اس آنے والے انقلاب کے لئے اپنے گھروں سے تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ پہلے اپنے اپنے گھر کی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے مطابق بنایا جائے۔ پھر رفتہ رفتہ اس دائرہ کو وسیع کرتے چلے جائیں تا آنکہ یہ سارے معاشرہ کو محیط ہو جائے۔ اس طرح تدریجاً تحریکِ انقلاب، اپنے نقطۂ آخر میں تک پہنچ جائیگی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ تدریجی تبدیلیوں سے یہ مفہوم نہیں کہ آپ ایک مقام پر آکر رک گئے اور وہیں قناعت سے بیٹھ گئے۔ رُک جانا تو موت کے مرادف ہے۔ ندی اس وقت تک ندی ہے جب تک رواں ہے۔ جو نہی کسی مقام پر ٹھہر گئی، جو ہڑ بن گئی، اگر نصبِ العین نگاہوں کے سامنے ہو اور قدم اسی منزل کی طرف بڑھتے جائیں تو ابتداءً اپنے گھروں کو قبلہ بنالینا بھی سلسلہٴ انقلاب کی ایک کڑی ہے۔ دلوں اور نگاہوں میں انقلاب درحقیقت اس وقت سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے جب سطحِ بین نگاہیں منظرِ عام پر انقلاب کے آثار محسوس کرتی ہیں۔

**انقلاب اور صلوٰۃ** پھر غور کیجئے کہ اس انقلابِ عظیم کے لئے سب سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ کا ارشاد ہوا ہے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔ (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) لیکن حقیقت یہی ہے کہ زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کرنے کی بنیاد، اقامتِ صلوٰۃ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود "نماز پڑھنا" ہی نہیں، بلکہ صلوٰۃ کی INSTITUTION کو قائم کرنا ہے جس کے اندر ایمان باللہ، وحدتِ مقصد، للہیت، مرکزیت، وحدتِ ملت، اجتماعیت، قیامِ امارت، اطاعتِ امیر، یک نگہی و ہم رنگی، غرض کہ فکر و نظر کی تطہیر اور ایمان و عمل کی وحدت کے سب سامان موجود ہوتے ہیں۔ صلوٰۃ دراصل مظاہرہ ہے اس عظیم حقیقت کا کہ ہمارے قلوب و جوہر کی ہر حرکتِ قانونِ خداوندی کے تابع رہے گی اور یوں اس تعبد و تذلل سے دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سر بلندیاں حاصل ہو جائیں گی۔ اسی لئے حکومتِ الہیہ کے قیام و بقا کے لئے اقامتِ صلوٰۃ مرکزی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ وہ صلوٰۃ جس کے قائم کرنے والوں کے متعلقہ کہا گیا ہے کہ ہے

دو گیتی را صلاۃ از قرأتِ اوست

مسلمان لایموت از رکعتِ اوست

ندانہ کشتہ این عصر بے سوز

قیامت ہاکہ در قد قامتِ اوست

**حکومت کے مشورے** | لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی اس قسم کی تنظیم و تربیت، فرعون اور اس کے اراکین سلطنت کی آنکھوں میں کس طرح کھٹک رہی ہوگی!

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَنْذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرُكَ إِلَٰهَتَكَ ۖ (۷۴/۱۲۷)۔

اور قوم فرعون کے اراکین نے کہا کہ کیا تو مولے اور اس کی قوم کو اسی طرح چھوڑ رکھے گا کہ وہ (یوں) ملک میں فساد برپا کرتے رہیں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں!

دیکھئے! اس ”مشورہ“ کو نفیاتی طور پر کس درجہ مؤثر بنایا گیا ہے۔ مذہبی عقیدت اور ذاتی وقار، قلبِ انسانی کے نازک ترین گوشے ہیں۔ اس مشورہ میں انہوں نے ان دونوں گوشوں کی چھکی لی ہے اور یوں اس خطرہ کو سخت بھیانک بنا کر دکھایا گیا ہے۔ فرعون نے کہا کہ بنی اسرائیل سے اس قدر ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں یہ تو ہماری محکوم قوم ہے ہم قوت کے آہنی پنجوں سے ان کا گلا گھونٹ دیں گے۔

قَالَ سَنَقْتِلُ آبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ وَ إِنَّا فَتَقَرُّهُمْ قَاهِرُونَ ۝ (۷۴/۱۲۷)۔

اُس نے کہا کہ ہم ان کے ابناء کو ذبح کر دیں گے اور ان کی نساء کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان کے اوپر غالب ہیں۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت قتلِ ابناء کا جو قانون نافذ تھا وہ یا تو بعد میں معطل کر دیا گیا تھا یا اس کی تنفیذ میں کچھ زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ فرعون نے کہا کہ زیادہ خطرہ بنی اسرائیل کی کثرت سے ہے۔ سو اس کا علاج ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے، یعنی وہی قتلِ ابناء والا قانون۔ بڑے بوڑھوں سے تو کوئی خطرہ نہیں، خطرہ ہوتا ہے ابھرنے والی نسلوں سے۔ سوانہ کا یوں خاتمہ کرایا جاسکتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۚ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۚ وَ مَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝ (۲۵/۲۵)۔

سو جب (مولے) ہماری طرف سے حق لے کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کے

بیٹوں کو قتل کر دو جو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دو (انہوں نے یہ تدبیر کی لیکن یاد رکھو کہ نہ ماننے والوں کی تدبیر بے نتیجہ رہنے والی تھی۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ”قبل ابناہ“ اور ”استحیاء نساء“ سے مفہوم یہ بھی ہے کہ قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار کیا جائے جو اپنے اندر جو ہر مردانگی رکھتے ہوں اور انہیں آگے بڑھایا جائے جو عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھے رہنے والے ہوں۔ ان معافی کی رو سے آیات بالا کا دوسرا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت، فرعون کی اس تدبیر سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے اس پر زور دیا کہ اگرچہ قتل ابناہ بھی ضروری ہے لیکن اس کا نتیجہ تو بہت دیر میں جا کر برآمد ہوگا۔ آج جو عظیم الشان خطرہ سامنے ہے، وہ تو (حضرت) موسیٰ کی وجہ سے ہے۔ اس خطرہ کا بھی تو کوئی علاج کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے فرعون کو آمادہ کر لیا کہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۚ إِنِّي أَخَافُ  
أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ۖ (۴۰/۲۶)

فرعون نے کہا کہ بہت اچھا، یونہی (ہی) مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔ (اب) اسے چاہیے کہ اپنے رب کو بلائے (کہ وہ اسے پکالے!) میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں تمہارے آئین و نظام کو نہ بدل دے اور یا یہ کہ ملک میں فساد برپا کر دے۔

دیکھئے! قوم فرعون کے نزدیک انسانیت کی اصلاح کا نام کس طرح ”فساد“ رکھا جاتا ہے؟ ان کے نزدیک اصلاح اور امن پسندی تو اسی کا نام ہو سکتا تھا کہ یہ قوم مغلوب ان کے نظام و آئین کو قبول کر کے سب کچھ خاموشی سے برداشت کئے جاتی۔ اس دھمکی کے جواب میں حضرت موسیٰ نے فرمایا:

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ  
لَوْ كُنْتُمْ مِنْ بَنِي الْحِسَابِ ۖ (۴۰/۲۷)

میں ہر اس متکبر (کے بیچے استبداد) سے جو خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے لئے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی صداقت کا اثر عام طور پر ہو چکا تھا لیکن قوم فرعون اپنے مصالح کی بنا پر اس کا زبان سے اعتراف نہیں کرتی تھی۔ خود اراکینِ سلطنت میں ایسے لوگ موجود تھے جو دل

سے حضرت موسیٰ کے حق بجانب ہونے کے قائل تھے لیکن اس کیفیت قلبی کو چھپائے ہوئے تھے۔ جب حضرت موسیٰ کا معاملہ دربار میں پیش ہوا اور فرعون نے اس پر اظہارِ رضامندی کر دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہی میں سے ایک مردِ مومن سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھا اور اس تجویز کے خلاف ایسی معرکہ آرا تقریر کی جسے قرآنِ کریم نے اپنے اوراق میں محفوظ کر کے اسے حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے۔ تقریر کیا ہے؟ حرارتِ ایمانی کا زندہ مظاہرہ اور حقائق و معارف کا اُبھرتا ہوا سرچشمہ ہے۔ یہ تقریر، سورۃ المؤمن کے چوتھے اور پانچویں رکوع میں مسلسل دی گئی ہے۔ وہاں دیکھ لیں، یعنی (۲۸ — ۲۵/۴۰) میں۔

ہوں ہوں حضرت موسیٰ کی دعوت و تبلیغ کا حلقہ اثر و نفوذ وسیع ہوتا جاتا تھا، فرعون کی ضد اور سرکشی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی انقلاب آفریں دعوت حق و صداقت اتنا گہرا اثر پیدا کر چکی تھی کہ باوجود فیصلہ کر لینے کے، فہرعی حکومت آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکی۔ بایں ہمہ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ انہوں نے انقلاب کی اس بڑھتی ہوئی رو کو روکنے کے لئے کون کون سے استبدادی حربے استعمال نہ کئے ہوں گے۔

اس مقام پر اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کش مکش، حضرت موسیٰ اور فرعون ابتدائی تباہیاں کی کسی ذاتی خصامت کا نتیجہ نہیں تھی۔ نہ ہی سوال حضرت موسیٰ کی اپنی قوم اور غیر قوم کی آویزش کا تھا۔ باطل نظام انسانیت کے لئے تباہ کن ہوتا ہے اور آسمانی انقلاب کے داعیان کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو اس (غلط) نظام کی تباہ کاریوں سے بچائیں۔ اس سلسلہ میں ان کی پہلی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ خود اس نظام کی جگہ حق پر مبنی نظام قائم ہو جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو جس قدر انسانوں کو اس نظام کے چنگل سے چھڑایا جاسکے، چھڑالیا جائے۔

باطل نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ عدل و انصاف کی جگہ ظلم و استبداد، قانون کی حکمرانی کی جگہ دھاندلی، امن و سکون کی جگہ خوف و ہراس، احترامِ آدمیت کے بجائے نسلی اور قومی تعصبات لے لیتے ہیں۔ معاشرہ کا نظم و نسق بگڑ جاتا ہے۔ 'corruption' عام ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں، جن کا تدریجی سے نہایت آسانی سے



ازالہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ حفظ ماتقدم کے ذریعے انہیں پیدا ہونے سے روکا جاسکتا تھا، وہ عام ہوتی چلی جاتی ہیں اور سخت نقصانات کا موجب بن جاتی ہیں۔ قرآن کریم، انہیں ”عذاب الہی“ کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ یہ قوانین فطرت کی خلاف ورزی اور مستقل اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی خرابیاں فرعونؑ کی معاشہ میں رونما ہونی شروع ہو گئی تھیں اور وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ (حضرت موسیٰؑ کی) ”بددعاؤں“ کا نتیجہ ہے چنانچہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی ایک قسم کی خرابی نمودار ہوتی تو حضرت موسیٰؑ سے درخواستیں اور التجائیں کرنے لگ جاتے کہ ہم اپنی روش سے باز آتے ہیں لیکن اس کے بعد پھر اسی روش کہن پر گامزن ہو جاتے اور دنیا میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ خود اپنے زمانہ کے کوائف و احوال پر غور کیجئے۔ جب ایک غلط نظام کے اثرات و نتائج، عذاب خداوندی کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں تو لوگ ایک ”نظام جدید“ کے لئے پکار اٹھتے ہیں جو صاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف ہوتا ہے کہ ہمارا موجودہ نظام غلط خطوط پر مشتمل ہے لیکن اس آفت سے نجات مل جانے کے بعد ساری عقل و دانش اس کوشش میں صرف کر دی جاتی ہے کہ پہلے نظام کے حلقوں میں جہاں جہاں کچھ ڈھیل اور کمزوری رہ گئی تھی انہیں اچھی طرح سے کس دیا جائے۔ یہی کچھ قوم فرعون نے کیا۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَ نَقْصِ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ۝ ..... فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۳۰ - ۱۳۲/۴)

اور ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی کی تباہی اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا تاکہ وہ متنبہ ہوں۔ تو جب کبھی ایسا ہوتا کہ خوشحالی آتی، تو کہتے، یہ ہمارے حسن تدبیر کی وجہ سے ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آ جاتی، تو کہتے، یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے۔ حالانکہ یہ نحوست ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی جس کے مطابق اچھے اور بُرے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور فرعون کی قوم نے کہا کہ (اے موسیٰؑ) تو اپنا جادو چلانے کے لئے کتنی ہی نشانیاں لائے، مگر ہم ماننے والے نہیں۔

یہ تباہیاں مختلف شکلوں میں نمودار ہوئیں۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الصَّغَادِغَ وَ الدَّمَ

آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ تَفَ فَاسْتَكْبَرُوا وَ كَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ (۱۳۳/۴)

پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیوں کے دل اور فصلوں کو تباہ کرنے والے کیڑے اور مینڈکوں

کی کثرت اور فسادِ خون کی بیماریاں یہ سب اس امر کی علامات تھیں کہ ان کے تمدن کی بنیاد میں خرابی واقع ہو گئی ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ قوانینِ خداوندی کی دعوتِ کشی کرتے رہے۔ وہ وحیقت تھا ہی مجسموں کا گروہ۔

جب مصیبت آتی تو حالت یہ ہو جاتی کہ

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يُمُوسَىٰ اذْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۖ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَكَذَرْنَاكَ مَقَافَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ ۚ (۷۱/۱۳۴)

جب ان پر عذاب کی سختی واقع ہوئی تو کہنے لگے ”اے موسیٰ! تیرے پروردگار نے تجھ سے (نبوت کا) عہد کیا ہے تو اس کی بنا پر ہمارے لئے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں۔“ اور جب ٹل جاتی تو پھر وہیں کے وہیں ہوتے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بِالْغُفْوَةِ إِذَا هُمْ يَنْكُتُونَ ۝ (۱۳۵)

سو جب ہم کچھ وقت کے لئے ان سے اس سختی کو دور کر دیتے جس تک انہوں نے بالآخر اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچ کر رہنا تھا، تو وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے۔

آیات (۱۰۱ — ۱۱۴/۱۰۲ — ۱۱۴/۱۰۳ — ۱۱۴/۱۰۴ — ۱۱۴/۱۰۵) میں بھی یہی حقائق مذکور ہیں۔ بہر حال انہوں نے اللہ کے قانونِ ہمت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ حتیٰ کہ ان کے جرائم کے سب سے بڑے نتیجہ (ہلاکت و بربادی) کے ظہور کا وقت آگیا۔

اب حضرت موسیٰ سے ارشاد ہوا کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کر جائیں۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ۚ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُم مَّصَرًا  
فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكًا وَلَا تُخْشَىٰ ۝ (۲۰/۲۴) نیز (۲۶/۵۲)۔

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح

تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا نہ کسی اور طرح کا خطرہ۔

واضح رہے کہ یہ ہجرت، کش مکش زندگی سے گریز نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ (ہوئے نور میں) حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جلیلہ میں لکھا جا چکا ہے، باطل سے کنارہ کشی کر کے حق کی طرف رخ پھیر لینا ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ میدانِ جہاد میں پینترا بدلنا ہوتا ہے۔ مومن کے لئے ماحول وہی ہے جس میں وہ انسانی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ کی حکومت میں زندگی بسر کر سکے۔ اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جس ماحول میں پیدا ہوا ہے اس کے ذرات کو ترقیب نو دے کر، ایک ایسی فضا پیدا کر دے جو اس مقصد کے لئے سازگار ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ کو اس غلط ماحول سے ماؤس کر کے دیں گا ہو رہے اسے کسی ایسی فضا کی طرف گامزن ہو جانا چاہیئے جو اس کے مقصد کے لئے سازگار ہو یا جسے سازگار بنانے کے امکانات قریب تر ہوں۔ مچھلی کے لئے جہاں آب ہی مطابق فطرت ہے۔ جہاں پانی خشک ہونے لگتا ہے وہ فوراً اس مقام کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کا رخ کر لیتی ہے جہاں پانی کی فراوانی ہو۔ اگر وہ ماحول کی موانست کے جذبہ کے ماتحت قید مقامی اختیار کرے تو یہ اس کے لئے موت کے مرادف ہے بغیر مساعد ماحول سے سازگار فضا کی طرف منتقل ہو جانا یہ ہے ہجرت۔ سورہ ابراہیم میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ  
إِلَى النُّورِ ۚ وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ  
صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ (۱۴/۵)

اور دیکھو یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے احکام کے ساتھ موسیٰ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لے آئے اور انہیں ان تارکخی سرگشتوں کی یاد دلائے جن میں قانونِ خداوندی کو تسلط حاصل ہوا تھا۔ ان سرگشتوں میں ان لوگوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں

لے سمندر کیسے پار کیا گیا تھا اس کی تفصیل آگے چل کر سامنے لائی جائے گی۔

تہ مشیت کے پروگرام کے ماتحت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہجرت کے بعد حالات موافق ہو جائیں تو پھر باطل کی شکست کے لئے اسی مقام کی طرف لوٹا جائے جہاں سے ہجرت کی گئی تھی۔

جو مستقل مزاجی سے کام لیتے ہیں اور خدا کی عطا کردہ قوتوں کی قدر کرتے ہیں۔

**نور و ظلمت کے معنی** | انسانی غلامی کی تاریکیوں سے نکل کر حکومتِ خداوندی کی تابناک تجلیوں کی طرف منتقل ہو جانا یہی ہجرت ہے۔ ظلمات سے نور کی طرف جاوہ پیا ہو جانے کا یہ

مفہوم، دوسرے مقامات سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

.....فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ  
الْوُثْقٰى ۚ لَا الْفَصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۲/۲۵۶)

پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی سرکشی و فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے (فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑ لی۔ یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں (جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہاں اصولی طور پر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ہر غیر خدائی نظامِ زندگی سے منہ موڑ کر صرف نظامِ خداوندی اختیار کرنا یہ ہے حکمِ راہِ عمل، اس سے آگے ہے۔

اللّٰهُ دَرَأَیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیُخْرِجَهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلٰی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ  
كَفَرُوْا اَوْلٰیئُهُمُ الطَّاغُوتُ لِیُخْرِجُوْهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلٰی الظُّلُمٰتِ  
اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲/۲۵۷)

اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ انہیں تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو ان کے مددگار سرکش اور مفسد ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی ہے، ہمیشہ عذاب میں رہنے والا!

یہاں واضح ہے کہ ظلمات سے نور کی طرف انتقال کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ یہ ہے پیغامِ خداوندی کا مقصودِ حقیقی۔ قرآنِ کریم اسی نورانی منزل کی طرف راہ نمائی کرنے کے لئے نازل ہوا ہے۔ قَدْ جَاءَ کُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۵/۱۵) ”تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور یعنی واضح کتاب آچکی ہے“ جس کا مقصد یہ ہے کہ

یَهْدِیْ بِہِ اللّٰهُ مَنۢ اشَآءَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وِیُخْرِجُهُم

مَنْ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيَهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵/۱۴)

خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو (ہو اور نفس کی جگہ) احکام خداوندی کے تابع ہوں سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے (یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب) انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا اور (کامیابی و سعادت کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے!

خود سورۃ ابراہیم (جس میں حضرت موسیٰ کے ظلمات سے نور کی طرف منتقل ہو جانے کا ذکر اوپر آچکا ہے) کی ابتدا اس آیہ جلیلہ سے ہوتی ہے۔

الْزُّكُفَ يَكْتُبُ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ

بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ (۱۴/۱ نیز ۵۴/۹ : ۶۵/۱۱)

الف۔ لام۔ را

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے قانون کے مطابق تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ یہی غالب اور ستودہ خدا کی راہ ہے۔

**دُرود کا مفہوم** | جو مومن اس مقصد عظیم کے حصول کی خاطر جدوجہد کرتے ہیں، اللہ اور ملائکہ کی تائید و نصرت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ اس کا نام دُرود (صلوٰۃ) ہے۔ (ملائکہ کا

مفہوم "ابلیس و آدم" میں دیکھئے)۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلَائِكَتُهُ يُخْرِجُكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ

إِلَى النُّورِ ۚ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحيماً ۝ (۳۳/۴۳)

اللہ وہ ہے جو خود اور اس کے ملائکہ تم پر (دُرود) صلوٰۃ بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف نکال کر لے جائیں اور اللہ مومنین پر رحمت کرنے والا ہے۔

یہی تائید و نصرت جس سے مقصد ظلمات (طاغوتی نظام) سے نور (نظام خداوندی) کی طرف لے جاتا ہے، نبی اکرم کو حاصل تھی جنہوں نے اپنے بے پناہ عمل سے یہ بتایا کہ اس صفحہ ارض پر اللہ کی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اِنَّ اُمَّةً وَّ مَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۝ (۳۳/۵۶)

"یقیناً اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں" اسی تائید و نصرت کی تاکید جماعت مومنین سے کی گئی، یعنی حضور کے اس مقصد جلیلہ کے حصول اور اس کے بعد اس کے استحکام کے لئے عملی جدوجہد

تاکہ انسانیت ہر طاغوتی نظام سے نجات حاصل کر کے، خدائی حکومت کے تابع زندگی بسر کر سکے اور یوں غوثی نظام کی تاریکیوں سے نظام الہی کی درخشندہ روشنی میں آجائے جس سے ہر شے اپنے صحیح مقام پر ٹھیک ٹھیک دکھائی دے۔ اسی کا حکم حضرت موسیٰ کو دیا گیا کہ ”ہمارے بندوں کو زمین مصر کی (انسانی غلامی کی) تاریکیوں سے نکال کر فلسطین کی ارض مقدس کی طرف لے چلو جہاں خدائی نظام کے قیام کے امکانات موجود ہیں۔ اَنْ اَخْرِجَ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّورِ ۝ (۱۳/۵)

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فرعون کی حاکم قوم اس کی کب اجازت دے سکتی تھی کہ وہ محکوم قوم جو صدیوں سے ان کی ہو س کاریوں، کام جوئیوں اور چیرہ دستیوں کی تسکین کا ذریعہ تھی، ان کے ہاتھوں سے نکل جائے؟ ادھر بنی اسرائیل نے یہاں سے نکلنے کی تیاریاں شروع کیں، ادھر قوم فرعون انہیں روکنے کی تدابیر سوچنے لگی۔ سورہ شعراء میں، جہاں حضرت موسیٰ سے فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو لے کر شباشب مصر سے نکل جاؤ، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان کا تعاقب بھی کیا جائے گا۔

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰی مُوسٰی اَنْ اَسْرِ بِعَبَادِنَا اِنَّكُمْ مُّتَّبِعُونَ ۝ (۳۶/۵۲)

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے جا (اور سمجھ رکھو کہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

اس کے لئے فرعون نے پہلے ہی سے احکام نافذ کر رکھے تھے۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حَاشِرِیْنَ ۚ اِنَّ هٰؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ۚ وَاِنَّهُمْ لَمَّا لَغَآظُؤُنَ ۚ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حَذِیْرُوْنَ ۚ

(۲۶/۵۶-۵۳)

پس فرعون نے شہروں میں نقیب دوڑا دیئے (یہ پیغام دے کر) کہ یہ ایک چھوٹی سی اور ذلیل سی جماعت ہے جو ہمیں (اپنی سرکشی سے) برا فروختہ کرنے (کے درپے) ہے اور ہم ایک عطا جماعت ہیں (سو ہمیں ابھی سے ان کی فکر کر چھوڑنی چاہیئے) ہمارے پاس بڑے لشکر ہیں۔

لیکن ادھر فرعون کی طرف سے یہ ڈونڈی پٹ رہی تھی اور ادھر خدا کا قانون مکافات اعلان کر رہا تھا کہ سب سننے والے سُن لیں کہ۔

فَاَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَ عُيُونٍ ۙ وَ كُنُوزٍ ۙ وَ مَقَائِرٍ كَرِيمَةٍ ۙ كَذٰلِكَ  
وَ اَوْثَرْنَاٰهَا بَنِيۤىٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ (۵۷-۲۶/۵۹)

اور ہم نے (قوم فرعون کو) باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور عزت والے مقامات سے نکال دیا  
اور ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا۔

**بنی اسرائیل کا تعاقب** | بنی اسرائیل راتوں رات نکلے لیکن قوم فرعون نے ان کا  
تعاقب کیا۔

فَاتَّبَعُوْهُم مَّا۟شْرِیْقَیْنِ ۙ (۲۶/۶۰)

سو انہوں نے سورج نکلنے ان کا پیچھا کیا۔

ایسے میں بنی اسرائیل کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سمندر ہے، ذرا اندازہ لگائیے اس حالت کا کہ پیچھے فرعون اور  
اس کا لشکرِ جزار، تباہیوں کا ایک ہجوم اپنے ساتھ لئے اُڈے چلا آ رہا ہے، سامنے سمندر ٹھٹھٹھاں مار رہا ہے  
اور ان کے درمیان بنی اسرائیل کی قوم!

قوم گھبرا اٹھی اور کہنے لگی کہ بس اب نجات کی کوئی راہ نہیں۔

فَلَمَّا۟ مَرَّآءَ الْجَمْعِیْنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوسٰی اِنَّا لَمُدْرٰکُوْنَہٗ (۲۶/۶۱)

سو جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم

یقیناً پکڑے گئے۔

لیکن حضرت موسیٰ کے دل پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی تائید  
نصرت پر ان کا محکم ایمان تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے مظاہرے کے مقامات بھی ایسے ہی ہوتے  
ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

وَقَالَ کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ ذَرِیَّتِیۡ سَیِّهٰدِیْنِ ۙ (۲۶/۶۲)

کہا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ ہم گھر جائیں (میرا رب میرے ساتھ ہے سو

وہ (یقیناً) مجھے (سلامتی کی) راہ دکھائے گا۔

غور کیجئے! صبر و استقلال، سکون و طمانیت، اعتماد علی اللہ کے کیسے محکم قلعے ہیں جن کے اندر حضرت موسیٰ  
اپنے آپ کو محفوظ و مصون پاتے ہیں۔ قوموں کی قیادت کے لئے انہی جو ہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ سے ارشاد ہوا کہ اور آگے بڑھ جاؤ۔ وہ بڑھ گئے اور صحیح سلامت دوسرے کنارے تک  
**جنودِ فرعون کی غارتگری** | جا پہنچے۔ فرعون اپنے جنود و عساکر کے ساتھ پیچھے لپکا۔ لیکن  
 عذابِ الہی کے تلاطم نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ سب  
 کے سب غرق ہو گئے۔

فَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوسٰى اَنْ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ فَكَانَ مِثْلَ  
 فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ۚ وَ اَذْكَلْنَا لُحْمَ الْاٰخِرِيْنَ ۚ وَ اَجْبَيْنَا مُوسٰى وَ  
 مَنْ مَعَهٗ اَجْبَعَيْنِ ۚ لَمَّا اَعْرَفْنَا الْاٰخِرِيْنَ ۝ (۲۶/۴۴ - ۴۳)

چنانچہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی جماعت کو لے کر (فلاں سمت سے) سمندر کی طرف  
 چلو اور وہاں سے انہیں اس راستے سے پار لے جاؤ جو خشک ہو چکا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ کہ بنی اسرائیل ایک عظیم قودے کی طرح پانی کے اس طرف ہیں

اور فرعون کا شکر اسی قسم کے قودے کی طرح اس طرف۔

لیکن فرعون کی قوم بنی اسرائیل کی دیکھا دیکھی آگے بڑھ گئی اور وہ سب غرق ہو گئے۔

(اس مقام پر ہم نے مجازی معنی کی رو سے آیات کا مفہوم بیان کر دیا ہے۔ جو صاحبِ ان کے لغوی معنی  
 لینا چاہیں وہ قرآنِ کریم کے کسی ترجمہ کو دیکھ لیں)۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۰۳/۱۷ - ۱۸) (۲۰/۷۹ - ۸۰) -  
 (۴۰ - ۴۱/۲۸) (۵۱/۴۰) بھی دیکھ لیجئے۔

سورہ دخان میں فرمایا۔

فَدَعَا رَبَّهُ اَنْ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ۝ فَاَسْرِ بِعَبَادِنَا لِيُكَلِّمَ  
 اِنَّكُمْ مُّتَّبِعُونَ ۚ وَ اَشْرٰى الْبَحْرَ دَهْوًا ۚ اِنَّهُمْ جُنْدٌ  
 مُّغْرَقُونَ ۝ ..... فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوا  
 مُنْظَرِينَ ۚ (۲۲ - ۲۹/۴۴)

اور موسیٰ نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔ (ہم نے کہا) تو میرے بندوں کو رات کے  
 وقت نکال کر لے جا، تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ جب تم سمندر کے کنارے پہنچو گے تو اس کا پانی  
 (مد و جزر کی وجہ سے) پیچھے ہٹا ہوگا۔ تم ساکن سمندر کے خشک حصے سے پار چلے جانا۔



فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تو دیکھو! قوم فرعون نے کتنے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عزت کے مقامات چھوڑے اور وہ آسائشیں جن میں وہ شاداں اور فرماں تھے۔ اور اس طرح ہم نے ان چیزوں کا وارث دوسری قوم (بنی اسرائیل) کو بنا دیا۔ اور قوم فرعون (کی ہلاکت) پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی انہیں مہلت دی گئی۔

آخری آیت کے الفاظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے اندر کس قدر بلیغ حقیقت پوشیدہ ہے۔ ایک ظالم و مستبد انسان، یا انسانوں کی جابر قوم جو دوسرے انسانوں کو اپنے پنجے استبداد میں جکڑ کر رکھنے کی کوشش کرتی ہے، وہ جسد کائنات میں ایک زہر آلود انگلی کی طرح ہے جس کا کٹ جانا، باقی جسم کی سلامتی کا موجب ہے۔

مرگِ اُو اہل جہاں را زندگی است

اس لئے اس کی موت اور بربادی نوع انسانی کے لئے وجہ شادمانی ہوگی نہ کہ باعث تاسف۔ لہذا، اس کی تباہی پر کس کی آنکھیں نمناک ہو سکتی ہیں!

**فرعون کا ایمان** | قرآن کریم میں ہے کہ جب فرعون نے دیکھا کہ موت سامنے کھڑی ہے تو اس نے ڈوبتے ڈوبتے حضرت موسیٰ کو پکارا اور کہا کہ میں تمہارے رب پر ایمان لاتا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایمان جس کا اعلان موت سے بچنے کے لئے کیا جائے، میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ ایمان خودی کے استحکام کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایمان جو ترہیب یا ترغیب (خوف یا لالچ) سے اختیار کیا جائے، ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ اس لئے اسے ایمان کہنا، ایمان کے مفہوم سے یہ بیگانگی کا ثبوت ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَأَتَّبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ  
بَغْيًا وَعَدُوًّا حَتَّى إِذَا أَذْنَكُهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ إِنَّهُ لَوِ إِلَٰهٌ  
إِلَّا الَّذِیْ آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَآءِیْلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ه (۱۰/۹۰)  
اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر

نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں۔ لیکن جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے، تو پکارا اٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں بھی اسی کے فرمانبردار ہوں۔

جواب ملا۔

اَلْئِنْ دَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۱۰/۹۱)

(ہم نے کہا) ”ہاں اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا۔

فرعون کے مقابلہ میں اس کے ساحرین کے ایمان پر نگاہ ڈالئے، زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ بد بخت تو اپنے کفر میں بھی پختہ نہ نکلا۔ اس کی خودی بڑی خام تھی۔ وہ درحقیقت خودی تھی ہی نہیں، محض سلطنت و قوت کی بنیاد پر تکبر اور غرور تھا۔ خودی، ساحرین کے اندر تھی۔ جب وہ بحالت کفر تھے تو اپنے کفر کو بزمِ خویش درست سمجھتے تھے اس لئے دنیا کا کوئی خوف یا لالچ انہیں اس روش سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ جب ان کی نگاہوں نے دیکھا کہ حقیقت دوسری طرف ہے تو وہ علی وجہ البصیرت ایمان لے آئے اور ان کی خودی اس کوہِ تمثال استقلال کی صورت میں جلوہ پیرا ہوئی جس کا مظاہرہ ان کی طرف سے فرعون کی دھمکی کے جواب میں ہوا۔ قیمت درحقیقت خودی کی ہے۔ بحالت کفر، خودی غلط قالب میں ڈھلی ہوتی ہے۔ اسلام اس خودی کو قوانینِ الہیہ کے تابع لا کر اس میں مزید استحکام و عروج کے سامان پیدا کرتا ہے۔ انجن وہی ہوتا ہے اسے صحیح پٹری پر ڈال دیا جاتا ہے اور اس کی حرارت اور قوت کو اور جلا دے دی جاتی ہے۔ اسی کو، الفاظِ دیگر یوں کہا گیا ہے کہ ”مومن اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیتا ہے“ (ان امور سے متعلق کچھ اشارات ”ابلیس و آدم“ میں ابلیس اور شیطان کے عنوان میں گذر چکے ہیں، باقی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ سو فرعون کو اس کی آخری آواز کا وہی جواب ملا جس کا وہ درحقیقت مستحق تھا۔ جب موت سامنے آجائے تو توبہ بے معنی ہو جاتی ہے۔

لے یاد رہے کہ یہ جواب (بزبانِ حضرت موسیٰ) اس فدا کی طرف سے ملا تھا جو دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس ایمان کا محرک جذبہ کیا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْإِلٰهَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ  
أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۳/۱۸)

لیکن ان لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے، لیکن جب ان میں سے کسی کے سامنے موت اکھڑی ہوئی، تو کہنے لگا "اب میں توبہ کرتا ہوں" (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ، سچی توبہ نہ ہوئی) اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے (جو انہیں پاداشِ عمل میں پیش آئے گا)۔

**فرعون کی لاش** فرعون کی غرقابی کے واقعہ کے ضمن میں قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

قَالِیَوْمَ نُخَيِّلُكَ بِبَدَنِكَ لِسَكُونٍ لِّمَنْ خَلَقَكَ آيَةً ۚ  
وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ۝ (۱۰/۹۲)

پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، ایک نشانی ہو اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یکسو غافل ہیں!

اس آیت کا صحیح مفہوم ایک عرصہ تک مرکزِ بحث و نظر بنا رہا اس لئے کہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فرعون کی لاش کو آنے والوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا گیا تھا۔ چونکہ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے اس سلسلہ میں عجیب و غریب افسانے وجود میں آ گئے۔ تا آنکہ اٹھارویں صدی میں مصر کے تہ خانوں سے ان کے قدیم بادشاہوں کی حنوط (مومی شدہ) لاشیں برآمد ہوئی شروع ہوئیں جن میں سے ایک کے متعلق علمائے مصریات کی تحقیق ہے کہ وہ فرعون موسیٰ (ریمیس ٹانی) کی لاش ہے (دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا)۔ اب اس آیہ جلیلہ کا صحیح مفہوم سامنے آ گیا۔ قرآن کریم کے حقائق و غوامض کا وہ حصہ جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے علم و تحقیق کی روشنی میں ہی صحیح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ زمانہ من حیث الکل علمی تحقیقات کی رُو سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ جوں جوں ان تحقیقات میں اضافہ ہوتا جائیگا

اور وہ قیاس سے یقین کے درجہ تک پہنچتی جائیں گی۔ قرآن کریم کے معارف رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے اور اس طرح وہ آیات جو پہلے متشابہات میں داخل تھیں رفتہ رفتہ محکمات کے ذیل میں آتی جائیں گی حَتّٰی یَكْتَبَنَّ لَهُمْ اَنْتَهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) یہاں تک کہ یہ حقیقت کمرہ طور پر سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف حق ہے۔

بہر حال اس طرح بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کی قیادت میں اہل مصر کے عذاب سے نجات ملی اور فرعون مع اپنے جنود و عساکر کے غرق دریا ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد سینا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم ان کی داستان کا یہ نیا ورق الٹیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو اس وقت آپ کے سمندر کیسے پھٹ گیا تھا؟ | دل میں رہ رہ کر اٹھ رہا ہے، یعنی یہ کہ بنی اسرائیل نے پایادہ سمندر کو کس طرح پار کر لیا، اس سمندر کو جس میں فرعون اپنے ساز و براق اور لاؤشکر سمیت غرق ہو گیا۔

فرقِ بحر کے متعلق قرآن کریم میں حسبِ ذیل مقامات پر ذکر آیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔  
وَ اِذْ فَارَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنَاكُمْ وَاَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ (۲/۵۰)

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

اور پھر وہ وقت یاد کرو جب (تم مصر سے نکلے تھے اور فرعون تمہارا تعاقب کر رہا تھا) ہم نے سمندر کا پانی اس طرح الگ الگ کر دیا کہ تم بچ نکلے اور فرعون کا گروہ غرق ہو گیا اور تم (کنارہ پر کھڑے) دیکھ رہے تھے۔

آیات (۶/۱۳۸) و (۱۰/۹۰) میں وَحَاذَرْنَا بِبَنِي إِسْرَءِیْلَ الْبَحْرَ آیا ہے، یعنی ہم بنی اسرائیل کو سمندر کے اس پار سے لے آئے۔

اور سورۃ شعراء میں ہے:-

فَاَوْحَيْنَا اِلٰی مُوسٰی اِنْ اَضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ مَخْلُوفًا فَرَقًا ۝ (۲۶/۶۳)

اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :-

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے "عصا سے سمندر کو مار" پس وہ پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ ایک بڑے قودے کی طرح تھا۔

اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے (بحکم وحی) سمندر کو اپنے عصا سے مارا "اور سمندر پھٹ گیا۔ بنی اسرائیل پار اُتر گئے اور جب فرعون ان کے تعاقب میں سمندر کے اندر پہنچا تو پھر پانی چڑھ آیا اور وہ (مع اپنے لشکر کے) غرق ہو گیا۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں یہ آیا ہے کہ حضرت موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ اپنی قوم کو سمندر کے ایک خشک راستہ سے نکال کر لے جائیں۔ اس سے "إِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ" کا دوسرا مفہوم بھی سامنے آ جاتا ہے۔ سورہ قلہ میں ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ۖ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُم مَّطَرِيقًا  
فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكًا وَلَا تُخْشَىٰ ۚ (۲۰/۷۷)

اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لیجا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح تمہیں دُکھ تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہوگا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر ہے۔

یہ آیت، مفہوم پیش نظر کو زیادہ وضاحت سے بیان کر رہی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کو پہلے ہی بذریعہ وحی ارشاد ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں اور پھر "انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے چلیں" (فَاضْرِبْ لَهُم مَّطَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا) یہاں سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سمندر میں کسی مقام پر خشک راستہ نکلنے کا بھی امکان تھا۔ لیکن یہ امکان (یا اس راستہ کا سراغ) حضرت موسیٰ پر بذریعہ وحی منکشف ہوا تھا۔ یہ راستہ کس طرح نکل سکتا تھا؟ اس کے متعلق سورہ دخان میں ایک اشارہ ہے جہاں فرمایا :-

لے اس کے ساتھ حضرت موسیٰ کا یہ اطمینان بخش جواب بھی ملا کہ پڑھئے جو اس گھبراہٹ کے وقت انہوں نے اپنی قوم کو دیا تھا کہ (إِنَّا مَعَكُمْ رَبِّي سِيَافِرِينَ) (۲۹/۶۳) یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے یقیناً بہت جلد صحیح راہ دکھا دیگا۔ (سَيَمُوتُونَ) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو اس خشکی کی راہ کا سراغ دیدیا۔

وَ اشْرِكْ الْبَحْرَ زَهْوًا ۖ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ ۝ (۲۴/۲۳)

اور سمندر کو اُترا ہوا چھوڑ دو۔ یہ ایک لشکر ہے جو غرق کیا جائے گا۔

اس آیت میں زَهْوًا کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اس کے ایک معنی ہوتے ہیں پُر سکون، یعنی جب سمندر کا جوش باقی نہ رہے اور وہ پُر سکون ہو جائے اور دوسرے معنی ہیں، وہ جگہ جہاں سے سمندر پیچھے ہٹ جائے اور اس طرح وہ حصّہ خشک ہو جائے۔ یہ دونوں شکلیں سمندر میں مدّ و جزر کے سلسلہ میں، جزر (پانی کے پیچھے ہٹ جانے) کے وقت ہوتی ہیں۔ آیت (۲۰/۷۷) میں یَبَسًا کا مفہوم بھی اس سے واضح ہو جاتا ہے، یعنی سمندر کی وہ جگہ جو خشک ہو چکی ہو۔ ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ سے کہا گیا تھا کہ تم "سمندر کے اس مقام سے جس کا نہیں سراغ دیا گیا ہے" ایسے وقت میں گدڑو جب پانی اُترا ہوا ہو۔ پھر جب تمہارے تعاب میں لشکرِ فرعون آئے گا تو اس وقت پانی کے چڑھاؤ کا وقت ہوگا۔ یہاں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اس پایابی کی کیا صورت پیدا ہوئی ہوگی۔ ذرا نقشہ پر نگاہ ڈالئے۔ بحرِ احمر (RED SEA) بحرِ ہند سے الگ ہو کر عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا، بحرِ روم کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اخیر میں پہنچ کر یہ دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ بائیں طرف کی شاخ، جو ذرا بڑی ہے، اب نہرِ سویز کے ذریعہ بحرِ روم سے ملا دی گئی ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نہرِ سویز موجود نہ تھی۔ ان دونوں شاخوں کے دو میلان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔ بحرِ احمر کا یہ حصّہ آج ایک بحرِ عمیق ہے لیکن دنیا میں، مرورِ زمانہ سے، جو جغرافیائی تغیر و تبدل پیدا ہو رہے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خشکیاں پانی میں اور پانی خشکی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ابتدائی ادوار میں یہ تبدیلیاں بہت زیادہ واقع ہو ا کرتی تھیں۔ بطلمیوس کے جغرافیہ کے مطابق بحرِ احمر زمانہ قدیم میں متعدد جزروں سے پنا ہوا تھا، اور قیاس ہے کہ اس کا آخری حصّہ اتنا گہرا نہیں ہوگا جتنا آجکل ہے۔ اس لئے مدّ و جزر یا ہواؤں کے رُخ سے اس حصّہ کا پانی ایک طرف ہٹ کر اس حصّہ کو پایاب بنا دیتا ہوگا۔ چنانچہ قورات میں ہے،

اور خداوند نے رات بھر تندہ پور بنی آندھی چلا کر سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک بنا دیا اور پانی دو حصّے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے منہ سے خشک زمین پر چل نکلے۔

(خروج ۲۱ — ۱۴/۲۲)

ان تصریحات سے قرآنِ کریم کے ان اشارات کی طرف سمجھ کی راہ نکلتی ہے جو سورہ طٰہ اور سورہ دخان کے

مندجہ صدر آیات میں ملتے ہیں اور انہی آیات کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم نے یہ کچھ لکھا ہے۔ ان تصریحات کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اَضْرِبْ بَعْضَکَ الْبُحْرَ کا مطلب کیا ہے؟ سو عربی زبان میں عصا کے معنی لاشعنی ہی کے نہیں بلکہ جماعت کے بھی ہیں۔ عصا (لاشعنی) کو عصا اس لئے کہتے ہیں کہ اسے انگلیاں مجتمع کر کے مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے اور ضرب کے معنی چلنا یا سفر کرنا بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جاؤ اور جس مقام کا تمہیں سراغ دیا جاتا ہے اس سے اس وقت جب سمندر اتر چکا ہو، بنی اسرائیل کو لے کر خشکی کے دوسرے کنارے پہنچ جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب فرعون کا لشکر ان کے تعاقب میں اس کنارے پر پہنچا ہے تو وہ دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ تھے وہ "طُودُ الْعَظِيمِ" جن کا ذکر (۲۶/۶۳) میں آیا ہے۔

ہم نے اوپر تورات کا بیان نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آندھی کے زور سے پانی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ لیکن یہودیوں کی طرف سے تورات کا جو ترجمہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضرہ کی تحقیق کی رُو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیرۂ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت سے اُسے 'SEA OF REEDS' کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع ہوا تھا۔ یہ اعلان امریکہ کی جیوش پبلیکیشنز سوسائٹی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر 'LISSER ZUSSMAN' کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس تحقیق کی رُو سے قرآن کی بیان کردہ تفصیل اور بھی زیادہ قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، ہوں ہوں تاریخی تحقیقات یقین کے درجے تک پہنچتی جائیں گی، قرآن کے بیانات حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آتے جائیں گے۔

## باب دوم

فرعون تباہ ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کے بچہ استبداد و قہرمانیت کی آہنی گرفت سے رستگاری حاصل کر کے سینا کی وادیوں میں جا پہنچے۔ اب یہاں سے ان کی زندگی کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔

یہ پہلا مرحلہ لا کا مقام تھا، یعنی غلامی و محکومی کی شکست و ریخت۔ اب لاؤ کی منزل سامنے آئی، یعنی اپنی مٹی تنظیم و تعمیر اور استخلاف فی الارض کی عملی تشکیل۔ ہرچند اس کی ابتداء بھی قیام مصر کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی، لیکن اس کے حقیقی نشو و ارتقا کا زمانہ اب آیا تھا۔ پہلا مرحلہ تو حضرت موسیٰ کی ضربِ کلیمی کے تصدق آسانی سے طے ہو گیا۔ لیکن اس دوسرے مرحلہ میں چونکہ عزم و استقلال، مسلسل جدوجہد، پیہم سعی و عمل، سپاہیانہ زندگی، سیرت کی پختگی اور ارادوں کی بلندی نہایت ضروری تھی اس لئے یہ مرحلہ بنی اسرائیل کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ اس مرحلہ میں اس داستان کے ایسے ٹکڑے سامنے آتے ہیں جو ہر اس قوم کے لئے جو اپنی تشکیل جدید اور باز آفرینی کی تڑپ رکھتی ہو، عبرت و مواعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہر انسانیتِ قریب قریب مڑ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقصد کی عالیشان درخشندگی۔ غلامی دنیا میں ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ

**غلامی کی لعنت** | نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص، جنہیں تجدیدِ انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہیئے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن ہراثیم کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے نوگر پرندے کی طرح عافیت کو ششی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس سے ذاتی سیرت کی خوبیاں اور اجتماعی کیر پکڑ کے محاسن ایک ایک کر کے بھن جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

|                              |                                |
|------------------------------|--------------------------------|
| از غلامی دل بید در بدن       | از غلامی روح گرد و بار تن      |
| از غلامی بزم ملت فرد فرد     | ایں و آن با این و آن اندر نبرد |
| آں یکے اندر سجود این در قیام | کار و بارش چوں صلوة بے امام    |
| کیش او تقلید کارش آزاری ست   | ندرت اندر مذہب او کافری ست     |
| تا نگہا و ہم دشک افزایدش     | کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش      |
| کاروان شوق بے ذوقی رحیل      | بے یقین و بے سبیل بے دلیل      |
| دین و دانش را غلام ارزاں دہد | تا بدن را زندہ وارد جہاں دہد   |



یہ تھی بنی اسرائیل کی وہ قوم جو مصر سے نکل کر سینا کی وادیوں میں پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے جو اسباب ہتیا فرمائے، ذرا ان پر غور کیجئے۔ ایک چھوڑا دودا اولوالعزم پیغمبر راہنمائی کے لئے، بلکہ ایک خیال کے مطابق تو حضرت شعیب بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، فرعون کے دستِ ظلم سے نجات، اپنی آنکھوں کے سامنے اتنے بڑے دشمن کی ایسی تباہی و بربادی، سینا کے وسیع و عریض میدان رہنے کے لئے، کھلی فضا، صاف آب و ہوا، فراخ زمین، متن و سلویٰ کھانے کو، سر پر بادلوں کا سایہ، پیچھے طوف کی سنگین دیوار حفاظت کے لئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا چاہیئے؟ لیکن جو قوم آزادی و حریت کی لذت سے بے گانہ ہو چکی ہو اس کے لئے اس زندگی میں کیا جاذبیت ہو سکتی ہے؟ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب ایک تیتڑ کو کچھ عرصہ تک، قفس کی تن آسانی کا خوگر بنا دیا جائے تو یہ زندگی اس کے لئے ایسی محبوب بن جاتی ہے کہ اس کا مالک اسے ہر روز صبح بخیرہ سے نکال کر باہر چھوڑ دیتا ہے۔ غالی پنجہ ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتا ہے اور یہ تیتڑ ادھر ادھر بھلے گئے دوڑنے اور اڑ جانے کے بجائے پنجہ کے پیچھے لپکتا ہے۔ حالانکہ عین اس وقت جنگل سے آزاد تیتڑوں کے نعمات حریت و آزادی، اسے پکار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تیری زندگی کھلی فضاؤں میں اڑنے کی ہے۔ قفس کی زندگی لعنت ہے۔ لیکن اس کی فطرت کچھ ایسی مسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ ان آوازوں پر کان نہیں دھرتا اور آزاد فضا کو چھوڑ کر قفس کی زندگی کو عین راحت سمجھتا ہے اور آزادی کی فضائے سیط میں اڑنے والوں کی آواز کے جواب میں، ایک خفیف سی مسکراہٹ سے کہہ دیتا ہے کہ وہ تمہیں مبارک! یہاں تو ہے

نئے تیرکماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے (غالب)

یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی اور ایک بنی اسرائیل پر ہی کیا موقوف، ہر اس قوم کی جو جاتی ہے جسے کچھ عرصہ تک غلامی کے قفس میں مجبوس رکھا جائے۔ وہ اس زندگی کو عین مطابق فطرت سمجھ لیتی ہے اور آزادی کی جنت انہیں جہنم دکھائی دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ انہیں جس صحبت و زبوں حالی کی زندگی سے نکال کر لائے تھے اگر ان کا احساس زندہ اور شعور بیدار ہوتا، تو قدم قدم پر خدا کی بارگاہ میں سجود و تشکر و امتنان بجالاتے۔ لیکن وہ اُسے الٹا مصیبت سمجھ رہے تھے اور ہر مقام پر یوں بگڑ کر بیٹھ جاتے

تھے گویا کہیں بے گار میں پکڑے جا رہے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ، فرعون کی قہرمانیت سے دست در گریباں ہو رہے تھے تو اپنی قوم کی حالت یہ تھی کہ مُنہ بسور کر بیٹھ گئی کہ تم ہمیں عجیب مصیبت میں کھینچے لے جا رہے ہو!

قَالُوا اُذِیْنًا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیْنَا وَ مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (۷/۱۳۹)

انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی مصیبتیں بھگت رہے ہیں۔

جب حضرت موسیٰ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو سمندر کے کنارے پہنچ کر انہوں نے پھر طوفان شروع کر دیا کہ ہمیں کس موت کی طرف دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَاءَوُا الْجَمْعُ مِنْ قَالِیْ اَصْحٰبِ مُوسٰی اِنَّا لَمُدُّکُمْ کُوْنًا (۱۳۹)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً قابو آگئے!

تورات میں ہے!

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصلوں کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھاتا کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔

(خروج ۱۰-۱۲/۱۴)

ہم غلام ہی اچھے تھے | غور کیجئے! غلام کی نفسیاتی کیفیت کیسی چھلک کر باہر آرہی ہے کہ "مصریوں کی خدمت گزاری اس سے کہیں بہتر تھی"۔ اس سے بڑی

بدبختی اور کس کی ہوگی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے؟ پھر یہی نہیں کہیں کسی ایک مقام پر گھبرا کر ایسا کہہ دیا ہو۔ وہ ہر مقام پر ایسا ہی کہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں واقعی دلی افسوس تھا کہ مصر کی محکومیت کی زندگی سے کیوں نکل آئے؟ انہیں رہ رہ کر شہری زندگی کے نگاہ فریب "تہذیب و تمدن"

کے خواب اور لمحات یاد آتے تھے۔

پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمین مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجلائی اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمین مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی بانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے، مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶/۳-۱)

اس پر مہدار فیض کی طرف سے من و سلوٹی کی نعمت ملی۔ (چند روز کے بعد وہ اس سے بھی بگڑ گئے) ایک میدان میں پہنچے، جہاں ذرا پانی کی قلت تھی، تو پھر وہی داویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟

تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور فیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ بیٹیں۔ موسیٰ نے انہیں کہا تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو؟ اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہماری مویشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔ (خروج ۱۶/۳-۱)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کر رہا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے، کیونکہ یہ مرد موسیٰ ہو ہمیں مصر سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا؟ (خروج ۱۶/۱-۲۲)

یہ کیا تھا؟ وہی غلامی کا جذام اور خودی کا ضعف جس سے ظر

قفص ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

دہی، محکومی کی تن آسانی اور سہل انگاری کی زندگی جو ”دیدہ شامیں میں نگہ سخاس“ رکھ دیتی ہے۔

وہ زندگی جو جہنم میں شجرۃ الزقوم کو شمر بہشت بنا کر دکھاتی ہے۔ غور فرمائیے! یہ مرحلہ حضرت موسیٰ کے لئے کس قدر دشوار گزار اور صبر آزما تھا؟ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی اس داستان زندگی کے مختلف اوراق کو محفوظ کر دیا ہے تاکہ وہ ہر دیدہ بینا کے لئے عبرت آموز ہو۔

سب سے بڑا انعام جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فرعون کے دستِ ظلم سے رستگاری تھا۔

**الْعَامَاتُ** | **وَإِذْ بَخَّيْنَاكُمْ مِّنَ الْإِلٰهِ فِرْعَوْنَ يَسُومُ مَوْلَاكُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ (۲/۴۹)**

اور (اپنی تاریخِ حیات کا) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں خاندانِ فرعون (کی غلامی) سے جنوں

نے تمہیں نہایت سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا، نجات دی تھی۔

سینا کے میدانوں میں بادل ان کے سر پر سایہ فگن رہتے تھے۔ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ (۲/۵۷) نیز (۴/۱۴۰) پیچھے حفاظت کے لئے حصارِ طور دے کر فَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ (۲/۴۳) نیز (۲/۱۵۳، ۲/۹۳)۔ کھانے کے لئے من و سلویٰ جیسا سامانِ تسکین جو بلا مزد و معاوضہ ملے۔ وَ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَ السَّلْوٰی (۲/۵۷) نیز ۸۰ — ۸۱/۲۰ — ۴/۱۴۰۔ پانی کا یہ اہتمام کہ ایک چھوڑا بارہ بارہ چشمے (کہ ہر ایک

قبیلہ اپنے اپنے چشمہ سے سیراب ہو)۔

وَإِذْ اسْتَسْقٰی مُوسٰی لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثنَا عَشْرَۃً عَيْنًا ۗ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبُهُمْ ۚ فَكَوٰۤا وَّاشْرَبُوْۤا مِنْ رِّیْقِیْ ۚ اِنَّہٗ لَا تَعْلَوْنَ فِی الْاُمْنٰی مُمْسِدٰتٍ ۚ (۲/۶۰) نیز (۴/۱۴۰)

اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف جاؤ۔ (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لئے موجود ہے۔ موسیٰ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چٹان پر سے مٹی کرید کر ہٹائی تو اس سے ایک چھوڑا بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی (اس وقت

۱۷ تورات میں ہے کہ یہ چشمے ایلیم کے مقام پر واقع تھے (خروج ۱۵/۲۷) لیکن دوسرے مقامات میں ان چشموں کے متعلق فیریم اور قادس کا بھی ذکر آیا ہے (خروج ۲۷-۲۸) (گنتی ۱-۲۰) سیل کے بیان کے مطابق یہ چشمے پندرہویں صدی عیسوی تک موجود تھے اور سینہ نے لکھا ہے کہ ان کا آج بھی سراغ ملتا ہے۔

تم سے کہا گیا تھا اس آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لئے تمام ضرورتیں ہتیا ہو گئی ہیں، پس) کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاد (یعنی ضروریات معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کر دیا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)۔

**خوئے غلامی کی نچتگی** | یہ تو تھیں دامانِ رحمت کی گہرا فشانیاں۔ لیکن اس کے برعکس اس قوم کی حالت عجیب و غریب تھی۔ حضرت موسیٰ نے اپنی حقیقت کشا تعلیم اور بے پناہ عمل سے اس قوم کی انسانوں اور حیوانوں کے سامنے جھکی ہوئی گردنوں کو اوپر اٹھا کر شرفِ انسانیت سے ہمکنار کرایا تھا لیکن انہیں ذلت و پستی کچھ اس درجہ مرغوب تھی کہ وہ رہ کر اپنی اٹھی ہوئی پیشانیوں کو اپنے خود ساختہ معبودوں کے حضور جھکائے چلے جاتے تھے۔ سینا کی دادیوں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کے سامنے سجدہ یز ہیں۔ پرانی عادتیں جو ان کے مغز استخوان تک میں پیوست ہو چکی تھیں، پھر سے بیدار ہو گئیں۔ حضرت موسیٰ کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ حضور! ہمیں بھی ایک ایسا ہی بُت بنواد دیجئے!!!

وَجَادُونا بِبَنی إِسْرَآئِیلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْبُدُونَ عَلٰی  
اَصْنَامٍ لَهُمْ ؕ قَالُوا یٰمُوسٰی اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا کَمَا لَهُمُ الْاِلٰهَةُ (۱۳۸)  
اور جب بنی اسرائیل سمندر پار اتر گئے تو وہاں ان کا گزر ایک گروہ پر ہوا جو اپنے بتوں پر  
مجاور بنا بیٹھا تھا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایسا ہی ایک معبود  
بنا دے جیسا ان لوگوں کے لئے ہے۔

اس درخواست پر حضرت موسیٰ کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی قوم سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاتا کہ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ (۱۳۸/۷) "واقعہ یہ ہے کہ تم بڑی جاہل قوم ہو۔" کم نچتو! تمہیں ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

اِنَّ هَؤُلَاءِ مُتَّبِعُوْنَ مَا هُمْ فِیْهِ دَ بَاطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۳۹/۷)  
یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں وہ تو تباہ ہونے والا طریقہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ یکدم باطل ہے۔

اللہ تعالیٰ تمہیں اقوام عالم پر فضیلت عطا فرمانا چاہتا ہے اور تم ہو کہ انسان تو ایک طرف، پتھر کی صورتوں کے سامنے جھکنے کی آرزو دل میں لئے بیٹھے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی۔

قَالَ اَغَيْرَ اللَّهِ اَبْلَغِيْكُمْ اِلٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۱۴۰)  
 (انیز، موسیٰ نے کہا، "کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں، حالانکہ اس نے تمہیں دنیا کی قوموں پر فضیلت دی ہے۔

وہ خدا جس نے تمہیں فرعون جیسے مستبد و قہرمان فرماں روا کے سامنے جہیں سائی سے نجات دلائی، اُسے چھوڑ کر مٹی اور پتھروں کے سامنے زمین بوس ہونا چاہتے ہو؟ (۲/۱۴۱)، "تُف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر!" لیکن غلامی سے مسخ شدہ ذہنیت سے اس کے سوائے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی تھی؟  
 بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے  
 ہزاراں سال منزل در مقام آذری کردہ

اور آگے بڑھئے۔ حضرت موسیٰ کچھ وقت کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے۔ مصر سے نکلتے وقت کچھ غیر اسرائیلی بھی ساتھ ہو گئے تھے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے۔ ان میں سمیری قوم کا ایک آدمی بھی تھا۔ (اس مقام پر ہمیں اس قوم کی تاریخی تحقیق مقصود نہیں۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ یہ قوم عراق سے نکلی تھی اور مصر تک ان کے تعلقات تھے، یہ شخص حضرت موسیٰ پر ایمان تو لے آیا، لیکن آپ کی اتباع میں صرف چند قدم ہی چل سکا۔ اسلئے کہ اسکے دل میں چوڑھا۔  
**گوسالہ سامری** | مصری گوسالہ پرست تھے۔ ان کے دیوتا حورس کا چہرہ گائے جیسا ہوتا تھا۔ (یہ عقیدہ بھی وہیں سے پیدا ہوا کہ کرۂ ارض ایک بیل کی پشت پر قائم ہے)۔

سمیری بھی گائے کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی نے سامری کے قلب کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے والے جذبات کو ابھارا۔ اس نے بنی اسرائیل سے سولے چاندی کے زیورات لئے جو وہ مصر اپنے ساتھ لائے تھے اور جواب اس مہرانی تمدن کی زندگی میں ان کے لئے دباں سر اور بارگوش ہو رہے تھے۔ اس نے ان زیورات کو گلا کر ایک بچھڑا سا بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصری مندروں کی شعبدہ بازیوں کا واقف تھا۔ اس بچھڑے کے خالی پیٹ میں کوئی ایسی کلہ بٹھا دی کہ ہوا کے نفوذ و خروج سے اس سے آواز نکلتی تھی۔ بس اب کیا تھا؟ بنی اسرائیل جوق در جوق پیکے اور اس اعجوبہ کی پرستش شروع کر دی، یعنی خدا کے

دو جلیل القدر پیغمبروں نے جس توہم پرستی کو مدت العمر کی محنت شاقہ سے ان کے قلب و دماغ سے نکالا تھا، سامری کی ایک فسوں سازی اُسے پھر سے واپس لے آئی۔ یہ ہے غلامی و محکومی کی زندگی میں پرورش پانے والی قوم کے ایمان کی پختگی! سچ ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کر گسوں میں  
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی!  
قرآن کریم نے دو مقامات پر اس حسرت انگیز واقعہ کی تفصیل بیان فرمائی ہیں۔ سورہ طہ میں ہے کہ جب  
حضرت موسیٰ طور پر تشریف لے گئے تو ندائے ربانی نے فرمایا:-

ذَٰمَآءَ اَنۡجَلٰکَ عَنْ قَوْمِکَ یٰمُوسٰی ۝ (۲۰/۸۳)

اور (جب موسیٰ طور پر حاضر ہوا) تو ہم نے پوچھا کہ لے موسیٰ! کس  
بات نے تجھے جلدی پر ابھارا اور تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا؟

عرض کیا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِیۡ عَلٰی اَشْرَیۡ ذَٰ عَجَلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی ۝ (۲۰/۸۴)

موسیٰ نے عرض کیا وہ میرے پیچھے میرے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ میں اس لئے جلدی چلا آیا  
کہ تجھ سے مزید احکام حاصل کر کے ان کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

ارشاد ہوا،

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَکَ مِنْۢ بَعْدِکَ وَ اَضَلَّھُمُ السَّامِرِیۡ ۝ (۲۰/۸۵)

فرمایا کہ (تو نے تو یہ اندازہ کیا لیکن ہوا یہ ہے کہ اتیری عدم موجودگی میں قوم ایک عجیب مصیبت  
میں پھنس گئی ہے۔ سامری نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔

اس کے بعد

فَرَجَعَ مُوسٰی اِلٰی قَوْمِہٖ غَضَبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْکُمْ رَبُّکُمْ

وَعِدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَیْکُمُ الْعٰہِدُ اَمْ اَرَدُّ لَکُمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْکُمْ

غَضَبٌ مِّنۡ رَبِّکُمْ فَاٰخَلَفْتُمْ مَّوْعِدِیۡ ۝ (۲۰/۸۶)

پس موسیٰ خشمناک اور افسوس کرتا ہوا قوم کی طرف لوٹا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو!

(یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک عظیم خوشگواہی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ پھر کیا ایسا ہوا ہے کہ بڑی مدت گزر گئی (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے؟) یا یہ بات ہے کہ تم نے چاہا، تمہارے پروردگار کا غضب تم پر نازل ہو اور اس لئے تم نے مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی؟

قوم نے جواب دیا۔

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَمِلْنَا أَثَرًا مِنْ زِينَةِ  
النِّعَمِ فَقَدْ فَتِنَا (۲۰/۸۷)

انہوں نے کہا ہم نے اپنی خواہش سے عہد شکنی نہیں کی، بلکہ (ایک دوسرا ہی معاملہ پیش آیا۔ مصری) قوم کی زیب و زینت کی چیزوں کا بوجھ ہم پر پڑا تھا۔ (یعنی بھاری بھاری زیوروں کا جو مصر میں پہنے جاتے تھے ہم اس بوجھ کے رکھنے کے خواہشمند نہ تھے) وہ ہم نے پھینک دیا۔ (بس ہمارا اتنا ہی قصور ہے)۔

پھر کیا ہوا؟

فَكَذَّبْتَ أَلْفَى السَّامِرِيُّ ۖ فَاخْرَجَ لَهُمْ رِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُورٌ  
فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى ۖ فَلَنَسِيَ ۖ (۲۰/۸۸-۸۹)

چنانچہ اس طرح (جب سونا فراہم ہو گیا تو) سامری نے اُسے (آگ میں ڈالا اور ان کے لئے ایک (سنہرا) بچھڑا (بنا کر) نکال لایا۔ ٹھنڈی لے جان دھڑا جس سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ یہ دیکھ کر بول اٹھے، یہ ہے ہمارا معبود اور موسیٰ کا بھی۔ مگر وہ سامری اس بات کو بھول گیا (کہ موسیٰ آکر کیا کہے گا)۔

”وہ سامری بھی بھول گیا اور قوم بھی“ حالانکہ بات ایسی واضح تھی کہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو اس بچھڑے کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔

أَفَلَا يَرُدُّونَ آلَ يُزْجِعَ إِلَهُهُمْ قَوْلًا ۖ ذَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ صَارًا  
ذَا لَا نَفْعًا ۖ (۲۰/۸۹)

(افسوس ان کی سمجھ پر کیا انہیں یہ (موسیٰ کی) بات بھی دکھائی نہ دی کہ بچھڑا (آواز تو نکالتا ہے



مگر ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟

اور پھر حضرت ہارون نے انہیں متنبہ بھی کر دیا تھا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يُقَوْمُوا إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَاطِيعُوا أَمْرِي ۝ (۲۰/۹۰)

اور ہارون نے انہیں اس سے پہلے (صاف صاف) بتا دیا تھا "بھائیو! یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ شخص تمہیں سخت تباہی میں ڈال رہا ہے۔ تمہارا پروردگار تو خدا ہے رحمان ہے۔ دیکھو میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو۔

لیکن اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ۝ (۲۰/۹۱)

مگر انہوں نے جواب دیا تھا کہ جب تک موسیٰ ہمارے پاس نہ آجائے ہم اس کی پرستش پر جسے ہی رہیں گے۔

حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی سے کہا۔

قَالَ يَهْرُدُونَ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۖ أَلا تَتَّبِعُهُ

أَفْعَصَيْتَ أَمْرِي ۝ (۲۰/۹۲-۹۳)

موسیٰ نے ہارون سے کہا "اے ہارون! جب تو نے دیکھا، یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں؟ کیا تو نے پسند کیا کہ مجھ سے سرکشی برتے؟

حضرت ہارون نے جواب دیا۔

قَالَ يَبْنَؤُمْرًا لَا تَأْخُذُ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۚ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكَمَرْتُ بَيْنَهُمْ فَرَقٌ ۖ قَوْلِي ۝ (۲۰/۹۴)

ہارون بولا "اے میرے عزیز بھائی! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور نہ ہی مجھے یوں ہدفِ ملامت بنا۔ میں نے اگر سختی میں کمی کی تو صرف اس خیال سے کہ میں ڈرا کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔

ڈرا اس جواب پر غور فرمائیے! قوم میں تشدد و افراق اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے بچانے کی خاطر اس

عارضی شرک تک کو رد رکھ لیا گیا!! واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے گوسالہ پرستی بھی شرک ہے اور تفسیر بھی شرک (۳۰/۳۱-۳۰)۔ لیکن ان کی گوسالہ پرستی، جہالت کا نتیجہ تھا جس کا ازالہ باسانی ہو سکتا تھا لیکن قوم میں تفرقہ فساد کا موجب بن جاتا اور اس کمی کی وجہ سے جو نقصان ہوتا اس کی تلافی نہ ہو سکتی۔ اس لئے حضرت ہارون نے بڑے نقصان کے مقابلہ میں کم نقصان والے شرک کو گوارا کر لیا۔ لیکن ہمارے ہاں حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مسلمانوں میں مستقل فرقے موجود ہیں اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان فرقوں کی گروہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا ہے اور اسے جہادِ عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، جزیاتی اختلاف (مثلاً نماز میں ہاتھ زیر ناف باندھنے چاہئیں یا سینہ پر) کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ان کی بنیاد پر کفر کے فتاویٰ صادر کر دیے جاتے ہیں۔

بہ حوالہ قصہ سامری کی طرف لوٹتے۔ حضرت موسیٰ نے سامری سے پوچھا کہ تمہارا اس حرکت سے کیا مقصد تھا؟

قَالَ خَمًا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ ۝ (۲۰/۹۵)

تب موسیٰ نے سامری سے کہا "سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا؟

اُس نے کہا۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ۝ (۲۰/۹۶)

اس نے کہا کہ جب میں اس طرف آیا ہوں تو میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو تمہاری قوم کے حیطہ تصور میں بھی نہ تھا۔ میں نے تمہارے پیغام رسالت کو پورے طور اختیار نہیں کیا تھا، اس سے محض تھوڑا سا حصہ لیا تھا۔ جب میں نے مناسب موقع دیکھا تو آہستہ کو بھی الگ کر دیا۔ میری مفاد پرستیوں نے یہ بات مجھے خوش آمد بنا کر دکھائی۔

ارشاد ہوا۔

قَالَ فَادْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۚ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ يُخْلَفَهُ ۚ وَالنَّظَرُ إِلَى إِلَهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ (۲۰/۹۷)

موسیٰ نے کہا، "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا۔ تیری سزا ہے کہ تو اچھوت بن کر رہے۔

اس کے بعد آخرت میں عذاب کا ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر ہوئے (معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جما بیٹھا تھا۔ ہم اسے جلا کر اکھ کر دیں گے اور اکھ سمندر میں بہا دیں گے۔

پھر حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ یاد رکھو۔  
 اِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۲/۹۸)  
 معبود تمہارا بس اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

(۱۲۸، ۴/۱۵۲) (۵۴، ۲/۹۲) (۱۵۳/۴)

**واقعہ سامری اور تورات** | یہ واقعہ تورات میں بھی مذکور ہے۔ لیکن قرآن کریم اور تورات کی بیان کردہ تفصیل میں وہی فرق ہے جو ایک خارجی اثرات سے منزہ آسمانی کتاب اور ذہن انسانی کی آمیزش میں ہوتا ہے۔ زیورات کے متعلق تورات میں ہے کہ خروج مصر سے پہلے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے ایما پر اہل مصر سے انہیں عاریتاً لیا اور اس طرح مصریوں کو لوٹ کر مصر سے چلتے بنے۔

اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا اور انہوں نے مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے عاریتاً لئے۔ اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ انہوں نے جو کچھ مانگا انہیں دے دیا اور انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔  
 (خروج ۳۵-۳۶/۱۲)

پھر باب صفحہ ۳۲ میں مذکور ہے کہ یہ بچھڑا خود حضرت ہارون نے بنایا تھا اور انہی نے اس کی پرستش کرائی تھی۔ (معاذ اللہ - معاذ اللہ)۔

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑی سے اترنے میں دیر ہی کرتا ہے تو وہ ہارون کے

پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے۔ کیونکہ یہ مرد  
 موئے جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم اسے نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے  
 انہیں کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری جو روؤں اور تمہارے بیٹوں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں  
 میں ہیں توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے زیور جو ان کے کانوں میں  
 تھے توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اُس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک کچھڑا  
 ڈھال کر اس کی صورت حکاکے ہتھیار سے درست کی اور انہوں نے کہا کہ اے اسرائیل  
 یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس  
 کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔  
 اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھا دیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرائیں اور لوگ  
 کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ (خروج ۱-۴/۳۲)

**ایک اور فرمائش** | اور آگے بڑھتے۔ جب من و سلویٰ کھانے کو ملا تو شہری زندگی کے چھٹے  
 روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جاتی۔ دسترخوان پر تنوع ہونا چاہیے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى كُنْ نَصِيْرًا عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَاذْعُ لَنَا رَبَّكَ  
 يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِئُ الْاَرْضُ مِنْْ بَقْلِهَا ذِ قَتَاوِهَا وَ فُؤُوسَهَا وَ عَدِهَا  
 وَ بَصْلَهَا ۗ قَالَ اَتَسْتَبِیْزُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ ۗ  
 اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَاَلْتُمْ ۗ (۲/۴۱)

پھر تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی طرح کے کھانے پر قناعت کر لیں  
 (یعنی صرف من و سلویٰ پر قناعت کر لیں۔۔۔۔۔ پس اپنے  
 پروردگار سے ہمارے لئے وہ چیزیں طلب کرو جو زمین کی پیداوار ہیں، سبزی، ترکاری، گیہوں،  
 دال، پیاز، لہسن وغیرہ جو مصر میں ہم کھایا کرتے تھے) موسیٰ نے یہ سن کر کہا (افسوس  
 تمہاری جہالت پر!) کیا تم چاہتے ہو ایک ادنیٰ سی بات کے لئے (یعنی غذا کی لذت کے

لئے) اُس (مقصدِ عظیم) سے دست بردار ہو جاؤ جس میں (بڑی ہی) خیر و برکت ہے؟ (یعنی اس جفاکشی کی زندگی کی تربیت چھوڑ دو جس کے نتیجہ میں تمہیں اس سرزمین کی فرمانروائی حاصل ہونے والی ہے۔ بہر حال، اگر تم ہی پسند کرتے ہو تو) چلو کسی بستی کی طرف چلے چلو۔ وہاں یہ تمام چیزیں مل جائیں گی جن کے لئے ترس رہے ہو۔

یعنی اس دشت و صحرا میں تمہیں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم شہری تمدن کی تن آسانی کی زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کے نو گریز بن جاؤ تاکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر تم ذلت و نامرادی ہی چاہتے ہو تو جاؤ۔ پھر شہری تمدن کی زندگی اختیار کرو۔ ان سے پہلی آیات میں ان سے کہا گیا تھا کہ ”ہماری تجویز یہ تھی کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاختانہ حیثیت سے رہو“ (۵/۲۱) اور اس طرح اپنے اختیار و ارادہ سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاؤ، فقط ایک بشرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو۔ اس طرح تمہاری صحراوردی کی زندگی بھی ختم ہو جاتی اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے مضر اثرات سے تمہیں سامانِ حفاظت بھی مل جاتا اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تو ان فتوحات کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن تم نے سپاہیانہ زندگی کے مقابلہ میں آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی کو ترجیح دی (۲/۱۶۱) اور اس طرح ہمارے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر الگ راہ اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق تم میں کمزوری آتی چلی گئی اور تم میں ہجرت و بیابانی باقی نہ رہی۔ (۵/۲۲-۲۳)“

**خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے** | اور آگے بڑھتے! حضرت موسیٰ نے جب کہا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں، تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ ہم جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اس پر ایمان کیسے لے آئیں اور یہ کس طرح مان لیں کہ یہ احکام فی الواقع خدا کی طرف سے ہیں؟

لے اِھْبِطُوا مِصْرًا کے معنی ہیں کہ ”بستی کی طرف چلے جاؤ“ نہ کہ ملکِ مصر کی طرف، جیسا کہ بعض مستشرقین نے غلطی سے اعتراض کیا ہے۔“

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى كُنْ لِّتٰمِنَ ۙ لَّكَ حَاشٰى اَنْتَ اَمْلٰهُ جَهَنَّمَ (۲/۵۵)

اور پھر وہ واقعہ یاد کرو (جب تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم کبھی تمہاری بات ماننے والے نہیں جب تک کہ کھلے طور پر اللہ کو نہ دیکھ لیں۔

ذرا اس فرمائش پر غور کیجئے اور پھر اس قوم کی نفسیاتی کیفیت پر جو اس قسم کے سوال کرے۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ خدا کو اس دنیا میں دیکھ کون سکتا ہے؟ البتہ اس کے جلال کا تماشا دیکھنا ہو تو چلو اور اپنے خسر و فاشاک کو اس برقی تپاں کے سامنے لے جا کر اپنی آزمائش کرو۔ لاکھوں کی جمعیت کو تو ساتھ کیا لے جانا تھا ان میں سے ستر نمائندے چُن لئے اور انہیں ساتھ لے کر طور کی طرف تشریف لے گئے۔ طور کی چوٹی پر پہنچے تو یہ آتش فشاں پہاڑ زلزلے سے کانپ رہا تھا۔ آسمان پر بادل گھرا ہوا تھا، نیچے زلزلہ اور پرکبلی کی کڑک، ایسی دہشت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، یعنی اپنے حوصلہ کا یہ عالم کہ زلزلہ، گرج چمک کی تاب نہ لاسکے اور بے ہوش ہو گئے اور طلب کی یہ کیفیت کہ خدا کو بے نقاب دیکھنے کے لئے چل پڑے! (دیکھئے ۵۵ - ۵۶/۲ : ۱۵۵/۲)۔

**ایمان کا تقابل** آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا پیچھے مڑ کر نگہ باز گشت ڈالئے ان صفحات پر جن میں ساحرین دربار فرعون کا واقعہ درج ہے۔ بنی اسرائیل کے اندر دو اولوالعزم پیغمبر موجود ہیں جو ایک عرصہ سے انہیں ایمان باللہ کی حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں لیکن اس قوم کی حالت یہ ہے کہ کبھی حضرت موسیٰ سے بُت تراشی کی درخواست کرتے ہیں، کبھی گوسالہ پرستی پر پل پڑتے ہیں، کبھی اڑ بیٹھتے ہیں کہ جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ محکوم قوم کے افراد کے ایمان و ایقان کی حالت ہے۔ دوسری طرف ایک آزاد قوم کے افراد ہیں کہ ایک عمر کفر میں بسر کی ہے کسی سے خاص طور پر توحید کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن جب ان کی نگاہ دیکھتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے تو ایک ثانیہ کے تأمل کے بغیر ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں اور پھر اس ایمان پر اس طرح جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ فرعون کی سخت سے سخت دھمکی اور بڑے سے بڑا خوف ان کے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی دھمکیوں کا جواب، استخفاف کی ہنسی سے دیتے ہیں اور موت کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے ہیں، لیکن اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹتے۔ یہ کیا ہے؟ وہی فرق جس کی طرف

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ آزاد قوم کے افراد کے اندر (بالعموم) جرأت و بے باکتی ہوتی ہے۔ صرف اُس کا رخ (channel) غلط ہوتا ہے ذرا رخ صحیح کر دیجئے، ان کا کفر پختہ ایمان میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس محکوم قوم کا سینہ (بالعموم) خوف و تنگ نظری کا نشیمن ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا دعوائے ایمان حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ وہ قدم قدم پر رکتے اور ہر سانس پر ٹھہرتے ہیں۔ ذرا سی تکلیف ان کے ایمان میں تزلزل و تذبذب پیدا کر دیتی ہے۔ جھوٹی سی آزمائش ان کے سامنے بہانہ ہوئیوں اور حیلہ سازیوں کے دفتر کھول دیتی ہے۔ یہ ہے فرق ایک آزاد اور محکوم کے ایمان میں۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال  
کس درجہ گراں سیر میں محکوم کے اوقات  
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت  
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات  
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور  
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ محکومی سے آزادی کی طرف بڑھنے سے انسان میں بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اور قہر آن کی رو سے صحیح آزادی یہ ہے کہ انسان دنیا میں صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہو۔ لہذا، صحیح شرفِ انسانیت بھی اسی آزادی میں جا کر نصیب ہوگا۔

..... بہانہ بیاں  
ایک اور واقعہ سنئے۔ جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ، مضمل اور اُن کے جوہر مردانگی مصلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس نقطہ باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے وہ

شمیر و سناں اول طاؤس در بابِ آخر

کی زندہ داستان نظر آئے گی۔ عملی دور میں دیکھئے تو کیفیت یہ ہوگی کہ ادھر کوئی حکم ملا اور ادھر اس پر عمل ہو گیا۔ نہ کوئی جھجکت نہ بہانہ نہ بحث نہ جدل۔ ے

انکوں کرا دماغ کہ پر سدر باغباں

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لیکن جب دورِ عمل ختم ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر شعبے میں ”شاعری“ شروع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ قوم، عمل کے بجائے اس قسم کے نظری مسائل میں الجھ کر رہ جاتی ہے کہ ے

ابنِ مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے      میں صفاتِ ذاتِ حقِ حق سے جدا یا عینِ حق

آنے والے سے مسیح نامری مقصود ہے یا مجتد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟  
 میں کلام اللہ کے الفاظِ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات  
 مسلمانوں کے اس دورِ عمل پر نظر ڈالئے جب ان کی نگاہوں سے قوموں کی "تقدیر میں" بدل جایا کرتی  
 تھیں۔ آپ کو کہیں اس قسم کے نظری مباحث دکھائی نہیں دیں گے۔ لیکن اس دور کے بعد دیکھئے۔ ان کی  
 تمام قوتیں انہی منطقی موثر کٹائیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں میں صرف ہو رہی ہیں اور الفاظ کے گورکھ دھندوں  
 میں اس انداز سے اُلجھے ہیں کہ عمل کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھتا اور پھر اس "مقدس شاعری" کو اہمیت دی  
 جاتی ہے کہ یہ عین خدمتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ بن کر دکھائی دیتی ہے۔ یہی حالت سنی اسرائیل  
 کی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مصریوں کی دیکھا دیکھی گائے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر  
 چکی تھی۔ وَ اُسْرِدُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْبُخْلَ بِكُفْرِهِمْ (۲/۹۳) اس باطل پرستی کے جذبہ  
 کے استیصال کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان کے "معبود" کو خود ان کے ہاتھوں ذبح  
 ذبح بقرا کرایا جائے تاکہ اس کی عظمت و تقدس کے باطل تصور کے گلے پر چھری پھر جائے اس  
 لئے انہیں حکم دیا گیا کہ ایک گائے کی قربانی کرو۔

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً  
 قَالُوْا اَتَذْبَحُنَا هٰذَا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ  
 الْجَاهِلِيْنَ ۝ ۵ (۲/۹۷)

اور پھر (وہ معاملہ یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے یہ (سیدھی سادی) بات کہی تھی کہ  
 خدا کا حکم ہے، ایک گائے ذبح کرو (بجائے اس کے کہ سیدھی طرح اس پر عمل کرتے، لگے  
 طرح طرح کی کٹ جھتیاں کرنے۔ پہلے) کہا (بھلا کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے ایسی بات کا حکم دیا ہو؟)

لے اس سے یہ سمجھ لیجئے کہ ہم علمی تحقیقات کے مخالف ہیں۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جن بحثوں کی طرف ہم اشارہ کر  
 رہے ہیں ان میں اور صحیح علمی تحقیقات میں تین فرق ہے اور پھر سب سے مقدم چیز تو صحیح عمل ہے۔ علمی تحقیقات بھی عمل کے لئے  
 ممد و معاون ہونی چاہئیں۔ عمل سے ہٹ کر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ جو ضربِ کلیدی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا۔  
 لے اس سے گائے اور سانڈ دونوں مراد لئے جاسکتے ہیں۔



معلوم ہوتا ہے تم ہمارے ساتھ مسخر کر رہے ہو۔ موسیٰ نے کہا، نعوذ باللہ اگر میں (احکام الہی کی تبلیغ میں مسخر کروں اور) جاہلوں کا شیوہ اختیار کروں۔

کس قدر صاف حکم تھا۔ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ گائے سے کیا مراد ہے اور ذبح کرنا کسے کہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اب بہانہ سازیاں شروع کر دیں اور موشگافیوں میں اُلجھنے لگے۔

قَالُوا اِذْ عَمَلْنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ ۖ قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۝ (۲/۶۸)

انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے کہو کہ وہ ہمارے لئے اس کی وضاحت فرمادے۔ موسیٰ نے کہا کہ پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جو نہ بوڑھی ہو نہ بچہ، پوری جوانی تک پہنچی ہوئی ہو اور ہر طرح سے اعتدال پر۔ پس جو کچھ تم سے کہا گیا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ لیکن وہ اتنے پر کس طرح آمادہ عمل ہو جاتے۔

قَالُوا اِذْ عَمَلْنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا بَوْنُهَا ۖ قَالَ اِنَّهُ يَقُولُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفَرَاءُ ۖ فَارِقَمٌ ۖ لَوْنُهَا نَسْرٌ اَلْيَظْرِيْنِ ۝ (۲/۶۹)

کہنے لگے 'اپنے پروردگار سے درخواست کرو، وہ یہ بھی بتلا دے کہ گائے کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟ موسیٰ نے کہا کہ حکیم الہی یہ ہے کہ اس کا رنگ زرد ہو، خوب گہرا زرد، ایسا کہ دیکھنے والوں کا جی دیکھ کر خوش ہو جائے۔

اب ایک اور استفسار!

قَالُوا اِذْ عَمَلْنَا رَبَّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ ۖ لَا رَيْتَ اَلْبَقَرَةَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۚ اِنَّا اِنْشَاءُ اَمَلُهُ كَمُهْتَدُونَ ۝ (۲/۷۰)

(جب رنگ کی خصوصیت بھی متعین ہو چکی تو انہوں نے ایک اور اُلجھاؤ پیدا کر دیا) کہنے لگے (ان ساری باتوں کے بعد بھی) ہمارے لئے (مطلوبہ جانور کی پہچان مشکل ہے) اپنے پروردگار سے کہو کہ (اور زیادہ وضاحت کے ساتھ) بتلا دے کہ جانور کیسا ہونا چاہیے۔ انشاء اللہ ہم ضرور پتہ لگا لیں گے۔

دیکھئے کیسی سیدھی سی بات تھی جسے اس قدر الجھاؤ میں ڈالتے جا رہے ہیں۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ أَوْ دَلُوبٌ تَتَرَبَّصُّ الْأَرْضَ وَ أَوْ تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةً أَوْ شَيْئَةً رَفِيفًا قَالُوا أَلَيْسَ جِئْتُمْ بِالْحَقِّ ط (۲/۷۱)

اس پر موسیٰ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے، ایسی گائے ہو جو نہ تو کبھی ہل میں جوتی گئی ہو، نہ کبھی آبپاشی کے لئے کام میں لائی گئی ہو، پوری طرح صحیح و سالم، داغ دھبہ سے پاک و صاف۔ (جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، تو پھر مجبور ہو کر بولے۔ ہاں، اب تم نے ٹھیک ٹھیک بتا

بتلا دی۔

اب چاروں طرف سے گھر گئے اور داغ مزید سوالات سے جواب دے چکا تو مجبوراً گائے کو ذبح کیا ورنہ ان کی نیت ایسا کرنے کی نہ تھی۔ فَذَبْحُوهَا وَ مَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ط (۲/۷۱)۔ قرآن کریم کی اس آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے کہ ”وہ کرنا نہیں چاہتے تھے“ یہ تھی لم ان تمام سوالات کی یہ نہیں کہ حکم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سچ ہے۔ ۷

محکوم ہے بے گانہ اخلاص و مروت  
ہر چند کہ منطق کی دیلوں میں ہے چالاک

**خوف و ہراس کے چھلاوے** | اور آگے بڑھئے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لانے سے مقصود یہ تھا کہ انہیں فلسطین کی زمینیں

کا حاکم بنا دیا جائے جہاں وہ اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مصرائے سینا تو فقط ستائے کا مقام (یا تربیت گاہ) تھا۔ منزل اس سے آگے تھی۔ حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ فلسطین کی ارض مبارک اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور جا کر اس پر قبضہ کر لو۔ غور کیجئے، اللہ کا ایک اولوالعزم پیغمبر یہ بشارت دے رہا ہے کہ وہ ملک تمہارے نام لکھا جا چکا ہے۔ بس اٹھ کر قبضہ کر لینے کی دیر ہے (۵/۲۱)۔ لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ ایک مدت کی غلامی نے جرأت و جسارت اور ہمت و حوصلہ کے تمام جوہر سلب کر لئے تھے۔ فوری مقابل کے لوگ انہیں دیونظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوا يَمُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَكُنْ دَاخِلُهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ (۵/۲۲)

انہوں نے (اس کے جواب میں) کہا "اے موسیٰ! اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں، جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل گئے تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔  
فراغور کیجئے اس منطق پر کہ دشمن پہلے نکال دیجئے، ہم پھر آگے بڑھیں گے۔ اس پر اللہ کے ان دو بندوں (موسے اور ہارون) نے ان سے کہا۔

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَ عَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۵/۲۳)

انہیں ڈرنے والوں میں دو آدمی ایسے بھی تھے جنہیں اللہ نے (ایمان و یقین) کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے ان سے کہا کہ (اس قدر بے طاقت اور بزدل کیوں ہو رہے ہو) ہمت کر کے ان لوگوں پر جہاں پڑو اور (شہر کے) دروازہ میں داخل ہو جاؤ۔ اگر تم (ایک مرتبہ) داخل ہو گئے تو پھر غلبہ تمہارے ہی لئے ہے اور اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو چاہیئے کہ اللہ پر بھروسہ کرو!

لیکن ان پر اس نصیحت کا کیا اثر ہوتا! کہنے لگے۔

قَالُوا يَمُوسَىٰ إِنَّا لَكُنْ دَاخِلُهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَادْهَبْ أَنتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۝ (۵/۲۴)

وہ بولے "اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں۔ (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی تُل گئے ہو تو) تم اور تمہارا بڑا بھائی (ہارون) دونوں جاؤ۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔ (تم دونوں وہاں لڑتے رہنا)۔

ہمتوں کی پستی | لیجئے! جواب مل گیا کہ اگر ہماری بہبود کی اتنی تڑپ ہے تو جلیئے ان ہمتوں کی پستی | لوگوں سے لڑیئے اور جب آپ دشمنوں کو مغلوب کر لیں تو ہمیں آواز دینا

ہم فوراً آجائیں گے۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں، کہیں بھاگ نہیں جاتے!!

اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے؟ حضرت موسیٰ نے بدرگاہ رب العزت عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَ أَخِي فَأَخْرِقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ (۵/۲۵)

(یہ حالت دیکھ کر) موسیٰ نے کہا کہ خدایا! میں اپنے آپ کے سوا اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ پس تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں (اپنے حکم سے) فیصلہ کر دے!

اس بارگاہ سے، جہاں قوموں کے اعمال کا ذرہ ذرہ میزانِ مکافات میں رکھ کر نتائج مرتب ہوتے ہیں، جواب ملا کہ بے شک یہ سرزمین اس قوم کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے لیکن یہ مخاطب جماعت اس کی اہل نہیں۔ ان پر یہ ارض مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۖ يَتَيَهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ (جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے، تو) اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی (یعنی چالیس برس تک اس سے محروم کر دیئے گئے)۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو (اے موسیٰ!) تم نافرمان لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہو (وہ اپنی بد عملیوں سے اسی محرومی کے مستحق ہیں)۔

تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آئے گی۔

**ستانے والی قوم** | آپ نے دیکھا کہ یہ قوم حضرت موسیٰ کو کس طرح ستاتی تھی، ان کی یہی روش

ستانے والی جس سے دل برداشتہ ہو کر حضرت موسیٰ نے ان سے کہا:

وَ إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ لِقَوْمٍ لِّمَ تُؤْذُونَنِي ۚ وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ ۚ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۴۱/۵)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم مجھے (اس طرح) ستاتے کیوں ہو؟ حالانکہ تم (ابھی طرح) جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (لیکن وہ اس پر بھی نہ سمجھے) سو جب وہ (لوں) ٹیڑھے چلے، تو اللہ (کے قانونِ مکافات) نے ان کی اس روش کے نتیجے میں ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور اللہ فاسقین کی قوم کو (سعادت کی) راہ نہیں دکھایا کرتا۔

بنی اسرائیل کی ان تأسف انگیز اور عبرت خیز حرکات کو سامنے لاکر مسلمانوں سے کہا گیا کہ یاد رکھو:   
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَانُوا أَكْثَرُ أُمَّةٍ لِّمُوسَىٰ فَنَزَعَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۖ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝ (۳۳/۴۹)   
اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو (اس طرح) ایذا دی تھی۔ سو اللہ نے اسے ان تمام باتوں سے جو وہ اس کے خلاف کہتے تھے الگ رکھا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑے مرتبہ والا تھا۔

دوسری جگہ ہے۔

أَمْ تَرْيَدُونَ أَنْ نَسْأَلُكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۚ مَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءً السَّبِيلِ ۝ (۲/۱۰۸)   
پھر کیا تم چاہتے ہو اپنے رسول سے بھی ویسے ہی سوالات کرو، جیسے سوالات اب سے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں۔ (یاد رکھو) جو کوئی بھی ایمان کی نعمت پاکر پھر اسے کفر سے بدل دے گا تو وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا اور فلاح و کامیابی کی راہ اس پر گم ہو گئی۔

**تورات کا افسانہ** | اس قوم نے حضرت موسیٰ کو کس کس انداز سے ستایا تھا اور وہ کس کس قسم کے یہودہ سوالات کیا کرتی تھی اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ لیکن محرف تورات میں ذہن انسانی نے اس کے لئے بھی ایک عجیب افسانہ تراشا ہے۔ گنتی باب ۳۱ میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کے بھائی (حضرت ہارون) اور ان کی بہن (مریم) نے ایک کوٹھی عورت کے بلسہ میں حضرت موسیٰ سے شکوہ کیا تھا۔

اور مریم اور ہارون نے موسیٰ کا شکوہ اس کو شعی عورت کی بابت کہ اس نے بیاہ لی تھی کیا۔ کیونکہ اس نے ایک کو شعی عورت لی تھی۔ اور بولے کیا خداوند نے فقط موسیٰ ہی سے باتیں کیں ہیں؟ کیا اس نے ہم سے بھی باتیں نہیں کیں۔ چنانچہ خداوند نے یہ سنا۔ (گنتی ۱۱/۲-۱۳)

حالانکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خود تورات میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ قوم موسیٰ قدم قدم پر شکایت کرتی تھی کہ انہیں مصر سے کیوں باہر نکال لائے۔ خود اسی کتاب (گنتی) میں اس بات کا ذکر موجود ہے۔

تب ساری جماعت چلا کے روئی اور لوگ اس رات بھر رو یا کئے۔ پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے نہیں کہا اے کاش کہ ہم مصر میں مرجاتے! یا کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے۔ (گنتی ۱۱/۲-۱۳)

اس سے آگے ہے۔

بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے ہبینہ میں دشت صیتن کو آئی اور قادس میں رہنے لگی۔ مریم وہاں مری اور وہیں گاڑی گئی۔ وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا۔ سو وہ جمع ہو کے موسیٰ اور ہارون کے خلاف ہوئے اور ان لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا اے کاش کہ جب ہمارے بھائی خداوند کے آگے مر گئے ہم بھی مرجاتے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لائے کہ ہم اور ہمارے جانور یہاں مرجائیں؟ اور تم ہمیں مصر سے اس بُرے مقام پر پہنچانے کے واسطے کیوں نکال لائے؟ یہاں تو بونے کی جگہ نہیں اور نہ بخیر جس کی اور نہ انگوروں کی اور نہ اناروں کی ہے۔ یہاں تو پینے کو پانی بھی نہیں۔ (گنتی ۱۱/۵-۲۰)

اور تیسرے مقام پر۔

اور لوگوں نے خدا اور موسیٰ سے جھگڑ کے یوں کہا کہ تم ہم کو مصر سے نکال لائے کہ ہم بیابان میں فریں؟ یہاں تو نہ روٹی ہے نہ پانی۔ ہمارے جی کو اس ہلکی روٹی سے کراہیت آتی ہے۔ (گنتی ۱۱/۵-۲۱)

لیکن ذہن انسانی کو جو لذت افسانوں میں ملتی وہ حقیقت میں کہاں؟ اسی لئے تورات میں اس کھلی

ہوئی حقیقت کو چھوڑ کر افسانہ طرازی کی طرف رُخ کر لیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ قرآن کریم نے جس شرح و بسط سے ان واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جو حضرت موسیٰ کے لئے وجہ اذیت ہوئے تھے اور جن سے تنگ آکر آپ نے بحضور رب العزت یہاں تک عرض کر دیا تھا کہ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۵ (۵/۲۵)۔ ان کی روشنی میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن بخاری شریف میں آیت (۳۳/۶۹) (جو ادھر گزر چکی ہے) کی تفسیر میں حسب ذیل روایت مذکور ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان موسیٰ کان رجلاً حییا ستیر الایمیری من جلدہ شیئ استحیاء منہ فاذا اذ من اذا من بنی اسرائیل فقالوا ما یستتر ہذا التستر الا من عیب۔ مجلدہ اما برص واما اذاعہ واما افة وان اللہ اداد ان یدرئہ مما قالوا الموسیٰ فخلو یوماً وحادہ فوضع ثیابہ علی الحجر ثم اغتسل فلما فرغ اقبل الی ثیابہ لیاخذنہا وان الحجر عدا بثوبہ فاخذ موسیٰ عصا وطلب الحجر فجعل یقول ثوبی حجر ثوبی حجر حتی انتہی الی من بنی اسرائیل فرأوہ عرباً نا احسن ما خلق اللہ وأبرأ ما یقولون وقام الحجر فاخذ ثوبہ فلبسہ وطفق بالحجر ضرباً بعصا فواللہ ان بالحجر لندبا من أشرف ضربہ ثلاثا اواربعا وخمسا فذلک قولہ یا ایہا الذین امنوا لا تکونوا الذین اذوا موسیٰ فابرأ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیہا۔  
(بخاری شریف جلد دوم، ص ۱۵۳)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰؑ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی ان کے حصّہ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا لیکن بعض موزی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے یہ اس قدر پردہ صرف اس وجہ کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے، برص ہے یا بادغایہ ہے یا کوئی اور مرض ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی افترابندی سے بری کر دے چنانچہ

ایک دفعہ حضرت موسیٰ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے، کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے لگے۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے لینے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسیٰ لاٹھی لے کر (برہنہ) پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے، اوپر پتھر میرے کپڑے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور معائنہ کر لیا کہ بہت عہد نخست کے آدمی ہیں۔ خدا نے تعالیٰ نے (اس ذیل سے) بنی اسرائیل کی افرا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر بھی رُک گیا۔ موسیٰ نے اپنے کپڑے لے لئے اور پھر لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ حضور فرماتے ہیں: خدا کی قسم! موسیٰ کے مارنے کی وجہ سے پتھر برہنہ یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے تھے۔ حضور نے فرمایا، خدا تعالیٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے.....

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... (۳۳/۴۹)

قرآن کریم کی تصریحات کے بعد جو پہلے گزر چکی ہیں اور جن میں یہ آیت بھی آچکی ہے، پیش نظر روایت کسی تبصرو کی محتاج نہیں رہتی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔

اب پھر اصل واقعہ کی طرف چلتے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی قوم کا علاج کیا؟ یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ انہیں مصر سے نکال لائے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق، فلسطین کی ارض مقدس اس قوم کے نام لکھی جا چکی تھی۔ لیکن وہ مل تو اس جماعت کو سکتی تھی جو اس کے لینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لے اور اپنے اعمال سے اس سختی قرار پائے۔ جب بنی اسرائیل کی زیر نظر جماعت کے اعمال کی کیفیت وہ ہو جو اوپر بیان کی جا چکی ہے تو بیٹھے بٹھائے ارض مقدس کی حکومت کس طرح مل جائے؟ وراثت ارضی کی شرط تو صلاحیت ہے۔ اَنَّ الْأَرْضَ مِيرَاثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱/۱۰۵) اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے قلوب و جوارح کے اعمال سے۔ اس قوم کو ہر قسم کے مواقع

**نئی نسل کی تربیت** | بہم پہنچا کر دیکھ لیا۔ ان میں (اُس وقت) زندگی کے کوئی آثار پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ قوم کے ان بڑے بوڑھوں کو ختم ہو لینے دیا جائے اور نوجوانان ملت کے قلب و دماغ کی تعمیر نئی بنیادوں پر کی جائے۔ جب وہ آگے چل کر قوم بنیں تو پھر اللہ کے یہ وعدہ پورے ہوں۔ اسی لئے حکم ہوا۔



قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ  
فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ٥ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ جب ان لوگوں کی محرومیوں کا یہ حال ہے، تو اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ (یعنی چالیس برس تک اس سے محروم کر دیئے گئے) یہ اسی بیابان میں سرگڑاں رہیں گے۔ سو الے موسیٰ! تم ان نافرمان لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہو (وہ اپنی بد عملیوں سے اسی محرومی کے مستحق ہیں)!

چنانچہ حضرت موسیٰ نے آب و گل کے ان پیکردوں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرے تاکہ اس ایفون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے اور جب ان کی نئی نسل، جن کی تربیت مصر کے تمدن اور وہاں کی محکومی کی فضیلت سے الگ رکھ کر کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو تو اس زمین کا قبضہ وہ حاصل کر لیں۔ قوموں کی باز آفرینی کا طریق یہی ہے کہ ان کے فرسودہ خیال، رجعت پسند عنصر کو الگ کر کے، نئی نسل کے افراد کی تربیت جدید ماحول میں، نئے خطوط پر کی جائے تاکہ وہ تازہ دلوں اور زندہ عزائم لے کر ابھریں اور ہر مخالف قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیں۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے دعا مانگی تھی کہ

من کہ نویم ز پیران کہن      دارم از روزے کہ می آید سخن  
بر جواناں سہل کن حرف مرا      بہشای پایاب کن حرف مرا

سلسلہ رشد و ہدایت | صحرائے سینا میں حضرت موسیٰؑ نے نوجوانان قوم کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہیں، تجلی گاہ طور پر ندائے جمال ان کی رشد و ہدایت کے سامان فراہم کرتی ہے۔ جب آپ ادھر تشریف لے جاتے ہیں تو حضرت ہارونؑ قوم کی نگرانی کا فریضہ سنبھال لیتے ہیں (۷/۱۴۲)۔ وہاں پہنچتے ہیں تو ذوق دیدار سے بے تاب ہو کر جلوہ بے نقاب کی درخواست کرتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ ۖ قَالَ رَبِّ ارْنِنِي  
أَنْظُرَ إِلَيْكَ ..... فَلَمَّا آفَقَ قَالَ سُبْحَنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَ

اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۴/۱۳۳)

اور جب موسیٰ آیا، تاکہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا، تو (جوش طلب میں بے اختیار ہو کر) پکار اُٹھا ”پروردگار! مجھے اپنا جمال دکھا کہ تیری طرف نگاہ کر سکوں۔“ حکم ہوا ”تو مجھے نہ دیکھ سکے گا، مگر ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ اپنی جگہ ٹکرا رہا، تو (سمجھ لیجئے) تجھے بھی میرے نظارہ کی تاب ہے اور تو مجھے دیکھ سکے گا۔“ پھر جب اس کے پروردگار (کی قدرت) نے نمود کی، تو پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب موسیٰ ہوش میں آیا، تو بولا ”خدایا! تیرے لئے ہر طرح کی تقدیس ہو! میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں، میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں۔“

بارگاہ ایزدی سے نوازشاتِ یہم کی بارشیں ہوتی ہیں۔

قَالَ يٰمُوسٰى اِنِّىْ اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلَتِىْ وَ بِلَا وَحٰى ۝  
فَخُذْ مَا اٰتَيْنٰكَ وَ كُنْ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۴/۱۳۴)

خدا نے کہا ”اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔ پس جو چیز تجھے عطا فرمائی ہے (یعنی احکام شریعت) اسے لے اور شکر

بجالا۔

اس طرح حضرت موسیٰ کو خدا کے احکام ملتے چلے گئے اور وہ انہیں اس زلمے کے طریق کے مطابق تختیوں پر منقوش کراتے گئے۔ (۱۳۵۱-۱۳۵۴)؛ (۵۱-۵۳/۱۹)۔

ادھر سے رشد و ہدایت ملتی اور ادھر اس کے مطابق نوہالانِ قوم کی تربیت کی جاتی۔ کبھی انہیں ان انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی جاتی جو ان پر فساداں ہوئے تھے۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں، اس تربیت کا ذکر آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو

۱۳/۴؛ ۵/۲۰؛ ۴-۱۳/۸)۔

تورات میں ہے کہ انہی میدانوں میں حضرت شعیبؑ بھی حضرت موسیٰؑ سے آئے اور انہیں تنظیم کے طور طریق سکھائے۔

اور دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ لوگوں کی عدالت کرنے بیٹھا اور لوگ موسیٰ کے آگے صبح سے شام تک کھڑے تھے۔ تب موسیٰ کے سسرے نے سب کچھ جو اس نے لوگوں سے کیا دیکھ کے کہا یہ تو لوگوں سے کیا کرتا ہے؟ تو کیوں آپ اکیلا بیٹھتا ہے اور سب لوگ صبح سے شام تک تیرے آگے کھڑے رہتے ہیں؟ موسیٰ نے اپنے سسرے کو کہا یہ اسی واسطے ہے کہ لوگ خدا سے دریافت کرنے کے لئے مجھ پاس آتے ہیں۔ جب ان میں کچھ جھگڑا ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں ایک دوسرے کے درمیان انصاف کر دیتا ہوں اور میں انہیں خدا کے احکام اور شریعت سے اطلاع کرتا ہوں۔ تب موسیٰ کے سسرے نے اس کو کہا کہ تو اچھا کام نہیں کرتا تو یقیناً ماندہ ہو جائے گا تو بھی اور یہ گردہ بھی جو تیرے ساتھ ہے۔ کیونکہ یہ کام تجھ پر نہ پڑتا ہے۔ تو اکیلا اس کو کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب میرا کہا مان۔ میں تجھے صلاح دیتا ہوں اور خدا تیرے ساتھ رہے۔ تو ان لوگوں کے پاس خدا کی جگہ ہو اور ان کا سب احوال خدا سے عرض کیا کر۔ اور تُو رسوم اور شریعت کی باتیں انہیں سکھلا۔ اور وہ راہ جس پر چلنا اور وہ کام جسے کرنا انہیں فرض ہے انہیں بتا سو تو ان لوگوں میں اعتباری لوگ بنیں لے جو خدا ترس اور سچے انسان ہوں لاہی نہ ہوں اور انہیں ہزاروں اور سینکڑوں اور پچاس اور دس دس پر حاکم کر دے کہ وہ لوگوں کی ہر وقت عدالت کریں۔ اور یوں ہو کہ وہ ہر ایک بڑا مقدمہ تجھ پاس لائیں۔ ہر ہر ایک چھوٹا مقدمہ وہ فیصلہ کریں کہ یہ تیرے لئے کچھ آسان ہو گا اور وہ بوجھ اٹھانے میں تیرے شریک ہوں گے۔ اگر تو یہ کام کرے گا اور خدا تجھے یوں حکم کرے تو تو کام پر قائم رہ سکے گا اور یہ لوگ بھی اپنی اپنی جگہ سلامت جائیں گے۔ چنانچہ موسیٰ نے اپنے سسرے کا کہا سنا اور سب جو اس نے کہا تھا کیا اور موسیٰ نے سب اسرائیلیوں میں سے اعتباری لوگ چنے اور انہیں لوگوں کا سردار ہزاروں کا سردار سینکڑوں کا سردار پچاس پچاس کا سردار اور دس دس کا سردار کیا۔ وہ لوگوں کا ہر وقت انصاف کرتے تھے۔ مشکل مسئلے موسیٰ پاس لاتے تھے پر چھوٹے مقدمے آپ ہی فیصلہ کرتے تھے۔

یہ بھادہ ماحول جس نے ان نوجوانوں میں عقابی نگاہ پیدا کرنی تھی۔  
بنتی ہے سیاہاں میں فاروقی و کزازی

**طریق شاہبازی** قوم کے نوجوان اس آسمانی ماحول میں تربیت حاصل کر کے پروان چڑھتے گئے۔ شاہیں بچوں کی عقابی روحیں بیدار ہوئیں۔ سابقہ نسل کی برف کی سلیں موت کی حرارت سے پگھل پگھل کر آسودہ خاک ہو گئیں۔ اب اس تدبیر ربانی کی پختگی کی منازل قریب آئی شروع ہوئیں جس کے متعلق شروع میں کہا گیا تھا کہ

وَسُرِّدُوا أَنْ تَمُوتَ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا فِي الْأَرْضِ وَتَجْعَلَهُمْ  
أَيِّمَةً وَتَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۖ وَتُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ  
نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝

(۲۸/۴-۵)

اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں ملک میں کمزور بنادیا گیا تھا اور انہیں  
انحاک کی اس پستی سے اٹھا کر قوموں کا (امام بنائیں اور انہیں (مصر کی متعلقہ زمینوں کا) وارث  
بنائیں اور انہیں ممکن فی الارض کریں اور فرعون اور ہامان اور ان کے جنود (و عسا کر) کو وہ کچھ  
دکھائیں جس سے وہ ڈر کرتے تھے۔

اب نوجوانوں کا یہ سیلاب اُمڈ اور فلسطین کے میدانوں پر چھا گیا۔ یہ تمام علاقے، حکومت فرعون کے  
باجگزار تھے۔ اس لئے وہ قوم جسے اہل مصر نے صدیوں تک اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑے رکھا تھا، اب ان  
کے خزان و دفائن اور ملک و سلطنت کی وارث بن گئی۔

فَاَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَ عَيْوُنٍ ۖ وَ كُنُوزٍ وَ مَقَامِرٍ كَرِيمٍ ۖ كَذٰلِكَ  
وَ اَوْدَعْنَاهَا بَنِي إِسْرٰءِيْلَ ۖ

(۵۷-۵۹/۲۴)

سو ہم نے (اہل فرعون کو) ان کے باغوں اور چشموں اور خزان اور باعزت مکانوں سے نکال  
دیا اور اس طرح ان سب کا وارث بنی اسرائیل کو بنادیا۔

جس سرزمین کے متعلق چالیس سال پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہارے نام کچھ دی گئی ہے اس کا "انتقال"

اب ہوا۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ مشروط تھا قوم کی مجاہدانہ سعی و عمل اور جاں فردشانہ استقامت کے ساتھ۔

وَاَوَدُّنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضَعِفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا  
الَّتِيْ بَرَكْنَا فِيْهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ  
بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَكَمَرْنَا مَا مَكَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ ۚ وَمَا كَانُوْا  
يُغَيِّرُ شَيْئًا ۝ (۱۳۷/۷۷)

اور جس قوم کو حق و کمزور خیال کرتے تھے، اسی کو ملک کے تمام مشرق کا اور اس کے مغربی  
حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا اور اس طرح اسے پیغمبرِ اکبر  
پر دروگاہ کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) مجھے  
رہتے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لئے) جو کچھ بنانا رہا تھا اور جو کچھ  
(عمار توں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کر دیں!

جو افسردہ قوم اس وقت مخاطب تھے جب یہ وعدہ کیا گیا تھا، نہ ان کے ایمان میں پچھگی تھی نہ عمل میں  
استقامت اس لئے وہ اس ارض مقدس کے وارث کیسے بن سکتے تھے؟ وراثت ارض کے لئے ایمانِ محکم  
اور عملِ پیہم کی ضرورت تھی۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیٰمَةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا قَطْرًا وَكَانُوْا  
بَاٰلِئِنَّا يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۲۴۲/۱۳۷)

اور (بنی اسرائیل میں) سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی راہنمائی کرتے تھے (اور)  
یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے استقامت دکھائی اور وہ ہماری آیات پر یقین (محکم) رکھتے تھے۔

**دورِ عروج و سیادت** | اب بنی اسرائیل کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اب ہر نیا دن عروج  
و بلندی کا آفتاب تازہ ساتھ لیکر نمودار ہوتا تھا۔ جدھر ان کا قدم اٹھتا،  
فتح و ظفر قدم چومتی، شوکت و سطوت، قوت و شہمت، اقوامِ عالم پر فیصلت اور پھر کتاب و نبوت غرضیکہ  
دین و دنیا کی کونسی نعمت تھی جو ان پر سایہ فگن نہ تھی۔ یہ تھی جماعتِ مومنین کی صحیح زندگی۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْ اِسْرٰٓءِيْلَ مَبْوَاً صَدَقَیْ ۚ وَرَزَقْنٰهُمْ

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ج (۱۰/۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنے وعدہ کے مطابق فلسطین میں) اپنے کاہنیت اچھا ٹھکانہ دیا تھا اور پاکیزہ چیزوں سے ان کی روزی کا سامان کر دیا تھا۔  
سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَءِیْلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ صَ ... (۱۴/۱۰۴)  
اور ہم نے اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل سے کہا تھا ”اب اس سرزمین میں (فارغ البال ہو کر) بسو (تمہارے لئے کوئی کھٹکا نہیں رہا)۔

حکومت بھی اور نبوت بھی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَءِیْلَ الْكِتَابَ وَ الْحُكْمَ وَ النَّبُوَّةَ وَ رَزَقْنَاهُمْ  
مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ه (۴۵/۱۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکم و نبوت عطا کئے اور انہیں طیبیت سے رزق دیا اور انہیں اقوام عالم پر فضیلت عنایت فرمائی۔

علم بھی اور فضیلت بھی۔

وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمِ عَلٰی الْعَالَمِينَ ه (۴۴/۳۲)

اور ہم نے انہیں علم (و بصیرت) کی بنا پر اقوام عالم پر برگزیدہ کیا۔

مومن کا صحیح مقام، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

مومن بالائے ہر بالاترے

غیرست او برنتابد ہمسرے

اس لئے انہیں ان کی ہم عصر جماعتوں پر افضلیت عطا کی۔

**مقام برتری** لِبَنِي إِسْرَءِیْلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

وَ أَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ه (۲/۱۳۲ نیز ۲/۴۷)

اے بنی اسرائیل میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا اور (خصوصاً) یہ (نعمت) کہ دنیا کی قوموں پر تمہیں فضیلت دی تھی۔

اس قوم نے اس سرزمین پر صدیوں تک حکومت کی اور نہایت شان و شوکت اور دبہہ و طنطنہ سے حکومت کی۔ انہی میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ نبی اور صاحبِ سطوت و شوکت حکمران پیدا ہوئے۔ اس زرین داستان کی یہ کڑیاں اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جس قوم کے بچپن (آغاز) اور جوانی (عروج) کی تصویریں ہم نے دیکھ لی ہیں بہتر ہے کہ اس کے بڑھاپے (زوال) اور موت کے نقشے بھی ساتھ ہی سامنے آجائیں تاکہ یہ حقیقت نمایاں طور پر واضح ہو جائے کہ قوانینِ الہیہ کا اتباع کیا نتائج مرتب کرتا ہے اور ان سے انحراف کے عواقب کیا ہوتے ہیں؟

## باب سوم

### ..... طاؤس و رباب آخر

تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے مواب کی سرزمین میں (۱۴۰ سال کی عمر میں) وفات پائی۔ (دیکھئے استثناء ۵/۳۴)

لے حضرت ہارون کی وفات اس سے پیشتر ہو چکی تھی (دیکھئے گنتی ۲۸/۲۰) کہا یہ جاتا ہے کہ فلسطین کی فتح حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قرآن کریم نے اس سے بحث نہیں کی اس لئے ہم نے بھی اس حصہ کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ آپ کے سامنے لپی ہو یا بعد میں کھینتی ہر حال میں آپ ہی کی تھی۔

لے قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کی وفات کے متعلق کچھ ذکر نہیں کیا۔ لیکن اسرائیلیات کے اثر کے ماتحت ہماری کتب و اہانت اس باب میں بھی عجیب و غریب چیزیں پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف کی حسب ذیل روایت اس پر شاہد ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ملک الموت کو حضرت موسیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ ملک الموت نے جا کر کہا کہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرو موسیٰ نے ملک الموت کی آنکھ پر گھونہ مارا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ فرشتہ موت خدا تعالیٰ کے پاس واپس گیا اور عرض کیا، الہی تُو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو مرنا نہیں چاہتا۔ خدا نے ملک الموت کو (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

**خلافت موسیٰ** | آپ کے بعد حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے دیکھئے (شروع ۲۴)۔  
قرآن کریم میں حضرت الیسع کا نام زمرہ انبیائے کرام میں آیا ہے (دیکھئے ۲۸/۲۸، ۲۹/۲۹)۔

یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس سے حضرت یوشع بن نون مراد ہیں یا تورات کے یسعیاہ۔ بہر حال ان کے عہد میں فلسطین کا بہت سا اور علاقہ بھی فتح ہوا۔ ہمیں چونکہ بنی اسرائیل کی تاریخی جزئیات کا استقصا مقصود نہیں، بلکہ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اس قوم کے رفیع الشان عروج کے بعد، عبرت انگیز زوال کن عیوب و نقائص کی بنا پر ہوا۔ اس لئے ہم ان تفصیل سے درگزر کرتے ہیں۔ حضرت یوشعؑ کے بعد ایک عرصہ تک بنی اسرائیل کا نظام کچھ جمہوری سا رہا۔ اس عہد کو "قاضیوں کا عہد" کہا جاتا ہے۔ تاآنکہ ق۔م کے قریب ان کے کمانڈر حضرت طاوت (ساؤل) مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر BREASTED جس کی "تاریخ مصر" کا ذکر پہلے آچکا ہے، نے لکھا ہے کہ فرعون مصر کے بیسویں اور اکیسویں خاندان کے زمانہ میں بنی اسرائیل نے (حضرت) طاوت اور داؤد کی زیر سرکردگی فلسطینیوں پر پورا غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ دوسری طرف اس زمانہ میں فرعون مصر کی سلطنت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ (ص ۲۲۵) قرآن کریم میں حضرت طاوت کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

**جناب طاوت** | اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلِكِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِیْلَ مِنْ بَعْدِ  
مُوسٰی اِذْ قَالُوْا لِبَنٰی لَهُمْ اَبْعَثْ لَنَا صٰلِحًا

تُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ..... وَ اَمَلُّهُ عَلَیْہُمْ بِالظَّالِمِیْنَ ۝ (۲/۲۴۶)

(اے پیغمبر! کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا تھا)

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) دوبارہ آنکھ عطا فرمادی اور ارشاد فرمایا کہ واپس جا کر اس سے کہو کہ اگر تو زندگی چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ بیل کی پشت پر رکھ۔ جس قدر بال تیرے ہاتھ کے نیچے آجائیں اتنے ہی سال کی تیری عمر ہوگی (ملک الموت نے) جا کر خدا کا حکم موسیٰ تک پہنچا دیا) موسیٰ نے کہا اس کے بعد کیا ہوگا۔ خدا نے تعالیٰ نے فرمایا، موت۔ حضرت موسیٰ نے کہا پھر ابھی سی..... (بخاری جلد دوم)..... صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ ایک اسرائیلی روایت ہے جو کتب حدیث میں جگہ پاگئی ہے۔ لیکن چونکہ اسے امام بخاری نے نقل کر دیا ہے اس لئے اب کسی کو ہمت نہیں پڑتی کہ اسے وضعی قرار دیدے۔ اس لئے کہ معیار صحت و قیام سلسلہ اسناد قرار پا چکا ہے نہ کہ متن (یعنی مضمون)۔



بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ ہمارے لئے ایک کمانڈر مقرر کر دو۔ نبی نے کہا (مجھے اُمید نہیں کہ تم ایسا کر سکو) اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا، تو کچھ بعید نہیں کہ تم لڑنے سے انکار کر دو۔ سرداروں نے کہا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہو چکے ہیں؟ لیکن پھر دیکھو، جب ایسا ہوا کہ انہیں جنگ کا حکم دیا گیا (اور اس کا تمام سرد سامان کر دیا گیا) تو ان کی ساری گرم جوشیاں ٹھنڈی پڑ گئیں (اور) ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے پیٹھ دکھلا دی اور اللہ نافرمانوں کے دلوں کے کھوٹ) سے ناواقف نہیں (وہ جانتا ہے کہ کون عزم و عمل کے دعووں میں سچے ہیں اور کون کے دل ایمان و حق پرستی سے خالی ہیں)۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے طاوت کو ان پر کمانڈر مقرر کیا ہے۔ لیکن یہ اس پر اس بنا پر معترض ہوئے کہ یہ کسی امیر گھرانے کا فرد نہیں۔ اسے کمانڈر کس طرح بنا دیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ قیادت و سیادت کے لئے دولت و جہ انتخاب نہیں، اس کا معیار کچھ اور ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا.....

.... وَاللَّهُ يُؤْتِي مُنْكَهَ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (۲/۲۴۷)

اور پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا، اللہ نے تمہارے لئے طاوت کو بہ حیثیت کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ (سو اس کی اطاعت کرو اور اس کے ماتحت جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جب سرداروں نے یہ بات سنی، تو بجائے اس کے کہ اپنی فرماں برداری سے استعداد کار کا ثبوت دیتے، لگے طاوت کے انتخاب پر طرح طرح کے اعتراض کرنے) انہوں نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُسے ہم پر اقتدار مل جائے، حالانکہ اس سے کہیں زیادہ صاحب اقتدار ہونے کے ہم خود حق دار ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت کچھ نہیں۔ نبی نے یہ سن کر کہا (قیادت کی اہلیت کا جو معیار تم نے سمجھ رکھا ہے، یہ تمہارے جہل و خود پرستی کا گھڑا ہوا معیار ہے۔ اللہ کا ٹھہرایا ہوا معیار نہیں) اللہ نے تو طاوت ہی کو (حکمرانی کی قابلیتوں کے لحاظ سے، تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت، دونوں میں اُسے وسعت دی ہے) یعنی

دماغی اور جسمانی دونوں طرح کی فضیلت رکھتا ہے اور یہی دو فضیلتیں قائد اور صاحب اقتدار کے لئے اصلی فضیلتیں ہیں نہ کہ مال و جاہ اور نسل و خاندان کے امتیازات) اور قیادت تمہارے دیدینے سے کسی کو مل نہیں سکتی۔ یہ تو اسی کو ملتی ہے جسے اللہ نے اس کی صلاحیت دیدی ہے) ان صلاحیتوں کے ساتھ جو بھی اسے حاصل کرنا چاہے اسے یہ دیدی جاتی ہے۔ اللہ بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

غور فرمائیے! کسی قوم کی قیادت و سیادت کے لئے قرآن کریم نے کیسی محکم خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے جسم اور دماغ دونوں کے اعتبار سے اصلح افراد ہوں یا اقوام، حکمرانی کے لئے یہ خصوصیتیں لاینفک ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:-

اہل حق را زندگی از قوت است      قوت ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں      قوت بے رائے جہل است و جنوں

**شرط انتخاب** جناب طاوت کے انتخاب سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ قانون خداوندی کی رو سے (خواہ وہ آج سے تین ہزار سال پیشتر نازل ہوا تھا یا آج ہم میں موجود ہے) قیادت و حکمرانی کے لئے جو ہر ذاتی ہی وجہ تخصیص ہے، نہ کہ نسلی امتیاز۔ جب قیادت اور اس میں تبدیل ہو جاتی ہے (یعنی بیٹے کو محض بیٹا ہونے کی بنا پر وارثت تخت حکومت قرار دے دیا جاتا ہے) تو ملکیت کی لعنت، نوع انسانی کے حسین چہرہ کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسلام اسی لعنت کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔

قصہ جناب طاوت کی باقی کڑیاں قرآن کریم میں یوں وارد ہوئی ہیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ع (۲/۲۴۸)

اور پھر ان کے نبی نے کہا (تم طاوت کے استحقاق قیادت پر اعتراض کرتے تھے، تو دیکھو) اس کی (اہلیت) حکومت کی نشانی یہ ہے کہ (مقدس) تابوت (جو تم کھوپچے ہو اور دشمن کے ہاتھ پڑ چکا ہے) تمہارے پاس (واپس) آ جائے گا اور (حکمت الہی سے ایسا ہو گا کہ) فرشتے

اسے اٹھالائیں گے، اُس تابوت میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے الفتح و کامرانی کی دل جمعی ہے اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرنے (اپنی مقدس) یادگاریں چھوڑ گئے ہیں ان کا بقیہ ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو، تو یقیناً اس واقعہ میں تمہارے لئے بڑی ہی نشانی ہے۔

چنانچہ جناب طاوت اپنے لشکر کو لے کر فلسطینیوں کی طرف بڑھے اور قوم کے ضبط و انضباط (discipline) کا امتحان لینے کے لئے حکم دیا کہ راستہ میں ایک ندی پڑتی ہے اس سے کوئی شخص پانی نہ پیئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قوم میں اب ضبط نفس اور اطاعت کے جوہر مفقود ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی شجاعت و بسالت میں بھی افسردگی آرہی تھی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ ..... وَ اللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (۲/۲۳۹)

پھر جب ایسا ہوا کہ طاوت نے لشکر کے ساتھ کوچ کیا، تو اس نے کہا، دیکھو! راہ میں ایک ندی پڑے گی، اس سے مقصود خداوندی یہ ہے کہ تمہارے ضبط و اطاعت کی صلاحیتوں کی نمود کا موقع ہم پہنچ جائے۔ پس یاد رکھو، جس کسی نے اس ندی کا پانی پیا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ میری جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ میرا ساتھی وہی ہوگا جو اس کے پانی کا مزہ تک نہ چکھے۔ ہاں اگر کوئی آدمی (بہت ہی مجبور ہو اور) اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے اور پی لے، تو اس کا مضائقہ نہیں۔

لیکن (جب لشکر ندی پر پہنچا، تو) ایک قلیل تعداد کے سوا سب نے پانی پی لیا (او)

۱۔ آیت قرآنی کا یہ ترجمہ الفاظ کے حقیقی معانی کے مطابق ہے۔ اگر ”تابوت سکینہ“ کا مجازی مفہوم لیا جائے، تو اس سے مراد ہوگی ”قلب مطمئن“ اسی مفہوم کی رو سے بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ حضرت طاوت کے ہاتھ جو فتح نصیب ہوگی اس کا سب سے اہم فائدہ ہوگا کہ تم جو اس وقت اس قدر خائف اور ہراساں رہتے ہو، اس کی جگہ تمہیں سکون اور اطمینان میسر آجائے گا اور تم ان تعلیمات کے وارث بن جاؤ گے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے متبعین نے چھوڑی ہیں۔

صبر و اطاعت کی آزمائش میں پورے نہ اترے۔

پھر جب طاوت اور اُس کے ساتھ وہ لوگ جو (حکم الہی پر سچا) ایمان رکھتے تھے، ندی کے پار اترے، تو ان لوگوں نے (جنہوں نے طاوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی) کہا، ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آج جاوت سے (جو فلسطینیوں کے لشکر کا ایک دیوہیکل سردار تھا) اور اس کی فوج سے مقابلہ کر سکیں! لیکن وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، پکار اُٹھے (تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت سے ہراساں کیوں ہوئے جاتے ہو؟) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر قانونِ خداوندی کے مطابق غالب آئیں اور اللہ استقامت رکھنے والوں کا ساتھی ہے۔

**معیارِ فتح و ظفر** | اس آیتِ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے فتح و ظفر کا ایک اور عظیم نشان رازِ بیاں فرمایا ہے، یعنی دنیا میں کثرت و قلت، معیارِ فتح و شکست نہیں، بلکہ افراد کا ذاتی جوہر (نمودِ خودی) معیارِ حقیقی ہے۔ تھوڑی سی جماعت، جو ایمانِ محکم اور عملِ یتیم کی قوتوں سے مسلح ہو، بہت بڑی بھیڑ (CROWD) پر نہایت آسانی سے غالب آسکتی ہے۔ تاریخِ عالم کے صفحات پر ایک پچھلتی سی نگاہ ڈالئے، ہر موقع میں آپ کو اس حقیقتِ باہرہ کے خط و خال اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ نگاہوں کے سامنے واضح مقصدِ دل میں اس مقصد کی صداقت کا یقین اور اس کے حصول کی تڑپ، پاؤں میں استقامت، بازوؤں میں قوت، بڑھتی ہوئی ہمتیں اور اُٹھتے ہوئے قدم۔

جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

**حسین دُعائیں** | جاوت کی فوجوں کے ساتھ جنابِ طاوت کا مقابلہ ہوا۔ میدانِ مبارزت میں آئے تو بدرگاہِ رب العزت دُعائیں مانگی گئیں کہ

رَبَّنَا أَخْرِغْ عَلَيْنَا صُلْبًا ۚ ثَبَّتْ آمَنًا ۚ وَ الْصُّرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (۲/۲۵۰)

اے پروردگار! تو دیکھ رہا ہے کہ ہم تھوڑے ہیں اور مقابلہ ان سے ہے جو تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ پس ہم (تشنگانِ عزیمت) پر استقامت (کے جام) انڈیل دے! (کہ عزم و ثبات سے سیراب ہو جائیں) اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جمادے (کہ کسی حال میں بھی پیچھے نہ ہٹیں)۔

اور پھر (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کرے کہ سرخینِ حق کے گردہ پر فتنہ ہو جائیں!  
ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ کونسی قوت تھی جو جناب طاوت کو شکست دے سکتی تھی۔

فَهَزَمُوهُمْ بِأَذْنِ اللَّهِ نَفَثَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَ اللَّهُ  
الْمَلِكُ وَالْحُكْمَةُ وَ عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۚ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللَّهِ  
الْمَنَاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ ۚ وَ لَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ  
عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ٢٥١ (۲/۲۵۱)

چنانچہ انہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی اور داؤدؑ کے  
ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے بادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور (حکمرانی اور  
دانشوری کی باتوں میں سے) جو کچھ سکھانا تھا، سکھلادیا اور (اس طرح ایک گردہ قلیل کے صبر  
ثبات نے بنی اسرائیل کو ان کی گرتی ہوئی حالت سے نکال کر عظمت و اقبال کے عروج پر  
پہنچا دیا) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گردہ کے ذریعہ دوسرے  
گردہ کو راستے سے ہٹاتا رہتا تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔ (اور امن و عدالت کا نام و نشان باقی نہ  
رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ذرا اس آیت کے آخری حصہ پر غور فرمائیے۔ قوانینِ الہیہ کے تحت شمشیرِ زنی کی علتِ غائی بنے پیام  
ہو کر سامنے آجائے گی۔ یعنی جماعتِ مومنین (حزبِ اللہ) صرف اس مقصدِ عظیم کے لئے شمشیرِ کھف  
میدانِ جہاد میں آتی ہے کہ دنیا سے فساد مٹ جائے اور کمزوروں پر کوئی ظلم نہ کر سکے (تفصیل ان حقائق  
کی اپنے مقام پر آئے گی۔

قرآنِ کریم نے جس مقام پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہاں دکھانا صرف یہ مقصود تھا کہ بنی اسرائیل  
میں اب اجتماعی عیوب پیدا ہونے شروع ہو چکے تھے۔ اس لئے اس نے اس واقعہ کے دوسرے گوشوں

لے حضرت داؤد اس وقت ابھی اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں تھے اور جناب طاوت کے زیرِ کمان، جالوت کے  
مقابلہ کے لئے میدان میں نکلے تھے۔

کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ تورات کی کتاب سموئیل اول میں جو تفصیل مذکور ہیں وہ غور طلب میں لکھا ہے۔

اور جب فلسطینیوں نے سُننا کہ بنی اسرائیل مصفاۃ میں فراہم ہوئے ہیں تو ان کے قطب بنی اسرائیل کے مقابل چڑھ آئے۔ سو بنی اسرائیل یہ سُن کے فلسطینیوں سے ڈرے اور بنی اسرائیل نے سموئیل کو کہا کہ چپکامت ہو پر خداوند ہمارے خدا کو پکارا کرنا تاکہ وہ ہم کو فلسطینیوں کے ہاتھ سے بچائے۔ سموئیل نے بھیڑ کا بیج لے کے اور اسے کل سوختنی قربانی کر کے خداوند کو گزارا اور سموئیل بنی اسرائیل کے لئے خداوند کے حضور چلایا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزارنا تھا تو فلسطینی جنگ کے لئے اسرائیل کے مقابل نزدیک آئے۔ تب خداوند فلسطینیوں کے اوپر اسی دن بڑی کڑک سے گرجا اور انہیں پریشان کیا اور انہوں نے بنی اسرائیل سے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاۃ سے نکل کر فلسطینیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں لڑتے چلے گئے۔ تب سموئیل نے ایک پتھر لے کے اسے مصفاۃ اور شین کے بچوں پہ پھینک دیا اور اس کا نام ابن عزرا رکھا اور بولا کہ یہاں تک خداوند نے ہماری مدد کی بسو فلسطینی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی زمین میں پھر نہ آئے اور خداوند کا ہاتھ سموئیل کے سب دونوں میں فلسطینیوں کے مخالف تھا۔ وہ بستیاں جو فلسطینیوں نے اسرائیل سے لے لی تھیں، عقرون سے لے کے جات تک اسرائیل کے قبضہ میں پھر آئیں اور اسرائیل نے ان کی لواحق بھی فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑائی اور اسرائیل اور امویوں میں صلح ہوئی، (سموئیل ۱: ۱۵-۴)..... سموئیل ۲: ۲۲-۱۱ اور ایسا ہوا کہ جب سموئیل بوڑھا ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو مقرر کیا کہ اسرائیل کی عدالت کریں اور اسکے پلوٹھے کا نام یوآیل تھا اور اس کے دوسرے بیٹے کا نام ابیاہ۔ وہ دونوں سیر سبع میں قاضی تھے۔ پر اسکے بیٹے اس کی راہ پر نہ چلے بلکہ نفع کی پیروی کرتے اور رشوت لیتے اور عدالت میں طرفداری کرتے تھے۔ تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کے رامہ میں سموئیل پاس آئے اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔

لیکن وہ کلام جوا انہوں نے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ کر جو قائم ہو، سموئیل کی نظروں میں بُرا

معلوم ہوا۔ سموئیل نے خداوند سے دعا مانگی اور خداوند نے سموئیل کو فرمایا کہ لوگوں کی آواز پر اور ان ساری باتوں پر جو وہ تجھے کہیں کان نہ دھر کہ انہوں نے تجھ کو حقیر نہیں کیا بلکہ مجھ کو حقیر کیا ہے کہ میں ان پر سلطنت نہ کروں۔ مطابق ان سب کاموں کے جو انہوں نے اس دن سے کہ میں نہیں مصر سے نکال لایا اس روز تک مجھ سے کیا کہ مجھے ترک کیا اور دوسرے معبودوں کی بندگی کی ویسا ہی وہ تجھ سے کرتے ہیں۔ سو تو ان کی بات سن تو بھی ان پر گواہی دے کے انہیں خوب جتا دے اور انہیں بتلا کہ جو بادشاہ ان پر سلطنت کرے گا اس کے عمل کس طور کے ہوں گے اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی ساری باتیں کہیں۔ اور اس نے کہا کہ اس بادشاہ کے جو تم پر سلطنت کرے گا اس طرح کے عمل ہوں گے کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کے اپنے لئے اور اپنی گاڑیوں کے لئے اور اپنے ساتھ سوار ہونے کے لئے نوکر رکھے گا اور ان میں سے بعضے اس کی گاڑی کے آگے دوڑیں گے اور اپنے لئے ہزار ہزار کے رسالدار اور پچاس پچاس کے جمہدار بنائے گا اور ان سے بل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لئے جنگ کے ہتھیار اور اپنی گاڑیوں کے ساز بنوائے گا اور تمہاری بیٹیوں کو لے گا تاکہ وہ علوان باور چن اور ان بان ہوں اور تمہارے کھیتوں اور تمہارے تاکستانوں اور تمہارے زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے گا اور اپنے خدمت گزاروں کو بخش دے گا اور تمہارے کھیتوں اور انگوری باغوں کا دسواں حصہ لے کے اپنے خوجوں اور اپنے غلاموں کو دے گا اور تمہارے چاکروں اور تمہاری لونڈیوں اور تمہارے اچھے اچھے شکیل جوانوں کو اور تمہارے گدھوں کو لے گا اور اپنے کام پر لگایگا۔ اور تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام ہو گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب جسے تم نے اپنے لئے چنا ہے فریاد کرو گے پر اُس دن خداوند تمہاری نہ سنے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات سننے سے انکار کیا اور کہا نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقتدر ہو تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی کرے اور سموئیل نے لوگوں کی ساری باتیں سنیں اور انہیں خداوند کے کانوں تک پہنچایا اور خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو ان کی بات سن اور ان کے لئے ایک بادشاہ مقرر کر تب سموئیل نے اسرائیل کے لوگوں کو کہا کہ ہر ایک اپنی

(سموئیل اول ۷/۱۵ — ۸/۲۲)

اپنی بستی کو جائے۔

اس کے بعد لکھا ہے۔

اور جب تم نے دیکھا کہ نبی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا ہاں میں ایک بادشاہ چاہیئے جو ہم پر سلطنت کرے حالانکہ خداوند خدا تمہارا بادشاہ تھا۔ اب دیکھو یہ تمہارا بادشاہ ہے جسے تم نے چن لیا اور جس کے تم مشتاق تھے اور دیکھو خداوند نے تمہارے اوپر بادشاہ مقرر کیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے رہو گے اور اس کی بندگی کرو گے اور اس کا حکم مانو گے اور خداوند کے فرماؤں سے سرکشی نہ کرو گے تو تم اور بادشاہ جو تم پر بادشاہی کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو ہو گے تو خیر پرا اگر تم خداوند کی بانہ مانو گے اور خداوند کے فرماؤں سے سرکشی کرو گے تو خداوند کا ہاتھ تمہارے مخالف ہو گا جس طرح کہ تمہارے باپ دادوں کا مخالف تھا۔

سواب تم کھڑے رہو اور دیکھو وہ بڑا ہوا جو خداوند تمہاری آنکھوں کے سامنے کرے گا۔ کیا آج گیبوں کاٹنے کا دن نہیں؟ میں خداوند سے منت کر دوں گا کہ بادل گرے اور پانی برسے، تاکہ تم جانو اور دیکھو کہ تم نے خداوند کے حضور ایک بادشاہ کے مانگنے سے بڑی شرارت کی چنانچہ سموئیل نے خداوند سے منت کی اور خداوند کی طرف سے اسی دن بادل گرچ کر آیا اور پانی برساتا خداوند سے اور سموئیل سے نیٹ ڈر گئے۔ تب سب لوگوں نے سموئیل سے کہا کہ اپنے خادموں کے لئے خداوند اپنے خدا کی منت کر ہم مر نہ جائیں کہ ہم نے اپنے سارے گناہوں پر یہ شرارت زیادہ کی کہ اپنے لئے ایک بادشاہ مانگا۔

تب سموئیل نے لوگوں کو کہا، خوف نہ کرو کہ یہ سب شرارت تو تم نے کی مگر خداوند کی بیروی سے کنارہ کشی مت کرو۔ بلکہ اپنے سارے دلوں سے خداوند کی بندگی کرو اور تم کنارہ کشی نہ کرنا کہ ہل کی بیروی کرو جو مفید نہ ہوگی اور رہائی نہ دے گی کہ وہ سب باطل ہیں۔ کیونکہ خداوند اپنے بڑے نام کے لئے اپنے لوگوں کو ترک نہ کریگا کہ خداوند کی مرضی ہوئی کہ تم اس کی قوم ٹھہرو اور میں جو ہوں تو ہرگز نہ ہو کہ تمہارے لئے دعا مانگنے سے باز آ کے خداوند کا گنہگار ہوؤں۔ بلکہ میں وہ راہ جو اچھی اور سیدھی ہے تمہیں بتاؤں گا۔ (سموئیل اول ۱۲ — ۱۲/۲۳)



جناب طاہوت کے بعد حضرت داؤدؑ اور ان کے بعد حضرت سلیمانؑ بادشاہ ہوئے۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوج کمال کا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ بیت المقدس کے ہیکل (مسجد) کی تعمیر اسی عہد میں ہوئی (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) لیکن اس کے بعد ان میں انحطاط کے آثار شروع ہو گئے۔ مصر کی زندگی میں ان میں وہ خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو محکومی کی زندگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ باز آفرینی کی صلاحیت موجود تھی۔ اب وہ برائیاں پیدا ہوئیں جو قوت و دولت کے غلط استعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں، سرکشی، عدوان، معصیت کوشی، فتنہ و فساد، قتلِ انبیاء، قوانینِ الہیہ کی جگہ انسانی قوانین کی ترویج، تحریفِ کتاب، علماء و مشائخ (احبار و رہبان) کا "روحانی تسلط" (برہمنیت) جو قوموں کے شجرِ حیات پر امرِ بیل کی طرح چھا جاتا ہے اور زندگی کے تمام جوہر سوجس لیتا ہے، تشنّت و افراق، تحریب و تشیع، باہمی رقابتیں، خانہ جنگی، نظری مسائل پر بحث و تھپس، چند عقائد و رسوم کو ذریعہ نجات سمجھ کر عمل سے بیگانگی، اپنے آپ کو اللہ کی جیستی قوم تصور کر کے اقوامِ عالم پر (محض نسلی تفوق کی بنا پر) افضلیت کا زعمِ باطل۔ نتیجہ یہ کہ وہی قوم جس نے فرعون جیسی قوتِ قاہرہ سے نجات حاصل کر کے صدیوں تک اپنی حکومت کا بے غل و غش سکہ چلایا تھا اور جو کبھی تمام اقوامِ عالم میں ممتاز و سرفراز بھی جاتی تھی، کبھی اہلِ بابل کی تاخت و تاراج کی آماجگاہ بنی، کبھی ایرانیوں کی غلامی میں پھنسی، کبھی رومیوں کی محکومیت کا طوقِ لعنت پہنا، ایں سوراںہ و آں سوراںہ۔ اور یہ سب اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ الہیہ سے منہ موڑا اور اس عظیم الشان نعمت کی حفاظت نہ کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر رزاں فرمائی تھی۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو  
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فکر کی نگہبانی

**دو بربادیاں** | یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ (البتہ اس کے بعد مسلمانوں کے زوال نے انہیں بھی مات کو دیا ہے) قرآنِ کریم نے ان دو

لے یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ اس کے لئے عنوان زیرِ نظر کے اخیر میں ہامان کے تحت دیکھئے۔

مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔ بلا جرم سزا نہیں ملی تھی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِ فِي الْكِتَابِ لُتُقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ  
وَلَتَعْلَقَ عُلوًّا كَبِيرًا ۝ (۱۴/۴)

اور دو دیکھو ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں صحیفہ برتیاہ اور حزقیل میں بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ یہی وہ تباہیاں ہیں جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَآءِ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَ عِيسَى ابْنِ  
مَرْيَمَ ۚ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ (۵/۸۸)

(چنانچہ دیکھو) بنی اسرائیل میں سے جو لوگ (حق سے منکر ہوئے تھے) وہ (پہلے) داؤد اور (پھر) مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبانی لعنت کئے گئے اور یہ اس لئے ہوا کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے گزر گئے تھے۔

ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بنوکد نصر (بخت نصر) کے ہاتھوں ظہور  
**بخت نصر کا حملہ** میں آئی جس میں ۵۹۹ ق م میں 'یشولم کی (جو یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز

لے لعنت کے معنی انعام خداوندی سے محرومی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تباہی کے متعلق بنجیل متی (۲۳/۲۸) اور لوقا (۱۲/۲۴) اور زبور میں اشارات موجود ہیں۔ لوقا میں تو کھلے کھلے الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے جہاں قوموں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے اس سے مفہوم صرف یہ نہیں کہ وہ قومیں صفحہ ارض سے مٹا دی گئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض قوموں کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ وہ توادب ارضی و سماوی سےٹ ہی گئیں۔ لیکن قوموں کی ہلاکت کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ قرآن کی رو سے وہ قومیں جن پر محکومی اور محتاجی کا رسوا کن عذاب مسلط ہوتا ہے ہلاک شدگان میں شمار کی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی طبعی زندگی باقی ہوتی ہے یعنی ان کے افراد سانس لینے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ لیکن ان کی انسانی زندگی ختم ہو چکی ہوتی ہے اور یہ وہ عذاب ہے جو یکسر شادی نے والے عذاب ہے کہیں شدید ہے۔



دانیال، ججی اور عزیز بنی (میں سے کسی ایک) کی سفارش پر ان کی امداد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ہیکل کی تعمیر ۵۲۰ ق. م میں شروع ہو کر ۵۱۵ ق. م میں تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد آوارہ وطن یہودی، پھر سے اپنی اُجڑی ہوئی بستیوں میں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے اور یوں ان کی مڑوہ جماعت نے قریب ایک صدی کے انقلاب کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کی (دیکھئے عزرا ۱/۲ و ۱/۵ و ۶) قرآن کریم میں ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ  
وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيزًا ۝ (۱۷/۴)

پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کر دی اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور تمہیں (پھر) ایسا بنا دیا کہ بڑے حقّے والے ہو گئے۔

ملت یہودیہ کی موت اور باز آفرینی کی یہی داستان ہے جسے تورات میں حزقیل نبی کے خواب کے استعارہ میں بیان کیا گیا ہے۔

خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھالیا اور اس وادی میں جو ٹیلوں سے بھر پور تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس جو گرد پھرایا اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بہت تھیں اور دیکھ وہ نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیاں تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں تمہارے اندر روح داخل کروں گا اور تم جیو گی اور تم پر نسین پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش ہوئی اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسین اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہو گئی۔ پھر ان میں روح نہ تھی تب اس نے مجھے کہا کہ نبوت کرتے ہو اسے نبوت

کر لے آدمزاد اور ہواسے کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ اے سانس تو چاروں ہواؤں میں سے آ اور ان مقتولوں پر کھونک کہ وہ جنیں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور ان میں روح آئی اور وہ جی اٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ایک نہایت بڑا شکر تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدمزاد یہ ہڈیاں سارے اہل اسرائیل ہیں، دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگو! میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا اور اے میرے لوگو! جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا تب جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم جیو گے اور میں تم کو تمہاری سرزمین میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ مجھ خداوند نے کہا اور پورا کیا۔ (حزقیل ایل ۱-۱۴/۳۷)

بنی اسرائیل کے "موت و حیات" کے اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے سورۃ بقرہ میں تشبیہی انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

اَذْكَلْنِي مَرًّا عَلَىٰ قَرْيَةٍ ۖ وَهِيَ خَادِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا ۚ قَالَ  
اٰتٰنِي هٰذَا اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ..... فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ  
اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲/۸۵۹)

اور پھر اسی طرح اس شخص کی حالت پر بھی غور کرو جو ایک ایسی بستی پر سے گزرا تھا جس کے مکانوں کی چھتیں گر چکی تھیں اور گری ہوئی چھتوں پر درو دیوار کا ڈھیر تھا۔ (یہ حال دیکھ کر) وہ بول اٹھا، جس بستی کی ویرانی کا یہ حال ہے، کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ سے موت کے بعد (دوبارہ) زندہ کر دے؟ (یعنی دوبارہ آباد کر دے)۔

پھر ایسا ہوا کہ اللہ نے اسے سو برس تک موت کی حالت میں رکھا۔ اس کے بعد اسے اٹھادیا اور پوچھا، کتنی دیر اس حالت میں رہے؟ عرض کیا، ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ ارشاد ہوا نہیں، بلکہ سو برس تک۔ پس اپنے کھانے اور پانی پر نظر ڈالو، ان میں برسوں تک پڑے رہنے کی کوئی علامت نہیں (یعنی ان میں کوئی ایسا تغیر نہیں ہوا ہے جس سے

معلوم ہو کہ بڑی مدت ان پر گزر چکی ہے) اور (اپنی سواری کے) گدھے پر بھی نظر ڈالو (کہ وہ کس حالت میں ہے؟) اور (یہ جو کچھ کیا گیا سو) اس لئے کیا گیا تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (حق کی) ایک نشانی ٹھہرائیں (اور تمہارا علم ان کے لئے یقین و بصیرت کا ذریعہ ہو) اور تم جنین کی حالت پر غور کرو۔ کس طرح ہم (اس کا ڈھانچہ بنا کر) کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر (کس طرح) اس (ڈھانچے) پر گوشت (کا غلاف) پڑھا دیتے ہیں (کہ ایک مکمل اور متشکل ہستی ظہور میں آجاتی ہے؟) پس جب اس شخص پر یہ حقیقت کھل گئی تو وہ بول اُٹھا میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں بلاشبہ اللہ ہر بات پر قادر ہے!

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نیچ زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ اہل فارس کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی سکندر نے (۳۳۲ ق.م میں) اس پر ضرب کاری لگائی۔ ان کا شیرازہ پھر منتشر ہونے لگا۔ پھر ۳۳۲ ق.م میں بطلمیوس (PTOLEMY) نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ ۶۶ ق.م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جس کا ذکر صحیفہ یہودی میں اور جس کے آثار ان کی مشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ یہ تباہی رومیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی۔

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ إِلَىٰ نَفْسِكُمْ تَفَ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ  
وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ  
أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتَجَيَّرُونَ (۱۴/۴)

اگر تم نے اچھے کام کئے، تو اپنے ہی لئے کئے اور اگر برا کیاں کیں، تو بھی اپنے ہی لئے کیں پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا (تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تاکہ (مار مار کر) وہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیں اور اسی طرح (ہیکل کی) مسجد میں داخل ہو جائیں، جس طرح پہلی دفعہ حملہ آور گئے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں۔

پامپئی (رومی) بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب (۱۳,۰۰۰) یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر ۷۰ ق.م کے قریب ایک اور یورش میں قریب (۳۰,۰۰۰) یہودی غلام بنائے گئے اور ڈھو

ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔ فطرت کی طرف سے انہیں اپنی باز آفرینی کا ایک آخری موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے سکھ میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس سوختہ جنت قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔

عبرتے اے سلم روشن ضمیر      از مال اُمتِ موسیٰ بگیر

داد چوں آں قوم مرکزِ رازِ دست      رشتہ جمعیتِ ملت شکست

قوم را ربط و نظام از مرکزے      روزگارِ شش را دوام از مرکزے

**جرائم کی فہرست** | اب دیکھئے کہ ان پر اس ذلت و خواری بے کسی و بے بسی، نکتہ داد بار غلامی و محکومی، ذل و مسکنت کا عذاب کن جرائم کی پاداش میں مسلط ہوا، قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ان جرائم کا ذکر آیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے عہدِ رسالت تک ان سے سرزد ہوتے چلے آ رہے تھے۔ ان جرائم کی فہرست طویل ہے۔ لیکن اصل جرم صرف ایک ہی ہے یعنی قوانینِ الہیہ سے سرتابی۔ باقی سب اسی اصل کی شاخیں یا اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَدَّنَ مِنْ بَعْضِ

ذَلِكَ ۖ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝ (۵/۴۳)

”اور ان کے پاس تو رات ہے جس میں اللہ کا فیصلہ ہے، لیکن یہ اس کے بعد پھر جالتے ہیں اور یہ مومن نہیں۔“ پیغامِ خداوندی کا اشیاع تو کجا، ان کی قسادتِ قلبی کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انبیاء تک کو قتل کر دیا کرتے تھے (دیکھئے ۲/۸۷، ۵/۷۰، ۴/۱۵۵)۔

لے یہود کے قتلِ انبیاء کا ذکر بائبل کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے ان کی تباہی و بربادی کا بہت بڑا سبب اسی جرمِ عظیم کو قرار دیا ہے۔ فرمایا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریبو! تم پر افسوس ہے کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے

آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون

میں ان کے شریک نہ ہوتے اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

”قتلِ انبیاء“ کے بعد ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ وہ کبھی عہد کی پابندی نہیں کرتے تھے۔  
 اَدَّ كُلُّمَا عَهْدًا دَا عَهْدًا نَبَذَ ۚ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ طَبَلُ الْاَثَرِ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۲/۱۰۰)

اور یہ لوگ جو آج دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں تو غور کرو! اس سے پہلے ان لوگوں کی روش کیسی رہ چکی ہے؟ جب کبھی ان لوگوں نے عہد کیا، تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور سچائی پس پشت ڈال دیا اور یہ یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دل سچے ایمان سے خالی ہیں!

**ثواب کا ایک عجیب کام** | فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تاشف انگیزیہ کہ باہمی خونریزیوں تک اُتر آیا کرتے تھے، آپس میں جنگ و جدال کرتے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو نکال باہر کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ستم ظریفی یہ کہ قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑانے میں ثواب بھی سمجھتے، یعنی ان کے نزدیک نیکی اور بدی کے دو الگ الگ شعبے تھے، ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق۔ جیسے آپ نے دیکھا ہو گا کہ انسانوں کا خون چوسنے والے، مویشیوں کے پانی پینے کے استھان بنواتے اور کیڑے مکوڑوں کے لئے خوراک کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اپنیوں کو گھروں سے نکال دینا اور جب وہ یوں دھڑ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) فرزند ہیں بغرض اپنے باپ دادوں کا بیمانہ بھردو۔ اے سانپو، اے افی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو! میں نبیوں اور دانائوں اور فقیہوں کو تہاے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کر دے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنے جہاؤ خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بھر ستاتے پھرو گے تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریاہ کے خون تک جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے انہیں سنگسار کرتی ہے! کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کریتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لوگوں کو جمع کروں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔ (متی ۲۹-۲۳/۲۴)

۱۷ تقسیم ہند سے پہلے آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہندو اس قسم کے ”پٹن“ (ثواب) کے کام کیا کرتے تھے۔



کی قید میں گرفتار ہو جائیں تو انہیں فدیہ دے کر چھڑالینا اور سمجھ لینا کہ یہ بڑے ثواب کا کام ہے، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے درخت کو جڑ سے کاٹ دینا اور اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا کسی تو ضیح کا محتاج نہیں۔ خود ہم بھی آج یہی کچھ کرتے ہیں۔ ایک طرف غلط نظام کی ترویج سے قوم کی مفلسی و محتاجی کے اسباب پیدا کرنے میں مدد معاد بنا اور دوسری طرف صدقات و زکوٰۃ سے محتاجوں اور مفلسوں کی مدد کرنا "اسی قبیل کا" ثواب ہے بنی اسرائیل کے متعلق سورۃ بقرہ میں ہے۔

لَمَّا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ ..... وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ  
إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ \* ذَا مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۲/۸۵)

تم وہ قوم ہو جس کے افراد ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف جھگڑا بندی کر کے اسے اس کے وطن سے نکال باہر کرتا ہے اور تم میں سے کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں آتی کہ اس بارے میں خدا کی شریعت کے احکام کیا ہیں؟ لیکن پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تمہارے جلا وطن کئے ہوئے آدمی دشمنوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں اور قیدی ہو کر تمہارے سامنے آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہیں (اور کہتے ہو، شریعت کی رو سے ایسا کرنا ضروری ہے) حالانکہ اگر شریعت کے حکموں کا تمہیں اتنا ہی پاس ہے، تو شریعت کی رو سے تو یہی بات حرام تھی کہ انہیں ان کے گھروں اور بستیوں سے جلا وطن کر دو (اور ان کے خلاف ظلم و معصیت سے جھگڑا بندی کر دو۔ پھر یہ گمراہی کی کیسی انتہا ہے کہ قیدیوں کے چھڑانے اور ان کے فدیہ کے لئے مال جمع کرنے میں تو شریعت یاد آ جاتی ہے لیکن اس ظلم و معصیت کے وقت یاد نہیں آتی جس کی وجہ

لے یہ آیت جلیلہ ایک عظیم الشان حقیقت کی حامل ہے جس سے یہ راز بے نقاب ہو جاتا ہے کہ آج مسلمان اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہے؟ کسی غیر خدائی نظام میں قرآنی نظام کی بعض جزئیات کا بیوند لگا کر سمجھ لینا کہ یہ روش زندگی دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کا باعث ہے سب سے بڑا دھوکا ہے۔ تو مومن ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کا طرز عمل دنیا و آخرت کی کامیابی نہیں، بلکہ دونوں میں ردیابی کا موجب ہے۔ "خزى فى الحیوة الدنیا و یوم القیمة یردّون الی اشدّ العذاب" لیکن اس کی تفصیل اس جگہ نہیں اپنے مقام پر آئے گی (انشار اللہ)۔

وہ دشمنوں کے ہاتھ پڑے اور قید ہوئے؟ کیا یہ اس لئے ہے کہ کتاب الہی کے ایک حصہ پر تم ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ یاد رکھو تم میں سے جن لوگوں کے اعمال کا یہ حال ہے، اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب! یاد رکھو اللہ کا قانون جزا و سزا تمہارے اعمال کی طرف سے غافل نہیں ہے۔

ایک اور بڑی لعنت یہ تھی کہ ان کی سوسائٹی میں عیوب اس قدر عام ہو چکے تھے کہ کوئی شخص کسی کو بد عملی سے روکتا ہی نہیں تھا۔ جب کسی سوسائٹی کی حالت یہ ہو جائے کہ بُرائی پر ملامت کرنے والا کوئی نہ رہے تو اس قوم کے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہا کرتی۔ وہ جس بُرائی میں ایک مرتبہ پڑ جائے اس سے پھر باز ہی نہیں آ سکتی۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۖ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۵/۴۹) نیز (۵/۴۳)

وہ برائیوں میں (ایک مرتبہ) پڑ جاتے تو پھر اس سے باز نہیں آتے۔ یہ بجائے خویش بہت بڑی برائی تھی جو وہ کیا کرتے تھے۔

برائیوں سے روکنے کے بجائے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ سود خوار تھے اور حرام خور۔

فَيُظْلِمُونَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّت لَهُمْ وَ لَ يَصَدِّقَهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ وَ أَخَذَ لَهُمُ السَّرَّاءُ وَ قَدْ نُهُوا عَنْهُ وَ آكَلَهُمْ أَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۖ وَ أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۱۴۰-۱۴۱/۴۱)

الغرض یہودیوں کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے (کئی ایک) اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لئے حلال تھیں اور نیز اس وجہ سے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے۔ نیز ان کی یہ بات کہ رب بولے لے لگے، حالانکہ اس سے روک دیئے گئے تھے اور یہ کہ ناجائز طریقوں پر لوگوں کا مال کھانے لگے، حالانکہ انہیں ہر حال میں اور ہر انسان کے ساتھ راستی اور نیکی برتنے کا حکم دیا گیا تھا، اور (یاد رکھو) ان میں جو لوگ (اس طرح احکام حق کے) منکر ہو گئے، تو ہم نے ان کے لئے (پاداشِ عمل میں) عذاب دردناک تیار کر رکھا ہے!

سورۃ مائدہ میں ہے۔

سَمْعُونَ لَكِنْ بَلَّغُوا آخِلُونَ لِلشَّعْبِ ط (۵/۴۲)

یہ لوگ جھوٹ کے لئے کان لگانے والے اور بُرے طریقوں سے مال کھانے میں مبالغہ میں۔

حتیٰ کہ دین فروش بھی۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا  
الْأَوَّلِيِّ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا..... وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ  
يَشْكُرُونَ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۷/۱۶۹)۔

پھر ان لوگوں کے بعد ناخلفوں نے ان کی جگہ پائی اور کتاب الہی کے وارث ہوئے۔ وہ (دین  
فروشی کر کے) اس دنیا کے حقیر کی متاع ابلے تامل اے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسکی توہین معافی  
مل ہی جائے گی۔ اور اگر کوئی متاع انہیں اس طرح (فروین ثانی سے) ہاتھ آجائے، تو اسے بھی  
بلاتامل لے لیں۔ کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات  
نہ کہیں مگر وہی جو سچ ہو اور جو کچھ کتاب میں حکم دیا گیا ہے، وہ پڑھ نہیں چکے ہیں؟ جو متقی  
ہیں ان کے لئے تو آخرت کا گھر (دنیا اور دنیا کی خواہشوں سے) کہیں بہتر ہے (وہ دنیا کے لئے  
اپنی آخرت تاراج کرنے والے نہیں۔ اے علمائے یہود!) کیا اتنی سی بات بھی تمہاری عقل  
میں نہیں آتی؟

طبائع کی مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ تھوڑا سا ضبط نفس بھی ان پر گراں گزرتا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ سبت کے  
دن شکار نہ کریں۔ لیکن یہ مختلف حیلوں سے اس حکم سے سربانی کرتے۔

وَسَأَلَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ  
فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَاعًا وَيَوْمَ لَا

لے سبت ان کے لئے دراصل تعطیل کا دن تھا۔ لیکن اس کے تقدس کے لئے تورات میں (حسب معمول) عجیب سی توہین  
بیان ہوئی ہے۔ خروج ۲۰/۱۱ میں ہے۔

کیونکہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین، دریا اور سب کچھ جو ان میں ہے بنایا اور ساتویں دن  
آرام کیا۔ اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ (خروج ۲۰/۱۱)

لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَلِكَ ۚ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْفُسُونَ ۝ (۷۴/۱۴۳)

اور بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے۔ سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آ جاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں۔ وہ سبت کے ضابطہ کو علی الرغم توڑ کر مچھلیاں پکڑ لیتے اور اس طرح قانون سے سرکشی اختیار کرتے جس کا نتیجہ تب ہی تھا۔

ہفتہ میں ایک دن کے کاروباری ناغہ کی بنیاد معاشی تھی اور چونکہ اس نے ایک قسم کے بین القبائلی قانون کی حیثیت اختیار کر لی تھی اس لئے اس کا احترام ضروری قرار دیا گیا تھا۔ لیکن مفاد پرستانہ ذہنیت اس قسم کے قوانین کی خلاف ورزی میں اپنی منفعت دیکھتی ہے۔ جو شخص اس دن دکان کھلی رکھے جب غام مارکیٹ بند ہو تو اس کے ہاں یقیناً گاہکی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس معروف قانون کی خلاف ورزی سے جو معاشی نظام میں نقص پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ بہر حال، یہ بات ضمناً سامنے آگئی ہے۔ اب پھر اسی سلسلہ کی طرف لوٹئے۔ یہود کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ خدا کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں کے توڑنے میں اس قدر بے ہاک تھے۔ لیکن خود ساختہ پابندیوں پر بڑی سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ اللہ کی راہ سے بھٹکنے والی ہر قوم کی یہی حالت

**انسانی قوانین کا اتباع** | ہوتی ہے کہ وہ قوانین الہیہ کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور خود ساختہ رسومات پر شریعت کا لیل لگا کر انہیں بڑی شدت سے مانتی اور

منواتی ہے۔ یہ قوانین ان کے اجبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی طرف سے وضع ہوتے تھے اور قوم قوانین خداوندی کی جگہ انسانوں کے انہی قوانین و ضوابط کا اتباع کرتی تھی۔ یہی وہ شرک تھا جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ

اَتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (۹/۳۱)

انہوں نے اللہ سے درمے ہی اپنے اجبار و رہبان کو اپنا رب بنالیا۔

اور خود اجبار و رہبان کی حالت یہ تھی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُونَ  
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ

يَكْنُزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تَجْزِيهِمْ  
بِعَذَابِ الْيَوْمِ ۝ (۹/۳۴)

مسلمانو! یاد رکھو! یہودیوں اور عیسائیوں کے ہا علماء و مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق و ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں اور جو لوگ پابندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے، تو ایسے لوگوں کو عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دو۔

حالت تو یہ تھی، لیکن چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا ان کی تعریف کرے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ  
يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازٍ مِنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۳/۱۸۴)  
(اسے پیغمبر!) جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں کے لئے سراہے جائیں جو انہوں نے کبھی نہیں کئے، تو تم ہرگز ایسا نہ سمجھنا کہ وہ (آنے والے) عذاب سے بچے رہیں گے۔  
نہیں، یقیناً ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی جھوٹی تعریف و ستائش حاصل کرنے کے لئے انہیں کس قسم کی نماشوں اور جیلہ جویوں سے کام لینا ہوتا ہوگا؟

کسی قوم کی اجتماعیت اور مرکزیت کے برباد ہونے کا سب سے بڑا سبب اس کے باہمی اختلافات ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات کو رفع کر کے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دے لیکن اگر کوئی قوم کتاب اللہ العلم کے باوجود اختلاف پر اتر آئے تو ان کی ہلاکت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ہر مٹنے والی قوم کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ نئی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَآءِئِيلَ مُبَوَّأً صَدِيقٍ وَرَرْنَا عَنْهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ  
فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّى جَاءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۰/۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو (اپنے وعدہ کے مطابق) فلسطین میں (بسنے کا بہت اچھا ٹھکانا دیا تھا)

اور پاکیزہ چیزوں سے ان کی روزی کا سامان کر دیا تھا۔ پھر جب کبھی انہوں نے (دینِ حق کے بارے میں) اختلاف کیا، تو علم کی روشنی ضرور ان پر نمودار ہو گئی (یعنی ان میں یکے بعد دیگرے نبی مبعوث ہوتے رہے)۔ یوم مکافات کو تمہارا پروردگار ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرتا رہے گا، جن میں باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔

**ضد کی بنا پر اختلافات** | یہ اختلافات کسی اصول پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ باہمی ضد اور تعصب کی بنا پر ہوتے ہیں۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً مِمَّا خَلَقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ  
الْعِلْمُ ۚ بَعَثْنَا بَيْنَهُمْ ۖ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا  
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۳۵/۱۷)

اور ہم نے نبی اسرائیل کو امرِ حق کی کھلی کھلی نشانیاں دے دی تھیں مگر پھر بھی انہوں نے محض باہمی ضد اور عداوت کی بنا پر (دینِ حق کے بارے میں) اس کے بعد اختلاف کیا جب کہ علم کی روشنی ان پر نمودار ہو چکی تھی (یعنی سلسلہٴ رشد و ہدایت مسلسل جاری رہا لیکن پھر بھی وہ متفق نہ ہوئے) یوم مکافات کو تمہارا پروردگار ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہتے تھے۔

ان اختلافات کے رفع کرنے کی بجائے اس کے اور کوئی صورت نہیں ہوتی کہ انسان اپنے تمام رجحاناتِ قلبی و ذہنی اور خود ساختہ معتقدات و نظریات کو الگ رکھ کر کتابِ اللہ کی طرف لوٹ آئے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا) کتابِ اللہ کا مقصد اختلافات کو دور کرنا ہوتا ہے۔ لیکن جو قوم کتابِ اللہ کو محض ”حصولِ ثواب“ کی خاطر الگ رکھ چھوڑے اور اپنی زندگی انسانوں کے وضع کردہ آئین و دستور کے مطابق چلائے تو اس کے اختلافات کس طرح مٹ سکتے ہیں؟ یہود نے کتابِ اللہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئیگا۔ لیکن اتنا تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے باہمی ضد سے اختلافات پیدا کر رکھے تھے اور پیغامِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اپنے علماء و مشائخ کی وضع کردہ شریعت کو عین دین سمجھ رکھا تھا۔ یہی ان کی تباہی کا موجب تھا۔ ان علماء و مشائخ کی حالت یہ تھی کہ کتابِ اللہ کی صاف اور سیدھی تعلیم کو عملی مسائلِ حیات میں راہِ نمابنانے کے بجائے لفظی مناظروں اور مباحثوں میں الجھ کر ”انبار در انبار کتبِ دینیہ“ تصنیف

کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی کا نام ”دین کی خدمت“ تھا۔ یہ دینی خدمت ایسے ہی ہے جیسے (قرآن کریم) کی بیان کردہ مثال کے مطابق کسی گدھے پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے اور وہ دعویٰ کرتا پھرے کہ دین میری ہی وجہ سے قائم ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ  
أَسْفَارًا ۚ يَتَّبِعُ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ لَا  
يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ٥ (٢٢/٥)

اور دیکھو ان لوگوں کی مثال جو تورات کے حامل کہلاتے ہیں مگر اس کے احکام اور شرائع پر عمل نہیں کرتے، اس گدھے جیسی مثال ہے جو (بڑی بڑی کتابیں .. .. . اپنی پشت پر) لادے ہوئے ہو۔ کیسی بُری مثال ہے ان لوگوں کی جو اللہ کے احکام اور احکام کے متعلق آیات کو جھٹلاتے رہتے ہیں اور (یاد رکھو) خدا نافرمان لوگوں کو کبھی (سیدھی) راہ نہیں دکھایا کرتا (کہ یہی اس کا قانون ہے)۔

پیٹھ پر کتابوں کا پشت تارہ اور عملی زندگی، انسانیت سے گری ہوئی، کتنا فرق ہے لفظی اور عمل میں بقول علامہ اقبالؒ

قلندہ جزد و حرفِ لا اللہ کچھ بھی نہیں کہتا

فقیہ شہزادوں بے لغت ہائے حجازی کا

**باہمی تکذیب و تنقیص** | باہمی اختلافات کے علاوہ، ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی ساری قوتیں اپنی تعمیر کے بجائے دوسروں کی تخریب و تکذیب میں صرف کرتے تھے۔ یہودی اور نصاریٰ

در اصل ایک ہی اصل کی دو شاخیں تھیں۔ لیکن یہ دونوں آپس میں ہمیشہ مصروفِ پیکار رہتے تھے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ كُنْتُمْ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَ قَالَتِ النَّصَارَىٰ

كُنْتُمْ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَ هُمْ يَسْتَلُونُ الْكِتَابَ ..... (٢/١١٣)

یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا دین کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔

حالانکہ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ ان کے پاس خدا کی کتاب ہے۔

ایک دوسرے کی تکذیب و تنقیص کرتے تھے اور خود دونوں ایک ہی قسم کے شرک میں مبتلا تھے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَ قَالَتِ النَّصَارَى النَّسِیْمُ ابْنُ اللَّهِ ۖ  
ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۖ  
قَاتِلْهُمْ اللَّهُ نَجَّى آتِي يَكُونُونَ ۝ (۹/۳۰)

اور یہودیوں نے کہا، عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی باتیں ہیں، غرض ان کی زبان سے نکالی ہوئی (اور نہ سمجھ بوجھ کر کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتا)۔ ان لوگوں نے بھی انہی کی سی بات کہی جو ان سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ ان پر اللہ کی مار! یہ کہہ کر بھٹکے جا رہے ہیں۔

**نجات بلا اعمال** دنیا میدان سعی و عمل ہے یہاں زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں (قانون خداوندی کے مطابق) زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ تنازع البقاء (Struggle for existence) یہاں کے ذرہ ذرہ کا شیوہ زندگی ہے۔ لیکن جس قوم میں قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیتی ہے کہ نہیں کسی جدوجہد اور تگ و تار کی ضرورت نہیں۔ وہ خدا کی جہیتی قوم ہے۔ نہ ان پر کوئی مصیبت آ سکتی ہے نہ عذاب طاری ہو سکتا ہے۔ ان کی فلاح و سعادت کے لئے یہ کافی ضمانت ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا نام رکھتے ہیں اور خاص تر اش خراش کا لباس پہنتے ہیں۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ اور کی ضرورت نہیں۔ وہ خود فریبی کی اس جنتِ الممقنا میں آنکھیں بند کر کے پڑے رہتے ہیں اور کبھی اتنا دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ فطرت کے اس قانون کے ماتحت وہ کس طرح ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے تک جا پہنچے ہیں۔ یہی حالت یہود کی ہو چکی تھی ان کا ادعا یہ تھا کہ نَحْنُ آبْنَاءُ اللَّهِ وَ أَحِبَّاءُ ۖ (۵/۱۸) ”ہم اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں“ اس لئے ان کا زعمِ باطل یہ تھا کہ انہیں دنیا کی ذلت و خواری تو ایک طرف، عاقبت میں بھی (سوائے چند دنوں کے جو ان کے عقیدہ کے مطابق وہ چالیس دن تھے جن میں انہوں نے گویا سالہ پرستی کی تھی یا دوسرے اقوال کے مطابق گیارہ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عرصہ) عذاب چھو نہیں سکتا۔

وَقَالُوا لَنْ نَمْسَنَ النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۖ قُلْ أَتَخَذُونَ



عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَكَ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ  
مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۸۰)

یہ لوگ (یعنی یہودی) کہتے ہیں: جہنم کی آگ ہمیں کبھی چھونے والی نہیں (کیونکہ ہماری اُمت خدا کے نزدیک نجات یافتہ اُمت ہے) مگر ہم آگ میں ڈالے جائیں گے تو (اس لئے نہیں کہ عیشہ عذاب میں رہیں، بلکہ) صرف چند دنوں کے لئے۔ ان لوگوں سے کہہ دو: یہ بات جو تم کہتے ہو (دو حالتوں سے خالی نہیں: یا تو) تم نے خدا سے (غیر مشروط) نجات کا کوئی پتہ لکھوالیا ہے کہ اب وہ اس کے خلاف جا نہیں سکتا اور یا پھر تم خدا کے نام پر ایک ایسا بہتان باندھ رہے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم (یا سند) نہیں!

وہ تو بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے اور کہتے کہ جنت کے واحد مالک **جنت کے واحد مالک** ہم ہی ہیں۔ ہمارے علاوہ کوئی دوسرا جنت میں جا ہی

نہیں سکتا!

وَقَالُوا كُنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ۖ مِثْلِكَ  
أَمَانِيَّتُهُمْ ۖ قُلْ هَآؤُنَا بُرْهَانُكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۲/۱۱۱)

اور یہودی کہتے ہیں: جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں: جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ عیسائی نہ ہو (گویا جنت انہی کے باپ دادا کی میراث یا جاگیر ہے۔ اے پیغمبر!) یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں اور آرزوئیں ہیں، نہ کہ حقیقت حال ہے۔ تم ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو، تو ثابت کرو، تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟

اپنی نجات کے متعلق انہوں نے عجیب و غریب عقائد وضع کر لئے تھے۔ ان کی مقدس کتاب، تالمود میں ہے کہ

نے جنت کیونکر اتباع قرآن سے مشروط ہے اور اس میں اور یہود و نصاریٰ کے مذکورہ صدر دعوے میں کیا فرق ہے، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی

آخرت میں (حضرت) ابراہیم جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کے ختنہ کی کھال اتار کر جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے مقام ختنہ پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر جہنم میں (چند دنوں کے لئے) بھیج دیں گے۔ (تالمود ص ۴۷۷)

لیکن ان اسرائیلیوں پر جہنم کی آگ بالکل اثر نہیں کرے گی۔ ان کا جہنم میں داخلہ محض ایک رسم (formality) پورا کرنے کے لئے ہوگا۔

جہنم کی آگ کا اسرائیلی گناہ گاروں پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۶۵)

اور اس کی وجہ حیونش انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھی ہے۔

اسرائیلی گناہ گاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازہ پر گناہوں کا

اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

ان بیانات میں باہمی تضاد بھی ہے۔ لیکن نفس عقیدہ قابل غور ہے۔ پھر محض اخروی نجات ہی کے لئے نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دنیاوی زندگی میں سرفرازی و سر بلندی کے لئے بھی ذاتی سعی و عمل کی ضرورت سمجھتے تھے۔ حیونش انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ یہود کے عقیدہ کے مطابق

بعض کو عزت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کے آنے والی

نسلوں کے اعمال کے صدقہ میں۔ (جلد ششم ص ۱۷)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ ”یہودیوں کی اُمیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیم ہمارے جدِ امجد ہیں۔“ اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس میں مذکور ہے کہ ”یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں نجات و سعادت آجائے گی۔“ (ج ۱۱/۱۴۴)

اندھی تقلید | جب زندگی سے متعلق تصورات اس قسم کے قائم ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ پھر تلاشِ حقیقت کی کوئی ٹرپ سینہ میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ لوگ ہدایت کی کوئی ضرورت ہی

نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اسلاف کی اندھی تقلید میں جس روش پر چلے جا رہے تھے اسی کو صراطِ مستقیم سمجھتے تھے اُس لئے اس پر کبھی غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کرتے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ تو لیں کہ جس راہ پر چلے جا رہے ہیں وہ نجات و سعادت کی راہ ہے یا بربادی و تباہی کا راستہ۔ اسی لئے وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل پر کسی پیغام یا نصیحت کا کوئی اثر ہی نہیں ہو سکتا! اور اثر ہوتا بھی کس طرح؟ اثر تو اس پر ہوتا ہے جو اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ

(۲/۸۸ نیز ۴/۱۵۵)

اور (یہ لوگ اپنے جمود اور بے حسی کی حالت پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے دل تہ در تہ غلافوں میں لپیٹے ہوئے ہیں) یعنی اب کسی نئی بات کا اثر ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ یہ اعتقاد کی بختگی اور حق کا ثبات نہیں ہے جو قابلِ تعریف ہو بلکہ انکارِ حق کے تعصب کی پھٹکار ہے کہ حق بات سننے اور اثر پذیر ہونے کی استعداد ہی معدوم ہو گئی اور اسی لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعوتِ حق سنیں اور قبول کریں۔

اسی بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰ کی حیاتِ بخش دعوت کو ٹھکرا دیا۔ اور اس سے آگے بڑھے تو قرآنِ کریم کے انقلابِ آفریں پیغام کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے زعمِ باطل میں اس قدر مست تھے کہ وہ اپنی روش کو حق و باطل کے معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ لَا وَكَانُوا  
مِّنْ قَبْلُ يَسْتَفْضُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا  
كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (۲/۸۹)

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لئے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی مصدق تھی جو ان کے انبیاء کو ملی تھی، تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ظہور کے منتظر تھے اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دلائل مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی، تو صاف انکار کر گئے (اور اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی) پس ان لوگوں کے لئے جو دیدہ و دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں،

اللہ کی طرف سے محرومی ہے (اور اس کا قانون یہی ہے کہ ایسوں پر فلاح و سعادت کی راہ بھی نہیں کھلتی!)۔

حالانکہ قرآن کریم انہیں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہارا زعم باطل ہے۔ دنیا میں کوئی قوم جیتی نہیں ہو سکتی۔  
 وَ قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا ۚ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ  
 قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنْ ظُلُمَاتٍ إِلَىٰ نُورٍ ۚ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَوْلَآ أَخْرَجَهُمُ اللَّهُ مِنْ ظُلُمَاتٍ إِلَىٰ نُورٍ ۚ لَآ هُمْ يَخْشَوْنَ ۝ (۲/۱۷۳-۱۷۴)

اور یہودی کہتے ہیں، جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہودی نہ ہو اور اسی طرح عیسائی کہتے ہیں، جنت میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا جب تک عیسائی نہ ہو (گویا جنت انہی کے باپ دادا کی میراث یا جاگیر ہے، اسے پیغمبر! یہ ان لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں اور آرزوئیں ہیں نہ کہ حقیقت حال ہے۔ تم ان سے کہو، اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو تو ثابت کرو۔ تمہارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی راہ تمام بنی نوع انسان کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ جس کسی نے بھی قوانین خداوندی کے سامنے تسلیم خم کر دیا اور اس نے حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کی تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائے گا۔ نہ تو اس کے لئے کسی طرح کا ٹھکانہ نہ کسی طرح کی غمگینی! اس اصول کی وضاحت کے بعد ان سے کہا گیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں واقعی آخرت میں عذاب نہیں چھو سکتا (اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ آخرت کی زندگی جس میں عذاب نہ ہو موجودہ زندگی سے بدرجہا اچھی ہے) تو پھر موت کے تصور تک سے تمہاری جان کیوں جاتی ہے؟ ایسی محبوب زندگی کی تو تمنا کرنی چاہیے!

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَُّوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۲/۹۴)

(یہ لوگ کہتے ہیں کہ جنت صرف انہی کے حصہ میں آئی ہے) تم ان سے کہو، اگر آخرت کا گھر خدا کے نزدیک صرف تمہارے ہی لئے ہے اور کسی انسان کا اس میں حصہ نہیں اور تم اپنے اس اعتقاد میں

لے یہ قوانین اپنی اصلی شکل میں قرآن کریم کے اندر ہیں۔

سچے ہو، تو تمہیں دنیا کی جگہ آخرت کا طلبگار ہونا چاہیئے۔ پس بے خوف ہو کر موت کی آرزو کرو۔  
اس کے ساتھ ہی فرمادیا کہ

وَلَنْ يَخْتَنُوهُ آبَدًا ۖ بِمَا قَدَّمَتْ آيِدِيهِمْ ؕ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ (۲/۹۵)  
اور اسے پیغمبر اتم دیکھ لو گے کہ یہ لوگ اپنی بد عملیوں کی وجہ سے جس کا ذخیرہ جمع کر چکے ہیں، کبھی ایسا کرنے والے نہیں اور اللہ ظلم کرنے والوں کو ابھی طرح جانتا ہے۔

جن لوگوں پر دنیاوی محبت اس درجہ غالب آچکی ہو وہ موت کی تمنا کس طرح کر سکتے ہیں؟  
وَلْيَحْذَرُوا النَّاسَ عَلَىٰ حَيَاتِهِمْ ۖ وَ مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ يَوْمَ أَحَدُهُمْ نُوَّ يَعْمُرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۖ وَ مَا هُوَ بِمُرَحِّحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعْمَرَ ؕ وَ اللَّهُ بِصِغِيرَاتٍ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۹۶) نیز (۲/۸۶)  
اور پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ تم دیکھو گے 'زندگی کی سب سے زیادہ حرص رکھنے والے یہی لوگ ہیں، مشرکوں سے بھی زیادہ (ان مدعیانِ توحید کے دلوں میں دنیاوی مفاد کا عشق ہے) ان میں سے ایک ایک آدمی کا دل یہ حسرت رکھتا ہے کہ کاش ایک ہزار برس تک توجہ نہ؛ حالانکہ (یہ لوگ کتنے ہی زیادہ عرصہ تک جتیں، بہر حال ایک دن مرنا ضرور ہے اور) عمر کی درازی انہیں عذابِ آخرت سے نجات نہیں دلا دے گی، اور جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔

ان پر تو موت کی ہیبت اس طرح چھا جاتی ہے کہ اس کے تصور سے ان کی روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ موت ایک ایسا یقینی حادثہ ہے جسے واقع ہو کر رہنا ہے۔

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ  
عِلْمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۖ فَيُنْذِرُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۲/۸)  
(ان سے) کہو کہ وہ موت جس سے تم (یوں) بھاگتے ہو، ایک دن آکر رہے گی۔ پھر تم اس خدا کی طرف جاؤ گے جو غیب و حاضر کا جاننے والا ہے (اس کی طرف اس لئے لوٹو گے کہ) وہ تمہیں بتا دے جو کچھ تم کیا

لے اسی کو ۶-۷ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے ان آیات میں ایک عظیم الشان اصول کو واضح کیا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ۔

کرتے تھے۔

لیکن یہ تو صرف مومن کی شان ہے کہ

چو مرگ آید، تبسم بر لبِ دوست

ایسی قومیں، جو اپنی خودی کو متاعِ دنیاوی کے عوض بیچ چکی ہوں (دیکھئے ۲/۸۶) ان میں یہ جرأت کہاں کہ موت کا استقبال عروسی شان سے کریں۔ یہود کی تو یہ حالت ہو چکی تھی کہ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ  
فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا فَهُمْ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ  
عَلَى النَّاسِ وَلَئِنْ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ (۲/۲۴۳)

(اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کی سرگزشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور بادیہ وجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، مگر دلوں کی بے طاقتی کا یہ حال تھا کہ موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے؟) (یعنی بادیہ کثرتِ تعداد کے) انہوں نے حملہ آور دشمن کا مقابلہ نہیں کیا تھا اور اپنا گھربار چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تھی، جب ان بزدلوں نے ایسا کیا تو اللہ کا حکم ہوا (تم موت کے ڈر سے بھاگ رہے ہو، تو دیکھو) اب تمہارے لئے موت ہی ہے۔ (یعنی ان کی بزدلی کی وجہ سے دشمن ان پر غالب آگئے اور زندگی و کامرانی کی برکتوں سے محروم ہو گئے) لیکن جب انہوں نے راز کو پالیا کہ زندہ رہی رہتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا تو ان میں ہمت پیدا ہو گئی (اودہ دشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور فتح ہوئے) یقیناً اللہ انسان کے لئے بڑا ہی فضل و بخشش رکھنے والا ہے لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) اکثر آدمی ایسے ہیں جو ناشکری کرنے والے ہیں!

یہ بھی حالت، اس قوم کی جو رفعت و بلندی کی قابلِ رشک زندگی کے بعد ذلت و پستی کے عبرت انگیز عذاب میں مبتلا کی گئی۔ مبتلا کیا کی گئی ان کے اعمال خود ذلت و پستی کا عذاب بن کر ان پر مستط ہو گئے۔

**محکومی کا عذاب** | یہ عذاب کیا تھا؟ غلامی اور محکومی کا عذاب، وہ عذاب جس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھے، محکومی! ہزار لعنت کی ایک لعنت اور لاکھ بدبختیوں کی ایک بدبختی، نہ صرف مجبوری کی غلامی، بلکہ اس غلامی کی پرستش ہو کر بیٹھ رہنے کی لعنت و ضریح علیہم

الدِّلَّةُ وَالْمُسْكَنَةُ وَبَاعُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۖ (۲/۶۱) اس دنیا میں بھی رسوائی اور عاقبت میں بھی رسوائی خیزیٰ فی الحیوة الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیَمَةِ یُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَرِّ الْعَذَابِ ۖ (۵/۴۱، ۲/۸۵) خدا کی رحمت سے دوری فیما نقضہم مِّمَّنْثاقہم لَعَنَہُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَہُمْ قَسِیَّةً ۖ (۵/۱۳) ان کی ”ہمشکنی“ کی وجہ سے ہم نے ان پر ”لعنت“ کی اور ان کے دل سخت کر دیئے، ایسی ”لعنت“ جس کے آثار دیدہ وروں کی نگاہوں نے بہت پہلے بھانپ لئے تھے کہ دیکھنے والی نگاہیں زیج سے پہلے پہچان لیتی ہیں۔ وہ ”لعنت“ جس سے اس قوم میں باہمی عداوت ڈال دی گئی

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِیَمَةِ ۖ كُلَّمَا أَذُّو قَدْ وَآثَارًا لِلْعُوبِ أَطْفَاہَا اللَّهُ ۖ وَیَسْعَوْنَ فِی الْأَرْضِ فَسَادًا ۖ وَاللَّهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (۵/۶۴)

اور (اسی سرکشی و کفر کا نتیجہ ہے کہ) ہم نے ان کے (مختلف فرقوں کے) درمیان عداوت اور کینہ ڈال دیا ہے کہ ابھی مٹنے والا نہیں جب ابھی لڑائی کی آگ سلگاتے ہیں، اللہ سے بجا دیتا ہے (یعنی اس کا فتنہ تمام ملک میں پھیلنے نہیں پاتا)۔ یہ لوگ ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے سعی کرتے ہیں اور اللہ خرابی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اور اس کا نتیجہ غیروں کی محکومی؟

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِیَمَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۖ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَأَنَّهُ لَخَفُوفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۷/۱۴۷)

اور (اسے پیغمبر) جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا (اگرچہ نبی اسرائیل شرارت و بدعملی سے باز نہ آئے تو وہ ہمیشہ گئے لئے ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا جو انہیں ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار (بدعملی کی سزا دینے میں دیر کرنے والا نہیں اور ساتھ ہی بخشنے والا رحمت والا بھی ہے۔

بدن کی بھی محکومی اور روع کی بھی محکومی! بقول علامہ اقبالؒ۔

جان بھی گرو غیبت بدن بھی گرو غیبت  
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکین ہے

نہ اپنی حکومت و سلطنت، نہ اپنے تصوراتِ حیات، جسم بھی غیروں کے محکوم اور دل و دماغ بھی دوسروں کے نظریاتِ زندگی کے تابع، ذہنیت بالکل بندروں کی سی (apish mentality) اپنا مستقل نظریہ حیات کوئی نہیں، باہمی عداوت اور غیروں کے تصوراتِ زندگی کی اندھی تقلید۔ یہ تھیں خصوصیات اس قوم کی جس پر اللہ کا عذاب یوں نازل ہوا تھا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُفُّوا  
قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۚ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ  
مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۲/۶۶-۶۷) ۚ (۴/۱۶۶)

اور یقیناً تم ان لوگوں کے حال سے بے خبر نہیں ہو جو تم ہی میں سے تھے اور جنہوں نے سبت کے معاملہ میں راست بازی کی حدیں توڑ ڈالی تھیں (یعنی حکمِ شریعت سے بچنے کے لئے جیلوں، تکاریوں سے کام لیا تھا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو انسانیت کے درجہ سے گر گئے) ہم نے کہا ذلیل و نوار بندوں کی طرح ہو جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس معاملہ کو ان سب کے لئے جن کے سامنے ہوا اور ان کے لئے بھی جو بعد کو پیدا ہوئے، تازیانہ عبرت بنادیا اور ان لوگوں کے لئے جو متقی ہیں اس میں نصیحت و دانائی رکھ دی۔

**مسخ سیرت** | قرآن کریم نے ان لوگوں کو جو اپنے اعمال کی وجہ سے رحمتِ خداوندی سے دور ہو جاتے ہیں اور یوں ان پر عذابِ الہی مسلط ہو جاتا ہے، شر الدواب (بدترین خلایق) قرار دیا ہے۔ اور انہیں قرحہ اور خنازیر سے تشبیہ دی ہے کیونکہ ان کی نفسیاتی کیفیت، درجہ انسانیت گرا کر اسفل السافلین کی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرِّ مِّنْ ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ  
وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْفِرْعَوْنَ ۚ وَ الْخَنَازِيرَ ۚ وَ عَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ  
أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ أَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝ (۵/۶۰)

(اے پیغمبر! تم) کہو کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ معیارِ خداوندی کے مطابق کس کی حالت بدترین ہے؟ ان لوگوں کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی متابعِ حیات مجلس گئی۔ ان کی سیرت بدترین حیوانات (بندروں اور خنزیروں) جیسی ہو گئی اور وہ بڑی سرکش



قوموں کی محکومی کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ یہی لوگ ہیں جو سب سے بدتر درجے میں ہیں اور سب سے زیادہ میدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔

یہاں قرچہ (بندر) اور خنازیر (سور) کے ساتھ عبد الطاغوت مفہوم کو واضح کر رہا ہے یعنی سرکش قوتوں کے محکوم اور فرماں پذیر۔ خود نبی اکرم کے زمانہ کے اہل کتاب کا "جنہوں نے قرآن کریم سے انکار کیا" اسی درجہ میں شمار کیا گیا ہے (دیکھئے ۴/۴۷) یعنی جس طرح حکم بدت کی معصیت کرنے والوں پر اللہ کی "لعنت" ہوئی تھی اسی طرح تم پر بھی "لعنت" ہوئی! ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی صورتوں کی نہ تھی سیرتوں کی تھی۔ احکام بدت سے سرکشی کرنے والوں کے متعلق خود تورات میں ہے کہ

تو نے میرے مقدسوں کو ناچیز جانا ہے اور میرے سبتوں کو ناپاک کیا ہے۔ تیرے بیچ میں وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں اور تیرے درمیان وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں۔ تیرے بیچ میں وہ ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں۔ تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا۔ تیرے بیچ انہوں نے اس عورت سے جو حیض کے سبب خارج کی گئی تھی مباشرت کی ہے۔ کسی نے دوسرے کی جوڑو سے بُرا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بد ذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے۔ تیرے بیچ میں انہوں نے رشوت لی تاکہ خون کیا جائے۔ تو نے بیاج اور سود لیا ہے اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا ہے اور مجھے فراموش کیا خداوند یہوداہ کہتا ہے دیکھ تیرے ناروا نفع کے سبب جو تو نے لیا اور تیری خوں ریزی کے باعث جو تیرے بیچ میں ہوئی ہے میں نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا ہے۔ کیا تیرا دل سنبھلے گا اور تیرے ہاتھوں میں نور رہے گا، ان دنوں میں جب تیرا معاملہ فیصلہ کروں گا؟ مجھ خداوند نے کہا ہے اور میں ہی عمل کروں گا۔ ہاں میں تجھ کو قوموں میں کھنڈا دوں گا اور تجھے ملکوں میں پراگندہ کروں گا اور تیری گندگی جو تجھ میں ہے نابود کروں گا اور تو قوموں کی نظر کے آگے آپ اپنے میں ناپاک ٹھہرے گا اور معلوم کرے گا کہ میں خداوند ہوں۔ (خزنی ایل ۸-۱۶/۲۲)

یہود پر غلامی و محکومی (ذلت و مسکنت) کا عذاب کسی خاص زمان و مکان سے مشروط نہ تھا بلکہ ایسا عذاب تھا جو ہر زمانہ میں زمین کے ہر حصہ میں منحوس سایہ کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہے۔

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ آيِنَ مَا تَقِفُوا اِلَّا بِحَبْلِ مِّنْ اِلٰهِ وَحَبْلِ  
مِّنَ النَّاسِ وَ بَاءٌ وَّ لِفَضَبٍ مِّنْ اِلٰهِ وَ ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ  
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَاوًا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اِلٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ  
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَاوًا يَعْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۱۱)

ان لوگوں پر (یعنی یہودیوں پر) ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے، الٰہیہ خدا کے  
عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو اور خدا کا غضب ان پر چھا گیا۔ محتاجی و جدالی  
میں گرفتار ہو گئے اور یہ اس لئے ہوا کہ قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے اور نبیوں کے ناحق قتل  
میں بیباک تھے اور بد عملی و شقاوت کی یہ حالت اس لئے (پیدا ہوئی) کہ نافرمانی اور سرکشی کر لے لگے  
تھے اور (اپنی شرارتوں میں) احد سے گزر گئے تھے۔

**ذلت کے معنی** | ذلت، عزت کی ضد ہے۔ عزت کے معنی ہیں غلبہ و قوت۔ لہذا ذلت کے معنی ہوئے  
مزدوری اور مغلوبیت، غیروں کی محکومی۔

لے یہودیوں کی سلی پریشانی اور اجتماعی انتشار و پراگندگی کے متعلق خود حضرت موسیٰ نے پیش گوئی کی تھی جو تورات  
میں ان الفاظ میں مذکور ہے۔

اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک تشریف کرے گا اور وہاں  
تو غیر معبودوں کی جو بھڑکیاں اور پتھر ہیں جن سے نہ تو تیرے باپ دادا واقف تھے اُن کی پرستش کریگا۔  
اور ان قوموں میں تجھ کو آرام نہ ملے گا بلکہ تیرے پاؤں کے تلے کو قرار نہ ہوگا کیونکہ خداوند وہاں تجھ کو دل  
کا دھڑکا اور آنکھوں کی دھندلاہٹ اور جی کی غمناکی دے گا اور تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانے  
ہو جائے گی اور ٹورات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خوف  
سے جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی، صبح کو تو بے گامے کاش کہ شام  
ہوتی! اور شام کو بے گامے کاش صبح ہوتی اور خداوند تجھ کو اس راہ سے جس کی بابت میں نے تجھے کہا  
کہ تو پھر اسے نہ دیکھے گا کشتیوں پر تھر کو پھر لے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لئے  
اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچے جاؤ گے اور تمہیں کوئی مول نہ لے گا۔ (استثنا ۶-۱۲/۲)

بنی اسرائیل کے لئے سورۃ بقرہ میں جہاں ذلت و مسکنت کے عذاب کا ذکر ہوا ہے (دیکھئے ۲/۶۱) جو پہلے درج کی ہاجچی ہے) وہ اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں انہوں نے دشت و بیاباں کی آزادانہ زندگی کو چھوڑ کر جہاں نگاہوں میں کشادگی اور عراغ میں بلندی پیدا ہوتی تھی (شہروں کی تیرہ و تنگ زندگی کی خواہش کی تھی) وہ عذاب پھر بھی وقتی تھا اور چالیس برس کی صحرا نوردیوں سے کٹ گیا۔ لیکن جو عذاب بعد میں نازل ہوا (دیکھئے مندرجہ صدر آیت ۳/۱۱۱) وہ ان پر اس طرح مسلط رہا کہ دنیا میں "آوارہ گرد یہودی" (Wandering Jews) کی اصطلاح بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگ گئی۔ یہ ذلت کا عذاب (یعنی پہلا وقتی عذاب) ان پر گویا سالہ پرستی کے شرک کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْيَهُودَ سَيِّدًا لَهُمْ غَضَبٌ مِّن تَبَهُهُمُ ذِلَّةٌ رِّفِي  
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتِرِينَ ۝ (۴/۱۵۲)

خدا نے فرمایا "جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی ان کے حصے میں ان کے پروردگار کا غضب آئے گا اور دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی پائیں گے۔ ہم افتراء پردازوں کو (ان کی بد عملی کا) اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔"

**مسکنت کے معنی** | سورۃ بقرہ اور آل عمران میں ذلت کے ساتھ مسکنت کا لفظ بھی آیا ہے۔ مسکنت (سکون) کے معنی ہیں عدم حرکت، یعنی غلامی و محکومی کے گڑھے میں گر جانا اور پھر اس میں بے حس و حرکت پڑے رہنا، عذاب و عذاب!

محنت جی و مسکینی و نویسی جاوید

**جَبَلُ اللَّهِ سے مراد** | آگے بڑھنے سے پیشتر سورۃ آل عمران کی مصرعہ صدر آیت (۳/۱۱۱) پر ایک نگاہ پھر ڈالئے جس میں ارشاد ہے کہ یہ ذلت و مسکنت (محکومی و غلامی اور جود و تعطل کی زندگی) اس طرح رفع ہو سکتی تھی (اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ) کہ یا تو دعوت خداوندی کے سرشار سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا جاتا یا (بِسَبِيلِ تَنْزِيلِ) دوسری قوموں کے ساتھ معاہدات کر کے ان کی پناہ میں آجاتے۔

لے مسکینی کے معنی ایسا محتاج ہوں گے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔

اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے سرِ شتہ سے منسلک کر لینے سے حکومت و ثروت کے ساتھ شرفِ انسانیت کی نعمت کبریٰ بھی مل جاتی۔ لیکن اگر کسی کو یہ میسر نہ ہو تو ان میں کم از کم اتنی اجتماعیت تو ہو کہ وہ دوسری اقوام کیساتھ معاہدات ہی کر سکیں اور اس طرح لکڑی کے ساتھ لوہا بھی تیرنے لگ جائے۔ لیکن جس قوم کو نہ جبلِ اللہ کی مقدس مرکزیت حاصل ہو اور نہ ہی جبلِ النکاس کی تقویت میسر اسے بھلا انسانوں کے زمرہ میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے؟ یہ تو یکسر عذاب کی زندگی ہے۔ (۱۰/۲۴-۲۵)

**آخری واقعہ** | یہ تھی بنی اسرائیل کی نزولِ قرآن کے وقت کی حالت۔ نبی اکرمؐ کے عہدِ رحمتِ آسمانی میں ایک موقع پھر آیا تھا کہ ان کی اندوہناک پستیاں شرف و مجد کی سرفرازیوں میں بدل جائیں لیکن انہوں نے اپنی ضد اور قساوتِ قلبی کی بنا پر اس دعوتِ ربانی پر بتیک کہنے کے بجائے اپنے سابقہ شیوہ کے مطابق اس کی انتہائی مخالفت کی اور اس مخالفت میں ایسی ایسی حرکات پر اتر آئے جو ان کی قومی تاریخ کے اوراق پر ایک افسوسناک دھبہ بنے۔ لیکن اس سے اس دعوت کا کچھ نہ بگاڑا البتہ انہوں نے خود اپنی پیشانی پر گہری ہلاکت کی مہر ثبت کر لی۔

**اتباعِ دعوتِ قرآنی** | سورہ اعراف میں ہے کہ جب حضرت مولیٰؐ نے اس قوم کے لئے ابدی برکات کی دُعا مانگی تو بارگاہِ ایزدی سے جواب ملا کہ یہ سرفرازیوں پر مشروط ہیں اس بات پر کہ جب وہ نبی آخر الزماں آئے تو یہ اس پر ایمان لائیں اور اس دعوت کی تائید کریں۔

وَاكْتُبَ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ اِنَّا هُنَا اِلَيْكَ  
قَالَ عَذَابِيْ اُصِيبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ  
فَسَاكُنِيْهَا..... فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ  
الَّذِيْ اُنْزِلَ مَعَهُ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ع (۱۵۶-۱۵۷/۴)

(اور خدایا!) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے خوشگواہی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں بھی خوشگواہی۔ اس لئے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں۔

خدا نے فرمایا، میری طرف سے تباہی کا حال یہ ہے کہ وہ میرے قانونِ مشیت پر مبنی ہے اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ پس میں ان لوگوں کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو میرے

قوانین کی نگہداشت کریں گے اور دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں گے، یعنی وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں گے، جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُتقی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، خبیث چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے، (راہ حق ہیں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے ساتھ بھی گئی ہے، سود ہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں!“

یہ چیزیں خود ان کے ہاں تورات میں موجود تھیں۔ یہ لوگ ایک آلے والے کے انتظار میں تھے جس کی بشارتیں ان کے ہاں متواتر چلی آتی تھیں (ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ لیکن جب وہ آئیوا آیا اور دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کو اپنے جلو میں لئے فاران کی چوٹیوں پر جلوہ بار ہوا، تو بجلئے اس کے کہ یہ لوگ آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتے، سب سے پہلے مخالفت پر اُتر آئے۔ حالانکہ ان سے بار بار کہا گیا کہ تمہیں تو یہ زیبا نہیں کہ تم ہی اس دعوے کا انکار کرتے تم سے تو عہد لیا گیا تھا کہ تم اس آلے والے کی تائید و نصرت کرو گے تو تم پر رحمتِ ایزدی کی گہر باریاں ہوں گی۔ تم اس عہد کو پورا کرو اللہ اپنے عہد کو پورا کرے گا (۲/۴۰)۔ یہ دعوت کوئی نئی دعوت اور یہ پکار کوئی انوکھی پکار نہ تھی، بلکہ اسی تعلیم کی تجدید و تکمیل تھی جو اس سے پیشتر تورات میں آچکی تھی۔ لیکن جسے یہ لوگ اپنے ہاں سے کھو چکے تھے۔ (۸۳-۸۲ : ۲/۴۵ : ۴/۱۵۴ : ۱۶۱ : ۱۲-۱۳/۵)

علاوہ ازیں، قرآن کریم نے دیگر متعدد مقامات میں بھی اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت یہودیوں کی حالت کیا ہو چکی تھی اور وہ کس طرح قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرنے سے دُور بھگتے تھے۔

(دیکھئے ۲/۴۴ : ۵/۴۶ : ۲/۱۰۰ : ۲/۱۰۱ : ۲/۱۴۴ : ۲/۲۰ : ۴/۱۵۴ : ۱۶۱ : ۱۲-۱۳/۵)

**آخری تباہی** | قدرت کی طرف سے اس قوم کو یہ آخری موقع دیا گیا تھا کہ وہ ضابطہٗ خداوندی کی طرف رجوع کریں تاکہ ان کی باز آفرینی کی صورت پیدا ہو سکے۔ لیکن انہوں نے اس نایاب موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل اپنی پوری قوت و شدت کے ساتھ لوٹا جس کے سامنے یہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

عَسَىٰ دَبْكُكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُمْ عَدُوًّا فَاَوْجَعْنَا جَهَنَّمَ

لِّلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝ (۱۴/۸)

کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹے تو پھر ہماری طرف سے بھی پاداش عمل لوٹ آئے گی اور (یاد رکھو) ہم نے منکرین حق کے لئے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے!

مدینہ کے یہودیوں نے پہلے نبی اکرمؐ کے ساتھ امن و سلامتی کا عہد کر لیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے عہد شکنی کی جس کی وجہ سے انہیں مدینہ سے نکلنا پڑا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے عہد میں انہیں ایسے ہی جسورانہ کی پاداش میں خیبر سے شام کی طرف نکال دیا گیا (۵۹/۲)۔ اس کے بعد اس راندہ بارگاہِ خداوندی قوم کی جو حالت ہوئی اس کی کیفیت ہم سے نہیں آسمان کی آنکھوں سے پوچھئے۔

یہ ہے داستان اس قوم کی جو ذلت کی خاک سے اُبھر کر عزت کی بلندیوں تک پہنچی اور وہاں سے اسی گرمی کہ پھر سنبھلے نہ سنبھل سکی۔ اور یہ داستان محض افسانہ نہیں حقیقت ہے جسے وحی کی زبان نے ہمارے کافروں تک پہنچایا ہے اور اس لئے پہنچایا ہے کہ ہمارے لئے عبرت کا موجب اور عظمت

**آیہ عبرت**

کا ذریعہ بن سکے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا ۖ لِّمَن كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ ذَلِكُمْ

لَهُوَ الْغَيْزُ الشَّحِيمُ ۝ (۶۷-۶۸/۲۶)

دیکھو یقیناً اس میں (بڑی) نشانی موجود ہے۔ مگر ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

(کیونکہ تعصب و عناد کی وجہ سے وہ قبولِ ایمان کی صلاحیت ہی کم کر چکے ہیں) اور (یاد رکھو) تمہارا

پروردگار بڑا ہی غالب اور مہربان ہے۔

لیکن یہ عبرت اس کے لئے ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں میں اللہ کے قانونِ مکافات کا ڈھنجھوس کرے، ورنہ دوسروں کے لئے محض ایک کہانی ہے۔ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَتَخَسَّيْ ۝ (۷۹/۲۶)

**بازنجوشتن نگر** اس اُجڑی ہوئی قوم کی پراگندہ داستان کی مختلف کڑیوں پر نگاہ ڈالنے اور پھر سوچنے کہ اس آئینہ میں کہیں ہماری ہی شکل تو نظر نہیں آ رہی؟ قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ

لے ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

کو مثل موسیٰ قرار دیا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۖ شَهِدْنَا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ  
فِرْعَوْنَ مِنْ مُوسَىٰ ۖ (۱۵/۴۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) بلاشبہ ہم نے اسی طرح تمہاری طرف تم پر گواہ بنا کر ایک رسول بھیجا ہے، جیسا کہ فرعون کی طرف ایک رسول (موسیٰ کو) بھیجا تھا۔

(یہ مماثلت کیسی ہے اس کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا)۔ قومِ فرعون نے دعوتِ موسیٰ کا انکار کیا اور کفارِ عرب نے دعوتِ محمدیؐ کا۔ دونوں کا جو کچھ انجام ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

فَقَطَّيْنَا فِرْعَوْنَ الشَّرَّ سُوْلًا فَآخَذْنَاهُ أَخْذًا قَرْيَبًا ۚ فَكَيْفَ  
تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۚ (۱۴-۱۵/۴۳)

چنانچہ فرعون (اور قومِ فرعون) نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے بہت سختی سے پکڑ لیا اور نتیجے میں ہلاکت و بربادی اس کے حصہ میں آئی۔ سو اگر تم بھی (ان کی طرح) نافرمانی کرو تو اس دن (کی ہولناکی) سے کیسے بچ سکتے ہو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟

اس کے بعد قومِ موسیٰؑ شوکت و ثروت کی انتہائی بلندیوں پر سرفراز ہوئی اور ان سے کہیں بڑھ کر امتِ محمدیہؐ۔ پھر اس عروج کے بعد قومِ موسیٰؑ اس پستی میں گر گئی جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے اور امتِ محمدیہؐ —؟ اس کا جواب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے دل سے پوچھئے: قومِ موسیٰؑ سے ان کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کیا ارشاد ہوا تھا؟ دعوتِ قرآنی کا اتباع! اور امتِ محمدیہؐ کی باز آفرینی کے لئے بھی تم تک بالقرآن!!

دہی دیرینہ بیماری 'دہی' نامی دل کی

علاج اس کا دہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

اِنَّ هٰذَا تَذٰكِرٌ ؕ ۙ فَمَنْ شَاءَ اخْتَدِ اِلٰى رَبِّهِ سَبِيْلًا ۙ

(۱۹/۴۳)

یہ ایک بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی ہے جو جس کا جی چاہے (اس سے) اپنے اللہ (کے نظام) کی طرف راستہ اختیار کر لے۔

کیا یہودیوں کی تباہی ابدی ہے؟ | ہمارے ہاں صدیوں سے یہ خیال چلا آ رہا ہے کہ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی سلطنت نہیں مل سکتی۔ یہ

خدا کا فیصلہ نہیں، ہمارا اپنا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

نزولِ قرآنِ کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے، بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ان کا فطری نتیجہ ذلت و خواری اور محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خوادی انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نزولِ قرآن کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی بڑھ چکی تھیں۔ اس لئے قرآن نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اس دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو! تو امین خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا انہیں دنیا میں کبھی بھی حکومت و سطوت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی، تو اس سلسلہ میں اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ قوموں کی تباہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا اجتماعی تشخص ہی باقی نہ رہے، جیسے اکالِ لائم — بھارت، مائا — باہر سے آنے والی بیشتر قوموں کو اس طرح ہضم کر گئی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس قسم کی قوموں کے لئے باز آفرینی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو اپنی تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ ان خرابیوں کو رفع کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلت اور ادبار کے بادل اُمڈ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) ”مردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں“ تو انہیں پھر حیاتِ تازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانے میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دُور کر کے، از سرِ نو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی جو ہم نے سمجھ لیا کہ یہودیوں کو ابد الابد تک حکومت نہیں مل سکتی۔ لیکن قانونِ تو کسی کے جذبات کی پردہ نہیں کرتا۔ اس کے فیصلے سخاوت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اپنے فیصلوں کے متعلق (خود مسلمانوں سے کہہ دیا کہ) — لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ (۴/۱۳۳) یہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوں گے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق — مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ (۴/۱۳۳) جو غلط کار ہو گا وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ بھگتے گا۔ جب وہ غلط روش چھوڑ دے گا تو نقصان سے بچ جائے گا۔ یہ تو عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ انسان کے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کی لغزش کی



وجہ سے ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قرآن اس باطل عقیدہ کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لہذا، دو چار ہزار سال پہلے کی کسی نسل (generation) کی غلطیوں کی پاداش میں، اس کی آنے والی تمام نسلوں پر باز آفرینی کے دروازے بند کر دینا۔ می نہ سز دوائے را۔ بنا بریں، جس طرح ہمارے اسلاف کے کارنامے ہمارے لئے عزت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں عزت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود قابل عزت کام کریں۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف کے ذلت و خواری پیدا کرنے والے کام ان کی موجودہ نسل کے لئے ذلت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ ان کی روش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں، تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اس باب میں قرآن کا فیصلہ بڑا واضح ہے جب اس نے کہا کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ  
عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲/۱۳۱﴾

(یہ تمہارے اسلاف) اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تمہارے متعلق فیصلہ اس سے ہوگا کہ تم نے کیا کیا ہے۔

اس لئے نہ مسلمان، بلند کردار اسلاف ہونے کی بنا پر مقرب بارگاہ خداوندی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی یہودی اپنے غلط کار اسلاف کی نسل ہونے کی وجہ سے راندہ درگاہ، کارگہ حیات میں — غر  
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اگلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ اس دنیا کے طبعی معاملات خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت (Laws of

Nature) کے مطابق طے پاتے ہیں اور قوانین فطرت کی نگاہ میں کافر و مومن کی کوئی تمیز اور

فرق نہیں۔ اگر کوئی "شیر سنگھ یا رام داس" فطرت کے قاعدے کے مطابق اپنی زمین تیار کر کے اس میں

کھیتی کرتا ہے تو اس کی بھی اتنی ہی فصل ہوگی جتنی کسی "عبدالرحمن" کاشتکار کی جو انہی قواعد کے مطابق

کاشت کرتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر "شیر سنگھ یا رام داس" ان قواعد کی پابندی کرتے ہیں اور "عبدالرحمن"

ان سے اعراض برتا ہے، تو "شیر سنگھ اور رام داس" کی "کوٹھیاں" دانوں سے بھر جائیں گی،

"عبدالرحمن" کی جھولی خالی رہ جائے گی۔ اس باب میں فطرت نہ کسی سے رعایت برتی ہے، نہ کسی سے بیر

رکھتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کہ کُلُّ نَفْسٍ هَوْ لَدَّہٗ وَ هُوَ لَدَّہٗ مِنْ عَطَاءِ رَبِّکَ۔ جو چیزیں عطیہ خداوندی کے طور پر ماندہ ارض پر بکھری ہوئی ہیں، انہیں جو بھی ہمارے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہے، ہم اسے برابر آگے بڑھائے جاتے ہیں۔ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّکَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰)۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہم راستے میں پھانک لگا دیں کہ اس سے آگے ”عبد الرحمن“ تو جاسکتا ہے ”تیسرے“ اور رام داس“ نہیں جاسکتے۔

ہست میں میکدہ و دعوت عام است اینجا

اپنی اپنی ہمت اور کوشش کے مطابق جو جتنا حاصل کرنا چاہے، حاصل کر لے۔ یہودیوں کی ذلت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ — نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ — ہم خدا کی چاہیتی اولاد ہیں۔ اس لئے ہم کچھ کریں یا نہ کریں (یا جو جی میں آئے کریں) ہمیں زندگی کی سرفرازیاں از خود حاصل ہوتی جائیں گی۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے لئے ترکِ عمل کا باعث بن گیا جس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ انہوں نے اس عقیدہ کو ترک کر دیا تو ذلت و خواری کے عذاب سے نکل گئے۔ ان کی جگہ ہم نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ ”ہم خدا کے محبوب کی محبوب اُمت ہیں“ اس لئے ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ تو اس غلط عقیدہ کے فطری نتیجہ کی رُو سے جس عذاب میں یہودی گرفتار تھے اس میں ہم مانو نہیں۔ یاد رکھئے! خدا کے ہاں نہ کوئی قوم (محض کسی نسبت کی بنا پر) چاہیتی ہوتی ہے نہ سوتیلی۔ وہاں تو اصول یہ ہے کہ — مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ أَخْاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲/۸۱) جو کوئی بھی غلط روش اختیار کرے اور اس کی غلط اندیشیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں تو اس کی زندگی جہنم کی ہوگی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایسی اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے ان کی حکومت و سطوت ان سے چھن گئی اور وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن گئی۔ قرآن کریم نے ان خرابیوں کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس قوم کو مطعون کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کو متنبہ کرنا چاہتا تھا کہ دیکھنا! کہیں تم میں اس قسم کی خرابیاں نہ پیدا ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا، تو جو حالت بنی اسرائیل کی ہوئی ہے وہی حالت تمہاری ہو جائے گی۔ یہ خدا کا قانون مکافاتِ عمل اٹل ہے — وَ لَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِسْتَةً اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ (۳۳/۶۲) تم اس کے قانونِ مکافات میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

ہم ان خرابیوں میں سے چند ایک اصولی امور کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان میں کونسی خرابی ایسی ہے جو یہودیوں میں تھی اور اب ہم میں پیدا نہیں ہو چکی، اقلیت گنجائش کی وجہ سے ہم ان کا ذکر محض اشارۃً کریں گے۔ آپ انہیں غور سے دیکھئے۔

(۱) خود اپنی قوم کے ساتھ غداری ان کا شیوہ تھا۔ ان کے ارباب اقتدار کرتے یہ تھے کہ پہلے ایسے حالات پیدا کر دیتے جن سے کمزور طبقہ دوسروں کا محتاج ہو جائے اور پھر ”نیک بننے“ کے لئے ان کی یہود کے لئے خیراتی فنڈ اکٹھا کرتے۔ (۲/۸۵)۔

(۲) عہد شکنی اور اصول فراموشی ان کا عام شعار تھا۔ (۲/۱۰۰)

(۳) وہ محنت سے جی چراتے تھے اور محض روپیہ لگا کر دوسروں کی کمائی کو ہتھیالیا کرتے تھے، یعنی ان کے ہاں نظام سرمایہ داری عام تھا۔ (۴/۱۶۱) اور یہ سرمایہ دار خود اپنی ہی قوم کا خون چوستے تھے چنانچہ قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون اور ہامان تو قوم مخالف سے متعلق تھے، لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا۔

(۴) ان میں ہوس زر اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ ان کا مقصد حیات روپیہ حاصل کرنا رہ گیا تھا اور اس میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ (۵/۴۲)

(۵) معاشرہ میں اخلاقی برائیاں اس قدر عام ہو چکی تھیں کہ کوئی انہیں روکنے لڑکنے والا ہی نہیں تھا۔ (۵/۷۹)

(۶) مذہبی پیشوائیت کا اقتدار اس قدر غالب آچکا تھا کہ وہ خدائی مسند پر بیٹھ گئے تھے اور اپنے احکام کو خدا کی شریعت کہہ کر لوگوں سے منواتے تھے۔ (۹/۳۱)

(۷) یہ مذہبی علماء اور روحانی مشائخ ہر طریق سے لوگوں کا مال ہڑپ کر جاتے تھے اور انہیں کبھی خدا کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتے تھے۔ (۹/۳۴)

(۸) دین فروشی ان مذہبی راہنماؤں کا عام شیوہ تھا۔ (۷/۱۶۹)

(۹) ان کے ارباب اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ وہ کرتے کچھ نہیں تھے، لیکن چاہتے یہ تھے کہ لوگ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تعریف کریں جنہیں وہ کر کے نہیں دکھاتے تھے۔ (۱۳/۱۸۷)

(۱۰) قوم میں بات بات پر اختلاف ہوتا تھا اور اس سے ان میں بے شمار فرقے پیدا ہو چکے تھے (۱۰/۹۳)۔

یہ اختلافات، مذہبی پیشواؤں کی باہمی ضد اور ایک دوسرے پر غالب آ جانے کے جذبات کی بنا پر پیدا کئے اور قائم رکھئے جاتے تھے۔ (۳۵/۱۷)

(۱۱) ان کے علماء کے پاس کتابوں کے انبار در انبار لگے رہتے لیکن حرام جو وہ ان میں سے کسی پر عمل کرتے۔ ان کی مثال ایسی تھی جیسے گدھے پر بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ لاد کر سمجھ لیا جائے کہ وہ بڑا مقدس بن گیا ہے۔ (۶۲/۵)

(۱۲) وہ اپنے آپ کو خدا کی چاہتی اولاد سمجھتے تھے اس لئے اس زعم باطل میں مبتلا تھے کہ انہیں عمل کی ضرورت نہیں۔ وہی جنت کے واحد جبارہ دار ہیں۔ (۲/۱۱، ۲/۸۰)

(۱۳) اندھی تقلید ان کا شیوہ تھا اور وہ کوئی نئی بات سننے اور اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ (۲/۸۸)

(۱۴) بلا محنت، ہوس زور نے ان میں حرکت و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۲/۹۴)

(۱۵) انہیں اگر کبھی دشمن کے مقابلہ کے لئے ہانک کر لے جایا جاتا، تو وہاں سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھتے۔ (۲/۲۴۳)

(۱۶) معاشرتی ضوابط کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر سخت گراں گزرتیں اور ان سے بچ نکلنے کے لئے وہ چور دروازے تراشتے رہتے۔ (۷/۱۶۳) اسی لئے منافقت ان کے رگ و ریشے میں رچ چکی تھی۔

(۱۷) ان کا اپنا مثبت نظریہ زندگی کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے دوسروں کی نقالی میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ (۷/۱۶۶)

(۱۸) ان کی ساری توانائیاں باہمی سر پھٹول اور انتشار میں ضائع ہو جاتی تھیں۔ (۵/۶۴)

یہ تھیں مختصر اودہ اخلاقی خرابیاں جو ان میں عام ہو چکی تھیں اور جن کا نتیجہ یہ تھا کہ ان سے سرفرازیں چھین گئیں۔ وہ سطوت داد دی اور شوکت سلیمانی سے محروم ہو گئے اور ان پر ذلت و خواری کی مار ماری گئی۔ ان پر سب سے بڑا عذاب یہ طاری ہوا کہ ان کی اجتماعیت فنا ہو گئی، مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد ان کی زندگی انفسرادی رہ گئی۔ ان کا یہی وہ سوختہ بخت آں تھا جس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ

عبرتے، اے مسلم روشن ضمیر      از نال اُمتِ مولیٰ بگیر  
داد چوں او قوم مرکزِ رازِ دست      رشتہ جمیعتِ ملتِ شکست  
قوم را ربط و نظام از مرکزے      روزگارش را دوام از مرکزے

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس (غلط) عقیدے کی تائید میں (کہ یہودیوں کو کبھی سلطنت نہیں مل سکتی) خود قرآن کریم سے جو شواہد پیش کئے جاتے ہیں، ان کی اصل و حقیقت کیا ہے۔  
(۱۱) سورۃ فاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّالِّينَ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہودی ہیں اور ضَّالِّينَ سے مراد عیسائی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ تخصیص نہیں۔ اس میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ غضبِ خداوندی کے مستوجب کون لوگ ہوتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کا نتیجہ خدا کا غضب ہوتا ہے اور راستے سے بھٹک جانے والے (ضَّالِّينَ) کون۔ بنا بریں، سورۃ فاتحہ میں مذکور (مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ اور ضَّالِّينَ) میں وہ تمام افراد اور اقوام شامل ہیں جن پر قرآن کی رو سے ان اصطلاحات کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم ان مقامات میں سے (مثال کے طور پر) صرف دو ایک درج ذیل کرتے ہیں: سورۃ انفال میں جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو تو وہاں پیٹھ دکھا کر مت بھاگ اٹھو۔ یاد رکھو، جو ایسا کرے گا۔ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبِ مِّنْ اَللّٰهِ وَ مَا ذٰلُہٗ جَهَنَّمُ ۝ (۸/۱۶)۔ وہ غضبِ خداوندی کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ سورۃ نسا میں ہے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعِدًّاۙ فَاِجْرَآؤُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًاۙ فِيْہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ۝ (۴/۹۳)

جو کسی مومن کو عمدتاً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔

لہذا، یہ سمجھنا کہ قرآن کریم کی رو سے "مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" سے مراد صرف یہودی ہیں، خود فریبی ہے۔

(۲) یہودیوں کے متعلق بھی قرآن کریم میں ہے کہ وہ اپنے متعدد جرائم کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق قرار پائے تھے۔ مثلاً جب انہوں نے (حضرت موسیٰ کی عارضی غیر حاضری کے دوران) گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اس پر کہا گیا کہ — سَيَذَلُّهُمُ غَضَبُ مِنِّي وَذِلَّةٌ مِنِّي بِفِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا..... (۷/۱۵۲) ان پر خدا کا غضب ہو گا یعنی وہ اس دنیا میں ذلیل ہوں گے۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ ہر گم کرنے کے بعد اس سے تائب ہو کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں انہیں عفو اور رحمت نصیب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں حکومت و سطوت نصیب ہو گئی۔ اسی سینا کے صحرائے انہوں نے احکام خداوندی سے اعراض اور سرکشی کی راہیں اختیار کیں تو اس پر کہا گیا کہ — وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالسُّكُنَةَ قَدْ بَاءُوا بِغَضَبِي مِنِّي اللَّهُ (۲/۴۱) ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور اس طرح خدا کا غضب ان پر وارد ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ذلت و مسکنت کی یہ سزا بھی وقتی تھی، کیونکہ اس کے بعد انہیں نہ صرف فلسطین کا علاقہ ہی ملا بلکہ وہ سطوت و اددی اور شوکتِ سلیمانی کے بھی وارث ہوئے۔

(۳) اس کے بعد ان میں پھر خرابیاں پیدا ہو نا شروع ہو گئیں تو ان پر دو دفعہ ایسی تباہی کا عذاب آیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ان کی پہلی تباہی بابل کے مستبد شاہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) ظہور میں آئی۔ لیکن اس کے بعد ایران کے شاہنشاہ کیخسرو نے دوبارہ یروشلم میں بسادیا اور دوسری تباہی ’سنگھ میں رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد انہیں پھر سرفرازی کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۷۷-۷۸ میں ان دونوں تباہیوں کا ذکر آیا ہے۔

(۴) نزولِ قرآن کریم کے وقت ان سے کہا گیا کہ اگر تم خدا کی ان صداقتوں پر ایمان لا کر اپنی روش میں تبدیلی کر لو، تو تمہاری ذلت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا اور بدستور غضبِ خداوندی کے مورد بنے رہے۔ اس سلسلہ میں سورۃ بقرہ میں کہا گیا کہ اس سے قَبْلَآءُ وَ يَغْضَبُ عَلٰی غَضَبٍ (۲/۹۰)۔ وہ پہلے ہی (اپنے سابقہ جرائم کے نتیجے میں) مغضوب علیہ تھے، اس انکار و سرکشی سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

انہوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے انکار کیا بلکہ (مدینہ میں) اسلامی مملکت کے

امن پسند شہریوں کی حیثیت سے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں سے عہد شکنی کی۔ پھر کھلے ہندوں میدان جنگ تک میں مقابلہ کے لئے آگئے۔ اس مقام پر جماعت مومنین سے کہا گیا کہ ان کی ان حرکات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ہر منصوبہ ناکام رہے گا، انہیں ذلت آمیز شکست ہوگی اور بُری طرح سے خوار ہو کر یہاں سے نکلیں گے۔ اس سلسلہ میں سورۃ آل عمران میں کہا گیا کہ ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثَقِفُوا — یہ جہاں بھی جائیں گے، ذلت و خواری ان کا بیچھا نہیں چھوڑے گی — اَلَّا يَحْبِلَ مِمَّنْ اَللّٰهُ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ — بجز اس کے کہ کسی نے انہیں اہل کتاب سمجھ کر خدا کے نام پر پناہ دے دی یا انہوں نے ویسے ہی کسی قوم سے معاہدہ کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان کی کیفیت یہی رہے گی کہ وَ بَاءُ ذُرِّيَّتِهِ مِمَّنْ اَللّٰهُ وَ ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الْمُسْكَنَةُ ۚ (۳/۱۱۱) خدا کا غضب ان پر مسلط رہے گا اور اس طرح یہ ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ پہلے انہیں مدینہ سے نکالا گیا، پھر خیبر سے اور ازاں بعد پورے کے پورے جزیرہ نمائے عرب سے انہیں باہر نکال دیا گیا۔ صفحہ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں یہ باعزت زندگی بسر کر سکتے۔ عیسائی ان کے شدید ترین دشمن تھے، کیونکہ وہ انہیں حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے کے مجرم قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کی مملکت کے خلاف انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ لہذا ان کے لئے کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

(۵) آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں 'نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے تک یہودیوں کی ذلت آمیز زندگی کا ذکر ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ابدالاباد تک ان کی یہی حالت رہے گی۔ بلکہ خود اسی آیت میں اَلَّا يَحْبِلَ مِمَّنْ اَللّٰهُ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ "کہہ کر ان کی ذلت سے بچ جانے کی ایک امکانی شکل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

(۶) انہوں نے اپنی فلسطینی زندگی کے زمانے میں سرکشی اور قانون شکنی کی جو زندگی اختیار کر رکھی تھی اس سلسلہ میں سورۃ اعراف میں ہے۔

وَ اِذْ تَاٰذَنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنۡ يَّسُوُّهُمْ سُوًى الْعَذَابِ ۚ (۷/۱۴۷)

اور جب تیرے رب نے (بذریعہ وحی) اعلان کر دیا کہ وہ ان پر "قیامت کے دن تک" ایسے

لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں سخت سزائیں دیا کریں گے۔

اس آیت میں ”إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“ (قیامت کے دن تک) کے الفاظ سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ قیامت تک ایسے لوگوں کی حکومتی میں رہیں گے جو انہیں بُری طرح ستائیں گے۔ اس لئے ان کی اپنی حکومت کبھی قائم نہیں ہوگی۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رُو سے ”قیامت“ کا تصور کیا ہے اور یوم القیمة سے مراد کیا؟ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں کہ تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکو گے اور اس طرح اس سے یا تو شدت مراد ہوتی ہے یا لمبا عرصہ۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی ”إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں عیسائیوں کے متعلق ہے کہ ”فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“ (۵۱/۴) ہم نے ان میں ”قیامت کے دن تک“ باہمی بغض و عداوت ڈال دی۔ اسی طرح یہودیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق بھی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے (۵۱/۴)۔ ”إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“ تو خیر پھر بھی ایک محدود مدت ہے، قرآن کریم میں تو ”ابد“ کا لفظ بھی لامتناہی مدت کے بجائے ”لبسے عرصے“ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ ”میں کبھی ایسا نہیں کروں گا“ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے نقار کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ”تم میں اور ہم میں باہمی عداوت ہوگی۔ آج (۲۰/۴)“ لیکن اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ ”حَتَّى تَوْبُوْا بِأَدْلِهِ“ (۲۰/۴) تا آنکہ تم اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہی مراد ”یہودیوں پر ان کے دشمنوں کے تسلط“ تا قیامت“ سے ہے، یعنی ان پر وہ لوگ مسلط رہیں گے تا آنکہ یہ اپنی غلط روش کو نہ چھوڑ دیں۔ خود وہ آیت جس میں یہودیوں پر ان لوگوں کے تا قیامت مسلط رہنے کا ذکر ہے اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ کہہ کر کہ ان لوگوں پر وہ مسلط رہیں گے، یہ کہا گیا کہ — إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ خدا کا قانونِ مکافات غلط اعمال کا بہت جلد بدلہ دے دیا کرتا ہے اور اس کے بعد ہے وَ إِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۷۴/۱) اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سامانِ حفاظت و مرحمت بھی عطا کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہودی پر باز آفرینی کے دروازے ابدی طور پر



بند نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے لئے حفاظت طلبی کے راستے کھلے تھے۔

اس سے اگلی آیت میں بات اور بھی واضح کر دی جہاں کہا کہ **وَقَطَعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا** اُن کے ان جرائم کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی، ان کا شیرازہ بکھر گیا اور مختلف گروہوں میں بٹ کر زمین میں منتشر ہو گئے۔ **مِنْهُمْ الْأَطْلُحُونَ وَ مِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ** یہ نہیں تھا کہ ان کی ساری قوم میں کوئی بھی فرد صالح نہیں تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور کچھ لوگ ویسے۔ **وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ** ان کی تاریخ میں، ان کے لئے بگڑنے اور سنورنے کے مختلف مواقع آتے رہے۔ یہ اس لئے کہ **لَعَلَّاهُمْ يَرْجِعُونَ** ۵ (۷/۱۶۸) تاکہ یہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آجائیں اور اس طرح اپنی ذلت و محکومی کو پھر سے عزت اور وقار میں بدل سکیں۔ **لَعَلَّاهُمْ يَرْجِعُونَ** کے الفاظ نے ساری بات واضح کر دی۔ یعنی یہ کہ ان پر ان کی باز آفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو چکے تھے۔ ان کے لئے اس کا امکان باقی تھا۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حکومت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے کچھ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قوم بھی ان صلاحیتوں کو پیدا کر لے گی، اسے حکومت مل جائے گی۔ جن میں وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں گی، ان سے حکومت چھن جائے گی۔ ان صلاحیتوں کے باقی نہ بننے سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی ہے اس کا اندازہ دو ایک تاریخی واقعات سے لگائیے۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فلسطین کے ان مقامات کو جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے، مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیں۔ قریب دو سو سال تک ان جنگوں کا سلسلہ (جنہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے) جاری رہا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ اس کی وجہ ایک فرانسیسی مصنف (ٹو این ویل) کی زبان سے سنئے جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ مصر کے محاذ کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

ایک رات جب ہم اُن بُرجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھیں پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن سالاکر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہمارے لارڈ وائلڈ نے ہم سے یوں خطاب کیا۔ اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ آپ لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ جو نہی

مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہیئے کہ ہم گھٹنوں کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا کریں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے آگ کے یہ شعلے ہم پر برستے رہے اور ہم ہر شعلہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے ولی صفت بادشاہ کی بھی یہ حالت تھی کہ جب وہ اس شعلہ کی گرج سناتا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔

وہ یہ دعائیں کرتے رہے اور آگ کی اس بارش نے ان کی تمام برجیوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ تیرھویں صدی میں عیسائیوں کی کیفیت تھی۔ اس کے پانچ سو سال بعد جب اٹھارویں صدی میں نیپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامعہ ازہر میں بخاری شریف کا ختم شروع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم اختتام تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

یہ اٹھارویں صدی کا ذکر ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا ہے تو امیر بخارا نے حکم دے دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ”ختم خواجگان“ پڑھا جائے چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، ادھر ختم خواجگان میں لوگ بیٹھے یا مقلب القلوب یا متحول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ لیکن توپیں جیت گئیں اور یہ دعائیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔

اور یہ کچھ مصر اور بخارا تک ہی محدود نہیں۔ اب تو ہمارا عام شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ ادھر کوئی قومی مصیبت آئی اور ادھر ہم نے مسجدوں میں دعائیں مانگنا، مناجاتیں پڑھنا اور اذانیں دینا شروع کر دیں۔ سکولوں میں آیت الکرسی کے ورد کے لئے چاندنیاں، کچھ گئیں اور مزاروں پر ختم خواجگان شروع ہو گئے۔ آپ نے جمعہ کے ہر خطبہ میں خطیب صاحب کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ — اَللّٰهُمَّ دَسِّرْ دِيَارَ هُمْ — یا اللہ! تو اسلام کے دشمنوں کی بستیوں کو تباہ کر دے۔ اَللّٰهُمَّ شَتِّتْ شَمْلَهُمْ — یا اللہ! تو ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دے۔ ہم صدیوں سے اپنے خطبوں میں یہ دعائیں

مانگتے اور سامعین ان پر نہایت خشوع و خضوع سے اِٰمِیْن، اَللّٰهُمَّ اِٰمِیْن کے نعرے بلند کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسلام کے دشمنوں کی بستیاں دن بدن ترقی کرتی اور ان کی اجتماعیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اذافوں میں بے شک زلزلہ انگیز قوت اور دعاؤں میں لاریب جمعیت خاطر کا سامان ہوتا ہے لیکن انہی کی اذافوں اور دعاؤں میں جن کے بازو غار اشکاف اور جن کے حوصلے آہن گداز ہوں

قبول حق ہیں فقط مردِ حُر کی تجویز!

بہر حال ہم اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ یہودیوں کو ابد الابد تک حکومت نصیب نہیں ہو سکتی اور انہوں نے اسلام دشمن اور مسلم کش سلطنتوں کی مدد سے پہلے فلسطین کے ایک حصے میں اپنے قدم جمائے اور اس کے بعد اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لی کہ جب ۱۹۴۷ء میں ان سے عربوں کا ٹکراؤ ہوا تو انہوں نے چھ گھنٹے کی جنگ میں انہیں ایسی فاش شکست دی کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی اور یوں ہماری ان خوش فہمیوں کے پردے چاک ہو گئے کہ یہودیوں کو ابد الابد تک حکومت نہیں مل سکتی اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے اس عظیم دعوے کی صداقت بھی سامنے آ گئی کہ لَیْسَ بِاَمَانِیْکُمْ وَاَوْاَمَانِیْ اَہْلِ الْکِتٰبِ ۝ (۴/۱۲۳) قوموں کی تقدیروں کے فیصلے کسی کی خوش فہمی کی رو سے نہیں ہوا کرتے۔ ان کے فیصلے ان کے اپنے اعمال و کردار کے مطابق ہوتے ہیں اور یہی اس باب میں حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔

## باجہکام تورات

بنی اسرائیل کی داستان تو ختم ہو گئی لیکن ابھی اس پیغام ربانی کی داستان باقی ہے جس کے اتباع سے اس قوم کو غلامی اور محکومی کے عذاب سے نجات ملی اور وہ شوکت و ثروت کی بلندیوں پر سرفراز ہوئی اور پھر جسے چھوڑ دینے سے نکتہ واد باد کے عمیق جہنم میں ایسی گری کہ وہاں سے ابھرنا نصیب نہ ہوا۔ اصل موضوع تک آنے سے پیشتر چند الفاظ تمہیداً ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ جس حقیقت کی طرف اب اشارہ ہوگا اسے ہم (ابلیس و آدم میں) رسالت کے عنوان میں مختصراً لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید وہ مضمون اس وقت آپ کے ذہن میں مستحضر نہ ہو، اس کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ بات نکھر کر سامنے آجائے۔

**وحدتِ ادیان کی حقیقت** | مختلف مذاہبِ عالم پر نگاہ ڈالتے۔ ان کی باہمی آویزش و کشمکش سے یوں معلوم ہوگا جیسے ایک منڈی میں مختلف دوکاندار بیٹھے ہیں ان میں سے ہر ایک، گاہکوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے اپنے مال کی خوبیاں اور دوسرے کی برائیاں بیان کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اصل ”سکتہ بند“ مال صرف اسی کے ہاں سے ملے گا۔ دوسروں کے ہاں خالص مال نہیں ہے لیکن اس باہمی رقابت اور چشمک میں اسلام نے بالکل نئی تعلیم پیش کی ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ مختلف اقوامِ عالم کی طرف مختلف زمانوں میں، اللہ کا پیغام آتا رہا۔ ہوتا یہ تھا کہ خدا کا ایک رسول آتا وہ اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تک لوگ اس پیغام کی حفاظت و اتباع کرتے۔ پھر وہ پیغام یا تو حوادثِ ارضی و سماوی سے ضائع ہو جاتا یا ذہنِ انسانی اس میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتا اور یوں خدا کا پیغام اپنی اصلی اور منترہ شکل میں باقی نہ رہتا۔ اس کے بعد دوسرا رسول آجاتا جو پہلے پیغام کو (جس شکل میں وہ موجود ہوتا) حشو و زوائد سے پاک کر کے، اس کے اصلی رنگ میں پیش کرتا۔ اس طرح وہ سابقہ پیغام اصولی طور پر پھر سے اپنی اصلی شکل پر آجاتا اور اس کے

ساتھ ہی زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، سابقہ ہدایت کی جن جزئیات میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی یا جو جدید جزئیات دی جانی مقصود ہوتیں، ان کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ ہدایات کے اس مجموعہ کو اس نئے رسول کی کتاب کہا جاتا۔ اس سے واضح ہے کہ ان تمام پیغامات کا سرچشمہ ایک ہی تھا اور ان کی تعلیم بھی اصولی طور پر ایک۔ البتہ ان کی جزئیات میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے، رد و بدل اور حک و اضافہ ہوتا رہتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے گذر کر عالمِ شباب تک پہنچی۔ اب وقت آچکا تھا کہ خدا کے ان تمام پیغامات کو ان کے اصلی رنگ میں یک جا کر دیا جائے اور نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے جو کچھ درکار ہو وہ سب محفوظ و مصنون شکل میں انسانوں کو دے دیا جائے جو قیامت تک کے لئے ان کی ہدایت کا نصاب بن سکے۔ اس مجموعہ ہدایات کا نام ہے ”قرآنِ کریم“ جس پر نہ حوادثِ ارضی و سماوی اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ اس میں ذہنِ انسانی کی آمیزش کا کوئی امکان ہے۔ لہذا قرآنِ کریم کی رو سے، اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان لانا ضروری ہے کہ تمام انبیائے کرام خدا کے فرستادہ تھے اور ان کے آوردہ پیغامات کا سرچشمہ علمِ الہی تھا۔ اس لئے وہ تمام رسولِ سچے اور ان کے پیغامات (ما انزل علیہم جو کچھ ان پر نازل ہوا تھا) برحق تھے۔ لیکن اب صفحہٴ ارض پر وہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنِ کریم کے اندر ہیں، اس کے باہر کہیں نہیں۔ اس لئے اب اطاعتِ خداوندی صرف قرآنِ کریم کی رو سے ہو سکتی ہے۔ (یہ حقیقت کہ آج صفحہٴ ارض پر فی الواقعہ، قرآن کے علاوہ کوئی آسمانی کتاب اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں، بہت اہم ہے۔ اسے اپنے مقام پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا)۔ اس لئے قرآنِ کریم جب سابقہ انبیائے کرام یا دیگر آسمانی کتابوں کا ذکر کرتا ہے تو قیبانہٴ چشمک سے نہیں بلکہ اس طرح جیسے ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا تفصیلی تذکرہ تورات کا ہے۔ سورۃ آلِ **تنزیلِ تورات** | عمران میں ہے کہ قرآن سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے تورات و انجیل کو نازل فرمایا۔

(۳/۲۱)

**تورات** | اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ”تورات“ صرف اس کتاب کا نام نہیں جسے پھر

موسےٰ پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسےٰ اور ان کے بعد کے انبیائے بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتی رہیں۔ ان میں سے حضرت داؤد کی کتاب زبور اور حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل کا نام (قرآن میں) الگ آیا ہے۔ باقی تمام انبیائے بنی اسرائیل کے مجموعہ کتب کو تورات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ لہذا، جب تورات کی نسبت حضرت موسیٰ کی طرف کی جائے گی تو اس سے مراد ”کتاب موسیٰ“ سے ہوگی۔ یہ کتاب بھی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کی طرف نازل شدہ وحی کا مجموعہ تھی۔ اس لئے کہیں اس کی نسبت حضرت موسےٰ کی طرف ہے اور کہیں دونوں کی طرف۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے:

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(۲/۵۳ نیز ۲/۸۷، ۲۳/۳۵، ۲۵/۱۸، ۸۷/۱۹)

اور جب موسیٰ کو الکتاب یعنی (حق اور باطل میں) فرق کرینے والی عطا فرمائی تاکہ تم پر (سعادت و فلاح کی) راہ کھل جائے۔

اور سورۃ انبیاء میں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَ هَارُونَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَاءً وَ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (۲۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے موسےٰ اور ہارون کو فرقان (یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی

کتاب) اور (وحی الہی کی) روشنی اور شقیوں کے لئے نصیحت دی تھی۔

سورۃ الشُّفٰت میں اس کی مزید وضاحت فرمادی گئی جہاں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَى وَ هَارُونَ ۚ وَ نَجَّيْنَاهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ

الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۚ وَ نَصَرْنَاهُمْ فَاكَاوَا هُمُ الْغَالِبِينَ ۚ وَ آتَيْنَاهُمَا

الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ۚ (۱۱۴-۱۱۷)

اور بلاشبہ ہم نے موسےٰ و ہارون پر احسان کیا اور انہیں اور ان کی قوم کو سخت بے چینی

سے نجات دی۔ ان کی ہم نے مدد کی تو وہی غالب ہو کر رہے اور (دیکھو) ہم نے دونوں کو

واضح کتاب عطا فرمائی۔

ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت موسےٰ اور حضرت ہارون دونوں کو کتاب ملی تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی بلا کتاب آتا ہے اور اس کی سند میں حضرت ہارون کو پیش کیا جاتا ہے یہ نبی کے مقام اور قرآن کی تصریحاً

سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کوئی نبی یا رسول بلا کتاب آہی نہیں سکتا تھا۔ (تفصیل اس اجمال کی، "ابلیس و آدم" باب رسالت میں ملے گی)۔

بہر حال، تورات، ان تمام کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو مختلف انبیائے نبی اسرائیل کو ملتی رہی تھیں۔ اس کی تائید قرآن کے مختلف مقامات سے ہوتی ہے۔ مثلاً

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ الْتُورَةَ فِيهَا هُدًى وَ نُورٌ جُجْ..... شُهَدَاءُ جُ

(۲۳/۴۹ : ۱۷/۲۰)

بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کے نبی جو احکام الہی کے) فرما رہے تھے، اسی کے مطابق یہودیوں کو حکم دیتے رہے۔ نیز ربی اور احبار (یعنی یہودیوں کے علماء و مشائخ) بھی اسی پر کاربند رہے، کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس (کے احکام و ہدایات) پر گواہ تھے۔

کتاب موسیٰ میں ان احکام کی تفصیل موجود تھی جو بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے تھے۔ (۲۸/۴۳ : ۱۵/۴)

یہ ضابطہ خداوندی ایسا راہ نما تھا جس کے اتباع میں خدا کی رحمتوں کا نزول ہوتا تھا۔ وَ مِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَ رَحْمَةً

(۱۱/۱۷) "اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ کی کتاب (نازل ہوئی تھی) جو پیشوا اور رحمت تھی۔" (نیز دیکھئے

۲۴/۱۲ : ۲۸/۴۹)۔ اعمالِ صالحہ کے جن درخشندہ نتائج کا ذکر قرآن کریم میں ہے، تورات (و انجیل) میں بھی

ان کا تذکرہ تھا (۹/۱۱۱)۔ حتیٰ کہ قدوسیوں کی اس جماعتِ حقہ کے آثار و علامات بھی اس میں موجود تھیں،

جن کے ہاتھوں حضور خاتم الانبیاء کے عہدِ مبارک میں خدا کی حکومت کو زمین پر قائم ہونا تھا (۲۸/۴۹)۔ یہ

تھی وہ کتاب جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو عطا کی گئی۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنا مسلمانوں کے

لئے ضروری ہے۔ ۸۴۱ — ۳/۸۵

ایمان کا انزال پر ہے (یہاں اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ مَا أُنْزِلَ) جو کچھ ان حضرات انبیائے کرام پر نازل کیا گیا تھا، پر ایمان رکھنا ضروری ہے

نہ کہ ان کتابوں پر جسے آج یہ اہل کتاب اپنی آسمانی کتابیں کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جن کے متعلق قرآن کریم میں

واضح طور پر موجود ہے کہ وہ متحرّف کتابیں ہیں اصلی نہیں ہیں۔

اسی کتاب کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا گیا تھا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَ أَوْثَقْنَا بِنَبِيِّ إِسْرَآئِيلَ الْكِتَابَ هَٰ هُدًى  
ذِكْرًا لِّرَاوِدِي الْأَلْبَابِ ۝ (۵۳-۵۴/۴۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (ہدایت عطا فرمائی اور بنی اسرائیل کو اس کا وارث بنادیا۔ اس میں عقل والوں کے لئے سامانِ ہدایت و نصیحت تھا۔

لیکن ان وارثین کتاب اللہ نے اپنے ورثہ کے ساتھ کیا کیا؟ انھوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ کچھ حصّہ چھپالیا، باقی میں الحاق و تحریف کر دی جس کا نتیجہ یہ کہ جسے آج تورات کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ آسمانی کتاب ہونے کے بجائے مختلف افسانوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے جسے انسانی دماغوں نے تراشا تھا (۶/۹۲) یعنی انھوں نے اصلی کتاب میں تحریف کر دی (۲/۷۵۱)۔ یہ تحریف صرف معنوی نہ تھی بلکہ الفاظ میں بھی رد و بدل کر دیا جاتا تھا يَحْرِفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (۵/۴۱ ذ ۴/۲۶)۔ کہیں اس میں اپنی طرف سے اضافے کر دیے جاتے تھے۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ق ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ  
عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ  
أَيْدِيهِمْ وَ وَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝ (۲/۷۹ ذ ۳/۷۷)

پس افسوس ان (رعیانِ علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے (یعنی اس خود ساختہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتابِ الہی کے احکام میں) اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کر لیں۔ پس افسوس اس پر جو کچھ ان کے ہاتھ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں!

ادریوں تلبیسِ حق و باطل کر دیتے تھے۔

لے تورات کی تاریخ میری کتاب ”مذہبِ عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی۔ اصل تورات صنائعِ ہونگنی تھی جو وہ تورات بعد میں از سر نو مرتب ہوئی اور اس میں بھی رد و بدل ہوتا رہا۔



يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَ  
أَنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (۳/۷۱)

اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملا جلا کر مٹاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو،  
حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اصلیت کیا ہے؟)

تاکہ اس سے دنیاوی مقاصد حاصل کئے جائیں (۳/۱۸۴)۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کے نصاب زندگی کی  
یہ حالت ہو جائے تو اس میں کس قدر اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۖ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ  
مِنْ رَبِّكَ لَفُضِّى بَيْنَهُمْ ۖ وَ إِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝ (۱۱/۱۱۰)  
اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی۔ پھر اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر تیرے پروردگار نے پہلے  
سے ایک بات نہ ٹھہرا دی ہوتی (یعنی یہ کہ دنیا میں خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہر عمل  
عمل ملتی ہے) تو البتہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور ان لوگوں کو اس کی نسبت شبہ ہے کہ  
حیرانی میں پڑے ہیں۔

لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ سنت اللہ تھی کہ جب کسی رسول کا پیغام اس طرح مسخ ہو جائے  
ابلیسی ہاتھ اس میں اس طرح تحریف و الحاق کر دیتے، تو اللہ تعالیٰ دوسرے رسول کو بھیج کر اس حشو و  
زدائد کو الگ کر دیتا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا إِذَا تَمَتَّىٰ أَلْقَى  
الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ۖ فَيَلْسَنُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ  
اللَّهُ أَيْتَهُ ۖ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ  
پیش آیا کہ جو تعلیم خداوندی انھوں نے پیش کی تھی، اس میں شیطانی ہاتھ ملا دے کر دیتے تھے۔  
اس کے بعد خدا پھر (ایک اور رسول کو بھیج کر) ایسا کرتا کہ اس انسانی آمیزش کو مٹا دیتا اور اپنے  
قوانین کو محکم طور پر دے دیتا اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

لیکن وہ لوگ جن کے دل غیر خدا کی تعلیم کو مرغوب رکھتے وہ اس جدید پیغام خداوندی کی مخالفت

کرتے (۲۲/۵۳)۔ اور جو علم صحیح سے بہرہ یاب ہوتے وہ علی وجہ البصیرت اس کی حقانیت پر ایمان لاتے تھے (۲۲/۵۴)۔ قرآن کریم اسی سنتِ خداوندی کے ماتحت اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا (۵/۱۵)۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہود نے اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کی اور سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کی ہلاکت پر مہر ثبت ہو گئی کہ جو قوم اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں نہیں ڈھالتی اس کی ہلاکت یقینی اور اس کی بربادی اٹل ہے۔

یہ ہے کتابِ موسیٰ کے متعلق قرآن کریم کا بیان۔ غور کیجئے کہ ایسی خندہ پیشانی اور کشادہ نگہی سے کسی ”دوسرے مذہب“ والوں کی کتاب کی اصلی عظمتوں کا اعتراف، قرآن کریم کے علاوہ کہیں اور بھی ملتا ہے؟ باقی رہا یہ کہ اس کے باوجود قرآن کریم ان کتابوں کو کیوں ناقابلِ اعتبار قرار دیتا ہے، تو اس کی وجہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہی ہے کہ یہ کتابیں آج دنیا میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

## باجسم بعض ضمنی گوشے

اصلی بحث تو ختم ہو گیا، لیکن بعض ضمنی چیزیں ایسی ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

**کَلِمَ اللّٰہِ** اللہ تعالیٰ نے یوں تو اپنے تمام پیغامات (وحی) کو اپنا کلام کہا ہے (مَثَلًا یُرِیْضُ ذُنَّ اَنْ یَّتَبَّنَ ذُوْا کَلَمَ اللّٰہِ (۳۸/۱۵) ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالیں“ یا ذَرَانُ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اَسْتَجَادَکَ فَاجِرًا حَتّٰی یُسْمِعَ کَلَمَ اللّٰہِ..... (۹/۶) اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے.....) لیکن حضرت موسیٰ کے متعلق خصوصیت سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ہمکلامی سے سرفراز فرمایا۔ وَ کَلَمَہُ

کرتے (۲۲/۵۳)۔ اور جو علم صحیح سے بہرہ یاب ہوتے وہ علی وجہ البصیرت اس کی حقانیت پر ایمان لے آتے (۲۲/۵۴)۔ قرآن کریم اسی سنتِ خداوندی کے ماتحت اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا (۵/۱۵)۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہود نے اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کی اور سخت مخالفت کی جس کی وجہ سے ان کی ہلاکت پر مہر ثبت ہو گئی کہ جو قوم اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں نہیں ڈھالتی اس کی ہلاکت یقینی اور اس کی بربادی اٹل ہے۔

یہ ہے کتابِ مونسؑ کے متعلق قرآن کریم کا بیان۔ غور کیجئے کہ ایسی خندہ پیشانی اور کشادہ نگہی سے کسی ”دوسرے مذہب“ والوں کی کتاب کی اصلی عظمتوں کا اعتراف، قرآن کریم کے علاوہ کہیں اور بھی ملتا ہے؟ باقی رہا یہ کہ اس کے باوجود قرآن کریم ان کتابوں کو کیوں ناقابلِ اعتبار قرار دیتا ہے، تو اس کی وجہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہی ہے کہ یہ کتابیں آج دنیا میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

## باجسم بعض ضمنی گوشے

اصلی بحث تو ختم ہو گیا، لیکن بعض ضمنی چیزیں ایسی ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

**کَلِمَ اللّٰہِ** اللہ تعالیٰ نے یوں تو اپنے تمام پیغامات (وحی) کو اپنا کلام کہا ہے (مَثَلًا یُرِیْضُ ذُنَّ اَنْ یَّتَبَّنَ ذُوْا کَلَمَ اللّٰہِ (۳۸/۱۵) ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل ڈالیں“ یَا دَا اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اَسْتَجَارَکَ فَاجِرٌۭ حَتّٰی یُسْمَعَ کَلَمَ اللّٰہِ..... (۹/۶) اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے....) لیکن حضرت مونسؑ کے متعلق خصوصیت سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ہمکلامی سے سرفراز فرمایا۔ وَ کَلَمَہُ

دَبَّہُ (۴/۱۴۳) ”اس کے رب نے اس سے کلام فرمایا۔ یا مثلاً سورۃ نسا میں ہے وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰی  
تَکَلِّمًا ؕ (۴/۱۶۴) اور اللہ نے موسیٰ سے خوب باتیں کیں: سورۃ اعراف میں ہے۔

قَالَ یٰمُوسٰی اِنِّیْ اصْطَفٰیْکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلَتِیْ وَ بِکَلَامِیْ نِصْرَ  
فَخُذْ مَا اتٰیْکَ وَ کُنْ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۝ (۴/۱۴۴)

خدا نے کہا، اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔ پس جو چیز  
تجھے عطا فرمائی ہے (یعنی احکام شریعت) اسے لے اور شکر بجالا۔

ندائے جمال، کس طرح حضرت موسیٰ کے لئے فردوسِ گوشِ بنتی تھی، اس کا ذکر تجلیاتِ طور کی روشنی میں  
گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ہمکلامی بھی وحی کا ایک اسلوب  
تھا۔ سورۃ شعرا میں ارشاد ہے۔

وَ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحِیًا اَوْ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ اَوْ  
یُرْسِلَ رَسُوْلًا فِیْوَحِّیْ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلٰی حٰکِمٍ ؕ (۴۲/۵۱)

اور کسی انسان کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر یہ کہ وہ وحی بھیج دے یا  
پس پردہ اپنے کلام سے نواز دے یا کوئی رسول بھیج دے جو باذنِ خداوندی لوگوں تک  
خدا کی وحی پہنچائے (اور بس)۔ بلاشبہ وہ (بڑا ہی) بلند مرتبہ اور (اپنے تمام کاموں میں)  
حکمت رکھنے والا ہے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسانوں سے خدا کی ہمکلامی کے تین طریقے ہیں۔ پہلے دو طریقے، انبیاءِ کرام  
کے ساتھ ہمکلامی کے ہیں اور وہ میں بذریعہ وحی یا پس پردہ گفتگو۔ اور تیسرا طریقہ ہے عام انسانوں  
(انبیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں) سے ہمکلامی کا۔ یہ طریقہ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی طرف وحی  
کرتا ہے اور وہ نبی اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیتا ہے جس طرح آج ہم سے خدا قرآن کے ذریعے ہم کلام  
ہوتا ہے۔ یہ پس پردہ گفتگو وہ شرف تھا جس کا ذکر حضرت موسیٰ کے تذکرہ کے ضمن میں کیا گیا ہے جیسا کہ  
(ابلیس و آدم میں) وحی کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، وحی اور اس کے جملہ تضمنات، نبوت کی خصوصیت  
میں سے ہیں جو غیر از نبی کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ ہمکلامی ایسی  
تھی جیسے دو انسان پس پردہ ایک دوسرے سے باتیں کریں۔ وحی کے معاملہ میں ہم سے مطالبہ ایمان (مان لینے)

کا ہے عرفان پہچان لینے کا نہیں۔ اگر یہ ہمکلامی (یا کم از کم اللہ کی آواز کو عام کانوں سے سُن لینا) عام انسانوں کے حیطہ امکان کی چیز ہوتی، تو بنی اسرائیل کے جو ستر منتخب افراد تجلی گاہ طور پر اس غرض کے لئے گئے تھے کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، انہیں کم از کم اس ندائے پس پردہ سے شرف اندوز کر دیا جاتا۔ لیکن یہ صرف خاصۂ نبوت تھا اور اس کی ماہیت و کیفیت صرف نبی ہی سمجھ سکتا ہے اور اب جبکہ سلسلہ نبوت ہی ختم ہو چکا ہے تو اس کیفیت کو کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا۔ واضح رہے کہ یہ جو ہم نے اوپر کہا ہے کہ وحی کی ماہیت، غیر از نبی کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی، تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حقیقت کہ وحی کس طرح آتی تھی، اس کا القاء کس طرح قلبِ نبوی پر ہوتا تھا، جبریل کا فریضہ کیا تھا، ندائے خداوندی کی کیفیت کیا تھی، یہ امور غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ لیکن وحی کی رو سے جو تعلیم دی جاتی تھی اسے ہر حساب ہوش سمجھ سکتا تھا اور سمجھ سکتا ہے۔

**۲۔ شرح صدر** جب حضرت موسیٰؑ کو (مدین سے واپسی پر) حکم دیا تھا کہ جاؤ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے چھڑاؤ، تو یہ ہم ایسی عظیم الشان اور زہرہ گداز تھی کہ آپ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۖ وَ يَضِيقُ صَدْرِي ۖ وَ لَا يَمُتْ لِي لِسَانِي فَأُرْسِلُ إِلَىٰ هَرُونَ ۚ (۱۲۱-۱۲۳/۲۶)

موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے اور (نتیجہ میں) میرا سینہ (رنج و غم سے گھٹے گا اور) تنگ ہو جائے گا اور نہ میری زبان چل سکے گی۔ تو اپنا یہ حکم (میرے) بارون کے پاس بھی بھیج دے (تاکہ وہ اس ہم میں میرا ہاتھ بٹا سکے)۔

آنے والے خطرات کے انداز سے حضرت موسیٰؑ کے قلب پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے متعلق دوسری جگہ آپ کی دعا، ان الفاظ میں مذکور ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۖ وَ يَسِّرْ لِي أَمْرِي ۖ وَ اجْعَلْ لِي ذُرِّيًّا عَقْدًا ۖ وَ مِّنْ لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۖ وَ اجْعَلْ لِّي ذُرِّيًّا مِّنْ أَهْلِ ۖ هَرُونَ ۚ أَخِي ۖ أَشَدُّ بِهِ أَزْرِي ۖ وَ

اَشْرِكُهُ فِيْ اَمْرِىْ ۚ كَىْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۚ وَ نَذْكُرُكَ كَثِيْرًا ۝ (۳۴-۳۵/۲)  
 موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کراہ  
 کی کوئی دشواری بھی غالب نہ آ سکے) میری زبان کی گرہ کھول دے کہ (خطاب و کلام میں پوری  
 طرح رواں ہو جائے اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ نیز میرے گھروالوں میں سے میرے  
 بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے وہ میرے کام میں میرا  
 شریک ہو۔ ہم (دونوں مل کر) تیرے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں پوری طرح تنگ و تازہ کیں  
 اور تیرے قانون کو غالب کرنے میں بیش از بیش قدم اٹھا سکیں۔

اس سے "ضیق صدر" اور "شرح صدر" کا مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔

ذرا تصور میں لائیے کہ ایک رسول کا مشن (فریضہ زندگی) کیا ہوتا ہے؟ باطل کی ہر روش کے خلاف  
 دعوت انقلاب! ظاہر ہے کہ اس دعوت کا نتیجہ ساری دنیا سے مخالفت مول لینا ہے۔ اس مخالفت  
 میں ہر قسم کے حربے استعمال کئے جائیں گے۔ طعن و تشنیع کی لوک سناں سے لے کر تلوار کے گھاؤ تک،  
 ہر حربہ جس ہستی کے سپرد اس قسم کی عظیم شان ہم کی جائے اس کی ذمہ داریوں کے بوجھ کا اندازہ لگایا جاسکتا  
 ہے۔ اگر وہ اس بوجھ کے نیچے ایسا دب جائے کہ اٹھنے کی ہمت نہ رہے تو اس کی شکست ایک فرد کی  
 شکست نہیں، ایک عظیم الشان سکیم کی ناکامی ہوگی۔ اس لئے ایسے قائد کے لئے ضروری ہے کہ آنے والے  
 خطرات سے اس کے دل میں تنگی (ضیق صدر) پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس کا سینہ اتنا کشادہ کر دیا جائے کہ دنیا بھر کے  
 خطرات و ہمتا اس کے اندر سما جائیں اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ وہ ایسا وسیع النظر ہو کہ جب اُسے  
 مخالفین پر غلبہ حاصل ہو تو ان سے بڑی کشادہ نگہی سے پیش آئے، تنگ نظری کی انتقام جو یا نہ روش نہ  
 اختیار کر لے۔ اسی کا نام ہے شرح صدر، یعنی سینہ کی کشادہ و وسعت ظرف، حوصلہ کی بلندی، ہمتوں کی رفعت۔  
 دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کے داعی (حضور نبی اکرم) کے متعلق ارشاد ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ اِلَيْكَ ذَٰلِكُمْ فَهُوَ صَدْرُكَ اَنْتَ  
 يَقُوْلُوْا لَوْ لَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَلَمٌ اَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۖ اِنَّمَا اَنْتَ  
 نَذِيْرٌ ۖ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ وَكِیْلٌ ۝ (۱۲/۱۱)

پھر (اے پیغمبر!) کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ

دے گا اور اس کی وجہ سے دل تنگ رہے گا؛ اور یہ اس لئے کہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ اس آدمی پر کوئی خزانہ آسمان سے کیوں نہیں اُتر آیا؟ یا "ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ اکھڑا ہو جاتا؟" (نہیں تجھے تو دل تنگ نہیں ہونا چاہیئے) تیرا مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (انکار و بد عملی کے نتائج سے) خبردار کرنے والا ہے۔ (تجھ پر اس کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ تیری باتیں مان بھی لیں) اور ہر چیز پر اللہ ہی نگبان ہے۔

اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے سورہ حجر کی ذیل کی آیات پر غور فرمائیے۔

فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝  
الَّذِينَ يَخْتَفُونَ مَعَ اللَّهِ الْهٰٓا اٰخَرًا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۵/۹۶-۹۷)

پس جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے لوگوں پر آشکارا کرو اور مشرکوں کی کچھ پردانہ کرو۔ ان ہنسی اڑانے والوں کے لئے ہم تمہاری طرف سے بس کرتے ہیں (یہ ہنسی اڑانے والے) جو اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی معبود بناتے ہیں عنقریب معلوم کر لیں گے کہ حقیقت حال کیا تھی؟

"فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" اکتنا بڑا فریضہ ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اس دعوت کو لوگوں پر آشکارا کر دے اور یہ بھی کہ اس کی تکمیل کے لئے اپنی جدا گانہ تنظیم کر لے۔ بہر حال مقصد ایک ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فریضہ کی سرانجام دہی میں ہزاروں مشکلات کا سامنا ہو گا۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يٰصِدِّقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُوْنَ ۝ (۱۵/۹۷)

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ ان لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رُکنے لگتا ہے۔

لیکن اس کے لئے علاج کیا ہے؟ کیا دل چھوڑ کر بیٹھ جانا! معاذ اللہ!! ایسا نہیں۔ بلکہ احکام الہیہ کے اتباع میں اور زیادہ جذب و انہماک اور جوش و خروش سے سرگرداں ہو جانا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۚ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝ (۱۵/۹۸)

سوچا بیٹے کہ تم ربوبیتِ خداوندی کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری کوشش کرو

اور قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

جب یہ کچھ ہو جائے، تو اس کے بعد مخالفت کی تمام قوتوں کی شکست اور اپنے مقصد کی کامیابی یقینی ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝ (۱۵/۹۹)

اس کی اطاعت میں لگے رہو یہاں تک کہ یقین تمہارے سامنے آجائے۔  
اسی کا نام ”شرح صدر“ ہے۔ یہ تھا وہ گراں بہا انعام خداوندی جس کی یاد بعد میں حضور کو ان الفاظ میں دلا گئی۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۖ  
أَلْقَيْنَا ظَهْرَكَ ۖ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۖ (۱۱-۱۲/۹۳)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کیا ہم نے تمہیں سینے کی کشادہ نہیں عطا کر دی اور تم سے تمہارا بوجھ دور نہیں کر دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈالتا تھا اور تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند نہیں کر دیا؟

دیکھئے! دوسری اور تیسری آیت کس طرح پہلی آیت کی تشریح کر رہی ہے، ذمہ داریوں کے اس بوجھ کو ہلکا کر دینا جن کے تصور سے (گویا) کمر بہت ٹوٹی جا رہی تھی۔ یہ تھا شرح صدر اور اس کا نتیجہ؟ تمام غمخ افین کا سرنگوں ہو جانا اور اس داعی انقلاب کے علم بلند ہو جانا۔ اس کے بعد عزم و استقلال اور خطرات کے دروازوں کا مقابلہ کرنے کا راز دو آیتوں میں سمیٹ کر رکھ دیا جہاں فرمایا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ (۵-۶/۹۳)

پس بلاشبہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔

اور پھر فتح و کامرانی کے بعد، سہل انگاری اور تن آسانی نہیں بلکہ

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ (۷/۹۳)

چنانچہ (اے پیغمبرِ اسلام!) جب تم (ایک ہم سے) فارغ ہو جاؤ تو (دوسری کھلنے) جم کر کھڑے ہو جاؤ۔

شروع سے اخیر تک مجاہدانہ زندگی، ابتدا سے انتہا تک سعی و عمل اور اس سعی و عمل اور جہد و جہد کا مقصود؟

وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۖ (۸/۹۳)

اور اپنے پروردگار کی طرف اور زیادہ متوجہ ہو جا!۔

زمین پر اس کی حکومت کا قیام اور قیام کے بعد استحکام، یوں شرح صدر کیا جاتا ہے! لیکن اس قسم کے عمل پیہم اور استقلال و استقامت کی بنیاد کیا ہے؟ یقیناً محکم! اپنے نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل



ایمان، کوہ شکن یقین، اس قسم کا ایمان جس میں تذبذب کو کوئی دخل نہ ہو۔ نصب العین اس طرح آنکھوں کے سامنے واضح ہو جیسے سوج کی روشنی میں ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح صحیح نظر آتی ہے۔ جس کا شرح صدر ہوتا ہے اس کی نگاہوں کے سامنے ایسی ہی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ دَرِيهِ ۖ فََوَيْلٌ  
لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۗ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۳۹/۲۲)

تو کیا وہ شخص جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی پر ہے (سخت دل لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے) ہرگز نہیں! تو افسوس ہے ان لوگوں پر جن کے دل قوانین خداوندی کی طرف سے سخت ہو گئے ہوں۔ یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں! اس روشنی سے ہدایت (سیدھی راہ) سامنے آ جاتی ہے اور کچھ حصول مقصد میں کوئی کبیدگی محسوس نہیں ہوتی (۶/۱۲۵) اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو سیدھی "سلامتی کے گھر" کی طرف لے جاتی ہے۔ (۱۲۶/۱۶ - ۱۶۷/۱۶)

**۳۔ ضلالت** | حضرت موسیٰ کا قبطی کو تھپڑ مارنے کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے۔ جب آپ فرعون کے پاس دعوتِ ربانی لے کر آئے تو اس نے کہا کہ تم ہمارے مجرم ہو۔ تم نے ایک قبطی کو جان سے مار دیا تھا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذَا مَا أَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ۝ (۲۶/۲۰)

موسے نے کہا "ہاں میں اس وقت اس فعل کا مرتکب ہوا تھا۔

جبکہ میں ناواقفوں میں سے تھا۔

چونکہ عام طور پر ضلالت کے معنی "گمراہی" کے لئے جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے ذہن کے اس طرف منتقل ہو جانے کا امکان ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی گمراہی کا اقرار کیا۔ لیکن ضلالت کے معنی "دین کے صحیح راستہ سے بھٹک جانا" ہی نہیں، یہ لفظ وسیع المعانی ہے۔ اس کے معنی عام غلطی کے بھی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے والد .. .. (حضرت یعقوبؑ) کے متعلق کہا تھا۔

إِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ ۖ أَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا دَخُنْ عَصَبَةً ۖ

إِنَّ آبَانَا كَفَىٰ ضَلِيلٌ مُّبِينٌ ﴿۱۲/۸﴾

اور جب ایسا ہوا تھا کہ (یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں) کہنے لگے، ”ہمارے باپ کو یوسف اور اس کا بھائی (بن یامین) ہم سب سے بہت زیادہ پیارا ہے، حالانکہ ہم پوری ایک جماعت ہیں۔ (یعنی ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔“

اسی طرح جب حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کی بازیابی کے متعلق باتیں کرتے تھے تو یہ لڑکے کہتے کہ انہیں تو (معاذ اللہ وہی) پرانا ضبط سمار ہا ہے۔

قَالُوا تَأْتِيهِ إِذْكَ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۱۲/۹﴾

سننے والوں نے کہا، ”بجدا تم تو اب تک اپنے (اسی) پرانے ضبط میں پڑے ہو،“ (یعنی یوسفؑ کا تو نام و نشان بھی نہ رہا اور تمہیں اس کی واپسی کے خواب آرہے ہیں)۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے سوال کیا کہ گذرے ہوئے لوگ کس حال میں ہیں تو آپ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عَلِمْتُهَا عِنْدَ رَبِّي رَحِيٌّ كَتَبَ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى ﴿۱۲/۱۰﴾

موسیٰؑ نے کہا ”اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے۔ میرا پروردگار ایسا نہیں کھو جاتا یا بھول میں پڑ جائے۔“

یہاں بھی یَضِلُّ کے معنی واضح ہیں۔ پھر اس کے معنی کسی معاملہ کا صاف صاف دکھائی نہ دینا بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص راستہ کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پھر رہا ہے لیکن راستہ واضح طور پر سامنے نہیں آتا۔ وحی سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے (تفصیل ”ابلیس و آدم“ عنوان ”وحی میں گندہ چکی ہے“)۔ ان کا قلب صحیح راستہ کی تلاش میں مضطرب ہوتا ہے، لیکن صحیح راہ تو صرف وحی کی روشنی میں مل سکتی ہے۔ ان کی اس تجسس و تلاش اور کدوکاوش کی کیفیت کو بھی اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا۔

وَجَدَلْتُ ضَالًّا ذُو ضَلَالٍ ﴿۱۲/۱۱﴾

اور اے پیغمبرِ اسلام! خدا نے تمہیں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو اس نے تمہاری راہ نمائی کی۔

ان مقامات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ جب حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ ”اَنَا مِنَ الصَّالِّينَ“ میں ناواقفوں میں سے تھا۔ (تو اس سے مفہوم) (معاذ اللہ) دین کی راہ سے بھٹک جانا نہیں تھا بلکہ مراد یہ تھی کہ میں اس سے بے خبر تھا کہ مکہ مارنے سے وہ جان سے مر جائے گا۔

۴۔ قتل نفس | قصہ بنی اسرائیل میں، قتل کا ایک واقعہ بھی مذکور ہے جو سورۃ بقرہ میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

وَ إِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّعٰوْتُمْ فِيْهَا ۚ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُخَيِّ اللّٰهُ الْمَوْتِ ۚ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲/۷۳-۷۴)

اور پھر (غور کرو) وہ واقعہ جب تم نے (یعنی تمہاری قوم نے) ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور اس کی نسبت آپس میں جھگڑتے اور ایک دوسرے پر الزام لگاتے تھے اور (جرم کی) جوابات تم چھپانا چاہتے تھے خدا اسے آشکارا کر دینے والا تھا۔

چنانچہ ہم نے حکم دیا کہ ”اسے اس کے بعض حصے سے ضرب لگاؤ“ (جب ایسا کیا گیا تو حقیقت کھل گئی اور قاتل کی شخصیت معلوم ہو گئی) اللہ اسی طرح مُردوں کو زندگی بخشا اور ہمیں اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم فہم و دانش سے کام لو!

اَضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ خواب کثرت تعبیر سے پریشان ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ بات ویسی کی ویسی مشکل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کا صحیح مفہوم تاریخی انکشافات کی روشنی میں ہی متعین ہو سکتا ہے۔ جس طرح فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا بیان ایک تاریخی واقعہ تھا، صدیوں تک اس آیت کی تفسیر میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن جب تاریخ نے اپنے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو مصر کے تہ خانے میں اس آیت کی مجسم تفسیر نظر آ گئی۔ اسی طرح ’محولہ صدر واقعہ بھی تاریخ سے متعلق ہے۔ قیاس آرائیوں سے اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہو سکتا۔ یہ آیت ابھی متشابہات کی فہرست میں ہے۔ تاریخ اپنا کوئی اور ورق اُلٹے گی اور اس وقت یہ آیت، محکمات کی فہرست میں منتقل ہو جائے گی۔ ہم جو کچھ سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ توہم پرستیوں

سے لوگوں کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ذرا سے غلافِ معمول واقعہ کا سامنا نہیں کر سکتے اور اس کے احساس سے ان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی اور واقعہ قتل میں ان کی اسی نفسیاتی حالت کو تحقیق مجرم کا ذریعہ بنالیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ مشتبہ ملزموں میں سے ایک ایک شخص لاش کے قریب سے گزرے اور لاش کا کوئی حصہ اٹھا کر اس شخص کے جسم سے چھوڑا جائے، ملزم کی پہچان ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجرم کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ اس کے داخلی احساسات کی غماز بن گئی ہوگی۔ اس طرح جب مجرم کا تعین ہو گیا تو اس سے قصاص لے لیا گیا۔ قرآن نے قصاص کے متعلق کہا ہے کہ اس میں رازِ حیات پوشیدہ ہے (۲/۱۷۹)۔

بہر حال یہ ہمارا قیاس ہے، حقیقت اس وقت ہی سامنے آئے گی جب تاریخی انکشافات اس کی نقاب کشائی کریں گے۔

**قَارُونُ** ہم گزشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ، فرعون، ہامان اور قارون کی طرف مبعوث ہوئے تھے (۲۴/۴۰) اور فرعون و ہامان کے ساتھ، قارون بھی تباہ ہو بیواؤں میں سے تھا (۲۹/۳۹)۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، قارون سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ تھا اور قرآن کریم نے اس کا اسی خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ سورہ قصص میں ہے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاحِحَهُ لَذَنُوزًا ۖ بِالْعَصَبَةِ أُولَىٰ الْقُوَّةِ ۖ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ (۲۸/۷۶)

بلاشبہ قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا۔ مگر اکثر مال کی وجہ سے (وہ لوگوں پر تکبر اور ظلم کرنے لگا۔ ہم نے اسے اس قدر دولت دی کہ اس کے خزانے کئی کئی زور آور شخصوں کو گراں بار کر دیتے تھے۔ یاد کرو جب اس کی قوم نے اسے (سمجھاتے ہوئے کہا) ”اترامت! بلاشبہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اقتصاد سرمایہ داری کی بنیاد اور نوع انسانی کی بہت بڑی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر سچے داعی انقلاب کی طرح حضرت موسیٰ کی دعوت انقلاب بھی اس لعنت کے استیصال کے لئے تھی، لہذا اس دعوت کے غلاف

قارون کی بغاوت و سرکشی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ فساد (یعنی غیر خداوندی نظام) کا ہر شعبہ اصلاح کی مخالفت کرے گا اور چونکہ فساد کا منبع دولت اور قوت کا غلط استعمال ہے اس لئے قارون کو بھی مفسد کہا گیا ہے۔ چنانچہ سابقہ آیت سے متصل یہ آیت ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ لِنَفْسِكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ أَحْسَنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ  
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۲۸/۷۷)

اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا خدا نے جو کچھ تجھے دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت (کی بھلائی) کی بھی جستجو کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ بھی نہ بھول (یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں) اور خدا نے جیسا تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (اس کے بندوں پر) احسان کر اور زمین میں فتنہ و فساد کے درپے نہ ہو۔ بلاشبہ خدا فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن اس کے جواب میں قارون نے کیا کہا؟ وہی جو ہر سرمایہ دار کہا کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنے کسب و ہنر اور کاریگری کی بنا پر کیا ہے کسی دوسرے کو کیا حق حاصل ہے کہ اس پر پابندیاں عائد کرے۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۖ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَ أَكْثَرُ جَمْعًا ۖ وَلَا يُسْأَلُ عَن دُنُوبِهِمُ الْمُحْصِرُونَ ۝ (۲۸/۷۸)

قارون بولا کہ یہ تمام مال و منال تو مجھے اپنی ذاتی ہنرمندی کی وجہ سے ملا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ خدا اس سے پہلے گذشتہ امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت و حشمت میں اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور جمعیت میں بھی بالکثرت تھے اور ان کے جرائم اس قدر نمایاں تھے کہ ان کی بابت ان سے کچھ پوچھ گچھ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔

پھر سرمایہ داری کی عیش و عشرت کی زندگی بڑی باعث فریب نگاہ ہوتی ہے۔ ہر اس شخص کا جس کے سامنے حقیقت واضح نہ ہو جی لپچاتا ہے کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہو جائے۔

فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا لَئِن لَّمْ يَكُن لَّآدَمُ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو

حَقِظْ عَظِيمًا ۝ (۲۸/۷۹)

چنانچہ (ایک روز جب) قارون جب اپنی برادری کے سامنے اپنی شان و شوکت کے ساتھ نکلا تو وہ لوگ جو صرف دنیوی زندگی کی کامیابی ہی کے طلبکار تھے، کہنے لگے، ”اے کاش ہمیں بھی وہ ساز و سامن ملا ہوتا جو قارون کو ملا ہے۔ واقعی وہ بڑا ہی صاحب نصیب ہے۔“

لیکن جن کی نگاہیں حقیقت آشنا ہوں وہ جانتے ہیں کہ حقیقی زندگی کونسی ہے!

وَقَالَ الَّذِينَ اُذُنُوا الْعِلْمَ وَيُكَلِّمُ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ۚ دَلَّ يُلْقِيهَا اِلَّا الصَّابِرُونَ ۝ (۲۸/۸۰)

مگر جن لوگوں کو (دین کا) علم عطا ہوا تھا وہ (اُن حریصوں سے) کہنے لگے، ”تم پر افسوس ہے جو کچھ قوانین خداوندی کے مطابق ملتا ہے وہ ان لوگوں کے بہتر ہے جو ایمان لائے ہوں اور نیک اعمال کئے ہوں۔ مگر وہ (ثوابِ خداوندی) صرف انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو استقامت سے کام لیتے (اور اپنے آپ کو ہوائے نفسانی سے باز رکھنے والے) ہوں۔“

اس سے یہ مراد نہیں کہ حقیقت آشنا نگاہیں، دولت و حشمت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے دولت و ثروت، عزت و وقار، اللہ کے انعامات ہیں جن کے حصول کے لئے پوری پوری جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن حصولِ مال و دولت اور چیز ہے اور سرمایہ داری اور شے، مقدم الذکر نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہے اور ثانی الذکر انسانیت کا گلا گھونٹنے کی خاطر۔ اس لئے اس کا انجام ظاہر ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَ بَدَارِهِ الْأَرْضَ فَ تَفَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوهُ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ قَا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ۝ (۲۸/۸۱)

چنانچہ ہم نے قارون اور اس کے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ پھر نہ تو کوئی ایسی جماعت جوئی جو خدا کے برخلاف اس کی امداد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنی امداد کرنے والوں میں سے ہو سکا۔

یہی وہ انجام ہے جو ہر دیدہ اعتبار کے لئے باعثِ ہزار موعظت و عبرت ہے۔

وَ اَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَتُّوا مَكَانَهُ بِالْاَوْسِ يَقُولُونَ وَيَكَانَ اللَّهُ  
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَ يَقْدِرُ ۚ كُوَلَّا اَنْ مِّنْ  
اللَّهِ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بَنَّا ۙ وَ يَكَانَهُ ۙ لَوْ يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ۙ (۲۸/۸۲)

اور وہ لوگ جو کل اس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے ”رزق کی بسط و کشاد قارون خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر خدا نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم بھی اس کی طرح تباہ ہو جاتے۔ ناشکرے لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے۔“

قارون (قرح) کی اس بغاوت کا ذکر تورات میں بھی ہے۔

اور قورح بن اظہار بن قہات بن لاوی نے لوگ لئے اور واتن و ابیرام بنی الیاب اور اد بن قلت بنی رو بن ساٹھ تھے اور وہ او بنی اسرائیل میں سے بعض لوگ یعنی اڑھائی سو شخص جو سرگروہ اور نامی اور جماعت کے مشہور تھے موسیٰ کے مقابلہ میں اُٹھے اور وہ موسیٰ اور ہارون کی لفٹ پر جمع ہوئے اور انہیں کہا تو تم زیادتی کرتے ہو اس لئے کہ ساری جماعت میں ہر ایک شخص مقدس ہے اور خداوندان کے درمیان ہے تم کیوں آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا جانتے ہو؟ موسیٰ یہ سنکر مٹنے کے بل گرا۔ (گنتی ۱۶/۴۱)

اس کے بعد لمبی چوڑی تفصیل ہے کہ اس سرکش جماعت اور اس کے سرغنوں کی ہلاکت کس طرح ہوئی۔ یہودیوں کا مشہور مورخ جوزیفس 'JOSEPHUS' اپنی تاریخ 'Antiquity of the Jews' میں لکھتا ہے:-

قارون جس کا شمار اس کے نسب اور اس کی دولت دونوں کی وجہ سے ہے عبرانیوں کے مشاہیر میں سے تھا۔ اس نے موسیٰ کا اتنا زیادہ اعزاز دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ اسے ان سے حسد پیدا ہوا! اسے اس لئے بھی صدمہ زیادہ ہوا کہ وہ نسبتی اعتبار سے حضرت موسیٰ سے کم نہیں تھا اور اپنی ثروت کے اعتبار سے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا اور اس مرتبہ کا اپنے آپ کو مستحق گردانتا تھا چنانچہ اس نے حضرت موسیٰ کے خلاف تمام بنی لاوی کو (بالعموم اور) اپنے خاندان دونوں کو (بالخصوص) ابھارنا شروع کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ خدا کو اگر بنی لاوی میں سے کسی کو اس منصب کے لئے منتخب کرنا تھا تو موسیٰ سے زیادہ اس کا حقدار میں تھا۔ نسب میں میں ان کا ہمسر ہوں اور دولت اور عمر کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر۔ (حصہ ۴: باب ۲۲، فصل ۲)

جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ

قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے (حضرت یوسف نے جو خزانے مصر میں دفن کئے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ تین سو پچھروں کی ضرورت تو محض اس کے خزانہ کی کنجیوں کے اٹھانے کے لئے ہوتی تھی۔ (جلد ۷ صفحہ ۵۵۶)

ان بیانات اور قرآن کریم کی تصدیق سے واضح ہے کہ قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیمی کی زدِ براہِ راست سرمایہ داری پر پڑتی تھی اس لئے وہ اس دعوتِ حق و صداقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نظامِ خداوندی کے مخالف اپنی قوم سے ہوا یا غیروں میں سے۔ میزانِ خداوندی میں سب برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ بتاتے ہوئے بھی کہ (إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ) (۲۸/۷۶) ذکرِ فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کریم کی یہی وہ تقسیم ہے جس کے متعلق ”جوتے نور“ (بالخصوص قصہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم) میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے جہاں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”اپنے“ کون ہوتے ہیں اور ”بیگلنے“ کون۔

**۶۔ ہامان** | قصہ حضرت موسیٰ میں فرعون کے ساتھ ہامان کا ذکر بھی خصوصیت سے آیا ہے چونکہ تورات فرعون کے اس دستِ راست (ہامان) کے ذکر سے خاموش تھی۔ اس لئے عیسائی مستشرقین نے قرآن کریم کے اس بیان پر عجیب عجیب قسم کے اعتراضات شروع کر دیئے۔ حسی کہ سر ولیم تیسور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ تورات کی کتاب آستر میں فارس کے بادشاہ اخسیرس کے ایک وزیر (خواجہ سرا) مہومان (Mehuman) کا جو ذکر آیا ہے قرآن کریم میں (معاذ اللہ) اسے ہی غلطی سے فرعون کا وزیر سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن زمانہ تاریخی انکشافات کا منتظر تھا۔ جب تاریخ مصر کی یہ گم گشتہ کڑیاں برآمد ہوئیں تو ان میں ہامان مع اپنی خصوصیات کے ابھر کر سامنے آگیا۔

انسانی تاریخ کے ادوار پر نگاہ ڈالئے۔ ہر جگہ بادشاہت کے غلبہ و استیلا سے کہیں زیادہ عمیق اور شدید برہمنیت کا تسلط نظر آئے گا۔ بادشاہ تو خیر بادشاہی کرتا تھا برہمن (priest) ”خدائی“ کرتا

لے تاریخ کے ادوار تو ایک طرف ابھی کل تک سارا یورپ برہمنیت کے تسلط میں تھا اور وہاں بادشاہ کی حکومت نہیں بلکہ پادریوں ہی کی حکومت تھی۔ آج بھی غور سے دیکھئے تو انسانی قلوب برہمنیت (مذہبی پیشوائیت priesthood) کی عقیدت کے شکنجے سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکے۔



تھا، ایسی خدائی جس میں سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اس کی رعایا تھا۔ رفتہ رفتہ برہمنیت نے ایک نظام کی سی صورت اختیار کر لی جس میں مندر اور اس کے پجاری ایک الگ دنیا قائم کئے نظر آتے ہیں۔ مندروں کے ساتھ بڑی بڑی عظیم القدر جاگیریں وقف ہوئیں۔ مندر کا اسقف اعظم (Head priest) خاص امتیازات و اختیارات کا مالک ہوتا۔ یوں تو یہ صورت ہر ملک اور ہر زمانہ میں عام تھی، لیکن مصر کے جس دور کی تاریخ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں اس نظام برہمنیت نے ایک خاص ریاستی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، آمّن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ آمّن رع کے مندر کا بڑا پجاری شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ ڈاکٹر سٹنڈرٹوف اپنی کتاب "قدیم مصریوں کا مذہب" میں لکھتا ہے۔

آمّن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالیشان عمارت اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا ہرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمّن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے، بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام مندر کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمّن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سوین حصہ آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

یہ تھی آمّن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (Head priest) کی وجاہت و ثروت۔ یہی آمّن قرآن کریم کا ہامان ہے۔ (جیسے تغیر لفظی سے تورات یا مصر کا آرون (AARON) قرآن کریم میں ہارون ہو گیا)۔ ڈاکٹر سٹنڈرٹوف نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں 'مصر کا ایک قدیم مجسمہ ہے جس پر منقوش ہے کہ وہ آمّن کے سردار کاہن، لیکن نوٹس کا ہے جو رعیتیں ثانی کے زمانہ میں تھا۔ اب غور فرمایا

میں جس طرح قرآن کریم نے فرعون موسیٰ کا نام نہیں لکھا بلکہ اسے اس کے معروف لقب سے پکارا ہے، اسی طرح آمّن کا بھی نام نہیں لکھا بلکہ اس کا ذکر بھی اس کے لقب سے ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو ان institutions کی خصوصیات کا تذکرہ مقصود تھا، نہ کہ خاص افراد کی دقائق نگاری۔

آمن کا یہ سردار کاہن کس قدر اہمیت کا مالک تھا اور واقعہ بنی اسرائیل میں اس کا عمل و دخل کس قدر تھا۔  
السا ایکلو پیڈیا برٹانیکا میں (تحت لفظ مصر) مذکور ہے۔

فراعنہ مصر کے اٹھارویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے زمانہ میں آمن ررع (واقعہ تھیبس) کے کاہن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جن کی وجہ سے وہ بے حساب دولت و قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر BREASTED نے بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ مصر" میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔ (دوسرا ایڈیشن صفحہ ۵۲۶)

اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ ہامان اور اس کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا (۲۸/۸؛ ۲۸/۴) اور فرعون نے ہامان (محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظام روحانیت کے سب سے بڑے رکن) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند مینارہ تعمیر کرایا جائے جس پر چڑھ کر وہ (معاذ اللہ) حضرت موسیٰ کے خدا کو جھانک لے (۳۶/۳۷-۳۸)۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون کے ساتھ ہامان کی فسوں سازیوں کا تار و پود بکھیرنا بھی ضروری تھا۔ مندروں کے جن پجاریوں کے ساتھ حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہوا تھا وہ سب ہامان ہی کے فوج کے سپاہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق و صداقت کی مخالفت میں ملکیت کے جیوش و عساکر کے ساتھ ساتھ "روحانیت" کی افواج و سپاہ نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔

**یہودی لٹریچر میں نبی کے معنی** | ضمناً ایک اور اشارہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مصر میں آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ قرآن کریم میں نبی کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور جیسا کہ (ابلیس و آدم میں) رسالت کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، نبی اور رسول کا مفہوم ایک ہی ہے۔ لیکن یہودیوں کے لٹریچر میں نبی کا لفظ (نظام) ہیکل کے ایک ممتاز منصب دار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے کاہن۔ یہی نبی اور کاہن (اجبار و رہبان) ہیں جن کے بگڑنے سے یروشلم اور بنی اسرائیل پر تباہی آئی تھی۔ تورات میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح آئی ہے۔ مثلاً یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

نبیوں کی بابت میرا دل میرے اندر ٹوٹ گیا۔ میری ساری ہڈیاں کانپتی ہیں۔ خداوند کے سبب

اور اس کی مقدس باتوں کے سبب میں متوالا سا ہوں اور اس شخص کی مانند جو مے سے مغلوب ہو گیا۔ یقیناً زمین زنا کاروں سے بھر گئی۔ لعنت کے سبب زمین ماتم کرتی ہے۔ میدان کی چراگاہیں سوکھ گئیں کیونکہ ان کی عادت بُری ہے اور ان کا زور ناحق ہے کہ نبی اور کاہن دونوں ناپاک ہیں۔ ہاں میں نے اپنے گھر کے بچ ان کی برائی پائی خداوند فرماتا ہے۔ اس لئے ان کی راہ ان کے حق میں ایسی ہوگی جیسی پھسلتی جگہیں تاریکی کے دقت میں وہ ان میں کھدیڑے جا کے وہاں گریں گے کہ میں ان پر بلاؤں گا کہ یہ اُن سے انتقام لینے کا دقت ہے خداوند کہتا ہے۔ اور میں نے سامریہ کے نبیوں میں حماقت دیکھی ہے۔ انہوں نے بعل کی طرف سے نبوت کی اور میرے لوگ اسرائیل کو بھٹکایا ہے۔ میں نے یروشلم کے نبیوں میں بھی ایک ہولناک چیز دیکھی۔ وہ زنا کاری کرتے اور جھوٹ کے بیروہ ہوتے۔ وہ بدکاروں کے ہاتھوں کو بھی زور بخشے ہیں یہاں تک کہ کوئی اپنی برائی سے نہیں پھرتا۔ وہ سب میرے لئے ایسے ہیں جیسے کہ سدوم اور اس کے باشندے عمورہ کی مانند ہیں۔ اسی لئے رب الافواج نبیوں کی بابت یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں انہیں ناگدانا کھلاؤں گا اور بلا مل کا پانی پلاؤں گا کیونکہ یروشلم کے نبیوں کے سبب سے ساری سرزمین میں بے دینی پھیلی ہے۔ رب الافواج یوں کہتا ہے کہ ان نبیوں کی باتیں مت سنو جو تم سے نبوت کہتے ہیں وہ تم کو بطالت کی طرف مائل کرتے۔ وہ اپنے دلوں کے خواب خیالوں کو بیان کرتے ہیں اور نہ کہ وہ باتیں جو کہ خداوند کے منہ نکلیں۔ (یرمیاہ ۹ - ۲۳/۱۶)

اس لئے جن مشاہیر کو تورات نے نبی کہہ کر پکارا ہے یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ قرآنی مفہوم کے اعتبار سے بھی نبی تھے یا جنہیں نبی نہیں بلکہ کاہن (priest) کہا ہے وہ قرآنی اصطلاح میں نبی نہیں تھے، اس لئے کہ تورات میں تو حضرت ہارون کو بھی کاہن کہہ کر پکارا گیا ہے، حالانکہ قرآن کی رو سے وہ ایسے ہی نبی تھے جیسے حضرت موسیٰ۔

اور خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہارون کاہن کے بیٹے الیعزر کو فرما کہ عود سوز

لے یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان میں 'prophet' کا مفہوم قرآنی اصطلاح کا نبی نہیں بلکہ محض پیش گوئی (prophecy) کرنے والا ہے اور رسالت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب۔ (تفصیل اہلبیت و آدم، عنوان "وحی و رسالت" میں گزر چکی ہے۔

کو جملے ہوؤں میں سے اٹھا اور آگ وہیں بکھر دے کیونکہ وہ تو مقدس ہیں۔ (گنتی ۱۱۴/۳۷)  
لفظ نبی کے متعلق یہودی لٹریچر اور قرآنی مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان کا اختلاط اکثر غلط فہمیوں کا موجب بن جاتا ہے۔

**۷۔ حقیقتِ سحر** | ساحرین کے قصہ کے ضمن میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مفہوم کے اعتبار سے ان ساحرین سے مراد ہیں فرعونی مندروں کے باطل پرست علماء (پوجاری) اور ان کے سحر سے مفہوم ہے ان کی باطل تعلیم۔ اس مفہوم کے اعتبار سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ ”جادوگری“ کا نہ تھا بلکہ ایک غلط مذہب کے مقابلہ میں، خدائی دین کی صداقت و حقانیت کو جلال انگیز دلائل اور بشارت آمیز برائینِ نیرہ کے ذریعے پیش کرنا تھا۔ لیکن جو لوگ قرآن کے ان الفاظ (سحر اور ساحرین) کا مجازی مفہوم نہیں لیتے بلکہ انہیں حقیقی معنوں پر محمول کرتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ ”سحر“ کے متعلق جو کچھ کہا یا سمجھا جاتا ہے اسے بھی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ ذیل کی سطور سے یہی مقصود ہے۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں ہر معلول (effect) کے لئے ایک علت (cause) اور ہر نتیجہ کے لئے ایک سبب کی ضرورت ہے۔ بعض علل و اسباب ایسے ہیں جو ہر شخص کو دکھائی دیتے ہیں یا کم از کم ہر ایک کی سمجھ میں آجاتے ہیں یا یوں کہیے کہ وہ واقعات اس طرح التزائماً اور معمولاً ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں کہ ذہن انسانی ان سے مانوس ہو جاتا ہے اس لئے ان میں کچھ اجنبیت نہیں محسوس کرتا۔ لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اسباب عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے انسانی ذہن چونکہ ابھی تک اپنی مکمل پختگی تک نہیں پہنچا، اس لئے وہ ”عجائبات“ میں (بچوں کی طرح) بڑی کشش و جاذبیت محسوس کرتا ہے (پختہ فکر کی یہ کیفیت نہیں ہوتی)۔ کوئی واقعہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو اگر وہ عادتاً اور معمولاً اس کے سامنے ظہور پذیر ہوتا ہے تو اس کی طبیعت اس سے اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنی کسی ایسے واقعہ سے (خواہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ کتنا ہی ہیچ کیوں نہ ہو) جس کا سبب معلوم (یا محسوس) نہ ہو سکے۔ ایک طبیبِ حاذق کسی نہایت ہلک مرض کا کتنا ہی کامیاب علاج کیوں نہ کرے وہ اپنے اندر اتنی جاذبیت کبھی نہ رکھے گا جتنی ایک ایسا شخص جو پھونک مار کر کسی کے سرور کو ہٹا دے۔ اس لئے کہ اول الذکر کا سبب بدیہی ہے، یعنی ہر شخص کو معلوم ہے کہ مریض کو دوا کے اثر سے آرام ہوا ہے لیکن ثانی الذکر کا سبب

بڑا لطیف اور باریک ہے اور عام طور پر سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ پھونک مارنے سے درد کو کیسے آرام ہو گیا۔ اس لئے یہ موجب حیرت و استعجاب ہے۔ عربی زبان میں سحر اُسے کہتے ہیں جس کا سبب بہت لطیف اور دقیق ہو۔ تاریخ انسانی کے اولین اوراق لیتے۔ انسان کی یہ عجوبہ پسندی ہر مقام پر ابھری ابھری نظر آئے گی۔ اور ”اولین اوراق“ ہی کا کیا ذکر! عجوبہ پسندی تو آج بھی اکثریت کے دلوں میں چٹکیاں لیتی نظر آتی ہے۔ اس کی کشش و جاذبیت میں آج بھی ویسی ہی تازگی ہے۔ علم انسانی کی وسعت سے صرف اتنا ہوا ہے (اور ہو رہا ہے) کہ بہت سے واقعات و نتائج جن کے اسباب و علل کبھی نگاہوں سے اوجھل تھے اور اس لئے وہ ”سحر“ کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے، رفتہ رفتہ معمولی واقعات میں تبدیل ہوتے گئے (اور ہوتے جا رہے ہیں)۔ لیکن، بایں ہمہ جن واقعات کے علل اور جن نتائج کے اسباب، ابھی تک نگاہوں کے سامنے نہیں آ سکے ان کی جاذبیت بدستور قائم ہے۔ سوظاہر ہے کہ انسان جس قدر علم و بصیرت اور تجربات و مشاہدات کی دنیا میں پیچھے بٹتا جائے گا سحر و طلسم کی فسون کا ریاں اتنی ہی زیادہ ہوتی جائیں گی۔

یوں تو ’MAGIC‘ کا لفظ اشارہ کنایہ ہے کہ اس کی ابتداء نجومس (MAGIS) کے ہاں سے ہوئی۔ لیکن عصر حاضرہ کی تحقیق کا رخ اس طرف ہے کہ اسے سب سے پہلے ایک باضابطہ علم یا فن کی صورت قدیم مصری مذہب نے عطا کی۔ وہاں سے یہ یونان کی طرف گیا اور اس کے بعد بابل میں جو بعد میں اس کا مشہور مرکز قرار پایا گیا۔ (تفصیل اس کی حضرت سلیمانؑ کے عنوان میں ”سحر بابل“ کے تحت ملے گی)۔۔۔۔۔ یونان میں اس کی نسبت ایک افسانوی نام ’HERMES TRISMAGISTUS‘ کی طرف کی گئی ہے جہاں سے اسے ’HERMETIC SCIENCE‘ کا نام ملا ہے۔ یہ فن مشرق کے ظلمت کہوں میں ابھی تک اسی قدیم نقاب میں لپٹا چلا آتا ہے۔ لیکن ممالک یورپ میں سحر و جراثیم (occultism) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس کی سوسائٹیاں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء ایک عالم مثال (Astral world) ہے جس میں تمام موجودات عالم (افراد و حوادث) کے عکس موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ ماضی اور حال کے افراد و حوادث کی طرح مستقبل کے افراد

لے یہودیوں کے ہاں اس کا رواج کس طرح اور کس قدر ہوا، اس کا بیان بھی دیں ملے گا۔

حوادث بھی اپنی عکسی صورت میں اس عالم مثال میں موجود رہتے ہیں اور وہاں سے اس کائنات کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ عالم مثال اور ہمارے اس حواس کی دنیا میں باہمی تعلق ایک آفاقی عامل (universal agent) کے ذریعہ قائم ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ہمارے کمرۂ ارض کے ارد گرد ریڈیائی لہریں موجزن ہیں اور وہ ہر کربائی حرکت کو ایک ثانیہ میں ہر مقام پہنچا دیتی ہیں۔ یہی وہ عامل ہے جو ایک شخص کے خیالات کی دنیا کو دوسرے شخص کے ”عالم تخیل“ سے مربوط کئے ہوئے ہے، خواہ ان میں کتنا ہی بُعد مکانی کیوں نہ ہو۔ اب صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنا ہم نوا بنالیا جائے۔ جو ایسا کرے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قوتیں اس کے اشاروں پر ناپیں گی اور وہ وہ باتیں ظہور میں آئیں گی جو کسی کی عقل و فکر میں نہ آسکیں۔ اسی کا نام سحر، افسوس، طلسم، نیر سجات ہے۔ اس عامل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنی داخلی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ضروری ہے اور یہ ان ریاضتوں اور مشقتوں سے ہوتا ہے جو اس ”سائنس“ میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ ہیں مختصر اودہ بنیادیں جن پر اس فن کی ساری عمارت قائم ہے۔ عام طور پر سمجھا ہی جاتا ہے کہ اس فن سے مقصود فقط شعبہ ہائے ہے لیکن اس کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شعبہ بازی تو محض راستے کے مناظر ہیں۔ یہ دراصل ادراک حقیقت کا ذریعہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت وہی عالم مثال ہے اور اس کا ادراک اسی طریق سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں فن سحر نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اب بھی مشرق میں اسے عام طور پر یہی حیثیت حاصل ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اس فن کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو اس قدر نظم و ضبط میں لے آئے کہ اس سے اس قسم کی خلاف معمول (خارجی عادات) باتیں ظہور میں آنے لگ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ”داخلی قوتیں“ کیا ہیں جنہیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ان کا مطمح نگاہ ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات (psychologists) کی تحقیق ہے کہ انسان کی قوت متخیلہ یا قوت ارادی (will power) کو مختلف طریقوں سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ غالب قوت ارادی والا انسان اپنے سے کمزور قوت ارادی والے انسان کو اپنی قوت سے متاثر کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس اس کی مرضی کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں، یعنی اس کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو یہ دکھانا

چاہے۔ اس کے کان دہی کچھ سنتے ہیں جو یہ سننا ناچاہے وقس علیٰ ہذا۔ انسان کے حواس اس کے ذہن کے تابع ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب آپ کسی گہری فکر میں مستغرق ہوں تو آپ کے سامنے سے کوئی گزر جائے تو آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ حالانکہ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس لئے قوت غالب؟ الانساں، دراصل کمزور قوت والے انسان کی دماغی قوت کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس طرح اس کے حواس خود بخود اس کی قوت کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر یہ چاہے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا اسے سونا بن کر دکھائی دے تو وہ اسے سونا ہی دیکھے گا اور سونا ہی سمجھے گا۔ یا یہ کہ اس کا دماغ درد کا احساس نہ کرے تو وہ اس کا احساس چھوڑ دے گا جیسے کلوروفارم کے اثر کے ماتحت دماغ سے قوت احساس معطل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر سحر و افسوں کی تمام میز العقول اور نگاہ فریب عمارت استوار ہے۔ STEINER اپنی کتاب (The way of Initiation) میں لکھتا ہے۔

ہر انسان میں ایسی مخفی قوتیں موجود ہیں جن کی رُو سے وہ عالم بالا کا علم حاصل کر سکتا ہے۔۔۔ جب سے نوع انسان کی ابتدا ہوئی ہے ایسے اسکول موجود رہے ہیں جن میں وہ لوگ جن کی یہ قوتیں بلند سطح پر موجود تھیں ان لوگوں کو یہ کچھ سکھاتے تھے جو اس کی تلاش میں تھے۔

مرکاہیت بڑا محقق (Eliphas Levi) لکھتا ہے۔

جس طرح جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سے انسان اپنی جسمانی قوتوں کو محیر العقول درجہ تک لے جاسکتا ہے اور قائم رکھ سکتا ہے، اسی طرح "روحانی" قوتوں کا حال ہے۔ کیا آپ اپنے آپ پر اور دوسروں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو یہ سیکھئے کہ اپنی قوتِ ارادی کو کس طرح استعمال میں لایا جائے۔ فنِ سحر کا سب سے پہلا راز یہی ہے اور اس راز کی بنیادوں کو حکم بنانے کے لئے قدیم استادانِ فن نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی خانقاہوں کے ارد گرد ایسی ایسی نگاہ فریب اور بھیاں تک صورتیں پیدا کر چھوڑتے تھے کہ جو شاگرد اس فن کے سیکھنے کے لئے اس حلقہ میں داخل ہونا چاہتا اس کی قوتِ ارادی کا پہلے ہی امتحان ہو جاتا اور اس کے بعد اسے ایسی ایسی مشقت آمیز ریاضتوں سے گزارا جاتا کہ جن سے اس کی قوتِ محکم سے محکم تر ہوتی جاتی۔

ان بیانات کے پیش نظر EVELYN UNDERHILL نے اپنی کتاب Mysticism میں لکھا ہے۔ "فن سحر کے دورِ حاضرہ کے استادوں کے نظریہ کی رُو سے یہ فن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ

قوتِ ارادی کو اس کی عام عدد سے آگے بڑھا دیا جائے..... لہذا، سحر کاری یہی ہے کہ ذہن کو خاص نظم و ضبط کے ماتحت لا کر قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جائے۔ جب قوتِ ارادی میں اس قسم کا نظم و ضبط پیدا کر لیا جائے تو کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے متعلق E.Towene اپنی کتاب (Joy Philosophy) میں لکھتے ہیں۔

ذرا تصور میں لائیے کہ یہ تمام کائنات اور ستاروں کا جوہم سب کے سب چشمِ براہ ہیں کہ آپ نہیں کیا حکم دیتے ہیں۔ پھر تصور میں لائیے کہ آپ کو فقط ایک ٹن دہانا ہے اور اس کے بعد جو کچھ آپ کہیں گے، یہ کریں گے۔ جو بھی آپ نے کہا کہ ”میں یہ کچھ کر سکتا ہوں اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا، کائنات کی تمام قوتیں آپ کے اشارے پر ناپھنے کے لئے تیار ہوں گی۔

قوتِ ارادی کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسے ایک نقطہ پر مرکوز کرنا (concentration) ہے۔ اس کے لئے مراقبہ کرائے جاتے ہیں۔ مختلف الفاظ اور فقرات کو خاص خاص طریقوں سے دہرایا جاتا ہے، بڑی بڑی مشقیں اور ریاضتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ 'LEVI' لکھتا ہے۔

یہ تمام شکلیں اور ان کی مثل حرکات و سکنات، یہ تمام اعداد و شمار اور حروف و الفاظ، مقصدیں فقرے، منتر، تعویذ، سب کے سب قوتِ ارادی کی تربیت کے ذرائع ہیں جن سے یہ تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس طرح متحیدہ کی تخلیقی قوتوں کو حکم بنا دیتی ہیں۔ ایک عمل خواہ وہ کتنا ہی توہم انگیز اور جہالت آمیز کیوں نہ نظر آتا ہو موثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عملیات کے ذریعے مریضوں کے علاج کرنے کے متعلق یہی محقق لکھتا ہے۔

عامل کی تمام قوت کا راز یہی قوتِ ارادی ہے اور اس کا کمال فقط یہ ہے کہ وہ مریض کے دل میں عقیدت پیدا کر دے۔

یہ ہے فنِ سحر کی بنیاد، یعنی قوتِ ارادی اور متحیدہ کے کرشمے۔ جس شخص پر اس قوت کو اثر انداز کیا جاتا ہے وہ وہی کچھ دیکھنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے جو کچھ اسے دکھایا اور سمجھایا جائے، یعنی جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔



جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے وہ سحر کی بڑی مذمت کرتا ہے (تفصیل اس کی حضرت سلمان کے قصہ کے ضمن میں سامنے آئے گی) اور اس کی وجہ ظاہر ہے جس انقلاب کی دعوت ہی علی وجہ البصیرت دی جائے اور جس کا مقصد شرفِ انسانیت کی ایسی تکمیل ہو جس سے وہ اس کائنات کو بھی مسخر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی سرفرازیوں کے مقام بلند پر فائز المرام ہو، وہ اس قسم کی توہم پرستیوں اور شعبہ بازیوں کو کس طرح بنظرِ استحسان دیکھ سکتا ہے جس سے قلب و دماغ کی صحیح صلاحیتیں سلب اور بازوؤں کی قوتیں معطل ہو کر رہ جائیں؟ حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تعلیم انسان کو ایک خاص منزل کی طرف لے جاتی ہے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اس کے برعکس خود محققینِ یورپ کا اعتراف ہے کہ سحر انسان کو کسی منزل کی طرف نہیں لے جاتا، محض قوتِ ارادی کی کرشمہ سازیوں میں کھودیتا ہے۔

سحر، خواہ یہ اپنی اصلی اور خالص صورت میں بھی کیوں نہ ہو، اس سے مقصود غارقِ عادات آفاقی چیزوں کو ظہور میں لانا ہے۔ یہ کسی منزل کی طرف انسان کی راہ نمائی نہیں کرتا۔

(Mysticism: p. 151)

**مسلمان اور سحر کاری** لیکن بایں ہمہ مسلمانوں کو دیکھئے کہ کس طرح سحر و فوسوں سازی سے لپٹے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور قیامت بالائے قیامت کہ خود اللہ کی کتاب کو اس شعبہ گری کی آماجگاہ بنا رکھا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس فن کا نام سحر سے کچھ الگ رکھ چھوڑا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ فقط نام کی تبدیلی سے اشیاء کی ماہیت نہیں بدل جایا کرتی۔ پانی، پانی ہی ہے، خواہ اسے آبِ کینے یا ماء، جلِ کینے یا واٹر، کالا علم اور نور سی علم دو الگ الگ نام رکھ لینے سے مختلف حقیقت کے علمبردار نہیں ہو سکتے۔ (ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اس سے کتنی پیشانیوں پر شکن پڑ رہے ہیں اور کتنی آنکھوں کا رنگ لال ہو رہا ہے۔ لیکن جب ہم قرآنِ کریم کی روشنی میں علی وجہ البصیرت دیکھ رہے ہیں کہ ان چیزوں میں سولے نام کی تبدیلی کے اور کچھ فرق نہیں تو شکن آلود پیشانیوں اور خشم آگیز آنکھوں کے ڈر سے حقیقت کو کس طرح مسخ کر دیا جائے۔ یہ اوراد و وظائف، یہ گنڈے تعویذ، یہ مراقبے اور ریاضتیں اسی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں جس کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن چونکہ یہ نام ایک زمانہ سے دامنِ تقدیس کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے ہیں اس لئے مسلمان اسے سننا تک گوارا نہیں کر سکتا کہ اسے سحر کہہ دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں

میں جگہ پکڑ چکا ہے کہ سحر و فسون سازی غیر اسلامی شعار ہے لیکن عملیات و وظائف اسلامی مسلک لیکن یہ حقیقت نہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ایک فن ہے جسے ہر انسان، بلا لحاظ عقیدہ و مسلک، حاصل کر سکتا ہے۔ مختلف اقوام میں اس کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ چونکہ جن لوگوں سے اس قسم کی مجیر العقول باتیں سرزد ہوتی تھیں، انہیں بڑی بڑی مافوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا اس لئے ان قوتوں کی تقدیس و عظمت دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ لہذا ازمنہ قدیمہ سے اس قسم کی قوتیں اور مذہبی تقدیس لازم و ملزوم چلی آتی ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، بدھوں کے لاما، یہود و نصاریٰ کے رہبان اور دوسرے مذاہب کے فقیہ منشی لوگ، جو ان قوتوں کو حاصل کرتے ہیں ہمیشہ مذہبی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ ان باتوں کو مذہب کا انتہائی مقام قرار دے دیا گیا۔ اس لئے اس قسم کے لوگ انتہائی عزت و محترم کے مستحق قرار پائے اور شرفِ انسانیت کے تمام شعبے اس سے ادنیٰ درجہ پر رہ گئے۔ اس وجہ سے یہ چیزیں زیادہ عام ہو گئیں اور عظمت و عقیدت کے حصول کا آسان ذریعہ قرار پا گئیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان تمام لوگوں نے اسے دیدہ دانستہ دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر، بطور مکرو فریب اختیار کیا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فی الواقع مذہب کا انتہائی مقام سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ ایک فن ہے اور ہر شخص بطور فن اس کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان، تا بہ کمر بانی میں کھڑا ہو کر سورۃ یسین کی بعض آیات کا ورد کر کے کچھ خاص قسم کی قوت حاصل کر سکتا ہے، تو ایک ہندو جوگی، اپنے طریق پر وید کے کسی منتر سے ویسی ہی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ ان کا نام مختلف رکھ لیجئے، اسے کالا علم اور اُسے نوری علم کہہ دیجئے۔ لیکن جہاں تک اس فن کا تعلق ہے، حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ یہ سب قوتِ ارادی کی تنظیم و انضباط کے ذرائع ہیں۔ بقول "UNDERHILL" "اس باب میں ذرائع کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز تو قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہے۔" (Mysticism, p. 158) وظیفہ، گنڈہ، تعویذ یا قرآنی آیات کے عملیات کو دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سب قوتِ ارادی کو مجتمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع ہیں

لے مسٹر WHITE اپنی کتاب "The Occult Sciences" میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قسم کی ریاضتیں، مراقبے، اوراد و وظائف کس طرح ایک ہی قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں۔

اور ان کے نتائج (مثلاً امراض کا علاج وغیرہ) اسی وقت کے کرشمے مشرق میں یہ طریقے بڑے مخفی رکھے جاتے تھے (اور ابھی تک رکھے جاتے ہیں) لیکن مغرب نے اسے ایک سائنس کی حیثیت سے عام کر دیا ہے امریکہ میں "New Consciousness" اور "Mentality: New Thought" کے اسکول اور یورپ میں مختلف سوسائٹیاں اپنے اپنے طریقوں پر یہ سب کچھ سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ لہذا اسے قرآنی آیات کے "عمل" سے حاصل کیجئے یا لوگ کے ذریعہ یورپ کی سوسائٹیوں سے سیکھئے یا امریکہ کے مدرسوں سے، نتیجہ ہر صورت میں وہی برآمد ہوگا۔ لیکن جب آپ اسے دین اور دین کا بھی پختہ قرار دینگے اور وجہ افضلیت خارقِ عادات بائیں تسلیم کریں گے، تو مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم (مثلاً ہندوؤں کے جوگی سنیا سی) ایسے ایسے مجر العقول شعبدے دکھائیں گے جن کا جواب نہیں بن پڑے گا۔ آئے دن آپ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں جوگی نے اس قسم کی مجر العقول بات دکھادی اور فلاں مقام پر اس قسم کی۔ لہذا اگر کسی مذہب کی حقانیت کی دلیل اس کے پیروؤں کے خارقِ عادات شعبدے میں تو دنیا میں اسلام کی برتری کا ثبوت مشکل ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ آپ کے ہاں کے شعبدے کرامات ہیں اور دوسروں کے شعبدے محض سحرکاری کی "شیطنیت" تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ دوسرے لوگ بھی کچھ آپ کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم اس اسلام کو جس میں زندگی اور حرارت پائی جائے صحیح اسلام نہیں قرار دیتے۔ بلکہ صحیح اسلام اسے قرار دیتے ہیں جس میں اس قسم کی "روحانیت" کے کرشمے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے پیروں اور فقیروں یعنی "روحانی بزرگوں" کی عام طور پر تعریفیں کی جاتی ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے معتقدین کے حلقہ میں بھی داخل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کے ان جلیل القدر مشاہیر کو کبھی منظرِ استحسان نہیں دیکھیں گے جنہوں نے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ اس لئے کہ "روحانی بزرگوں" کو اسلام کا سچا پیرو قرار دے کر وہ ہر غیر اسلامی مذہب کو اسلام سے برتر نہیں تو کم از کم اس کے برابر ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح اس دعوے کا بلند آہنگی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ "تمام مذاہب اپنی بنیادی صداقتوں کی رُو سے یکساں ہیں" لیکن دین کو ایک نظام زندگی قرار دے کر ایسا دعویٰ اور اس کا ثبوت ممکن نہیں۔

لے شریعت اور طریقت کی باہمی آمیزش کے مباحث پر نگاہ ڈالنے ہر مقام پر طریقت کا پلڑا جھکا ہوا دکھائی دے گا۔  
(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں زیادہ طول طویل بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ دہرا لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟ جب قرآن کریم نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا تو قرآن کا یہ مصرف انسانی دماغ کی اختراع کے سوا اور کیا ہوگا؟ باقی رہا یہ کہ ”صاحب! جب ایسا کرنے سے یہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو قرآنی آیات و الفاظ میں ان قوتوں کی موجودگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی؟“ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ یہ نتائج محض قرآنی آیات و الفاظ کے اور ادو وظائف سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ غیر قرآنی (اور بعض اوقات بالکل مہمل) الفاظ و کلمات سے ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے نتائج خواہ قرآنی الفاظ سے مرتب ہوں یا غیر قرآنی سے، بہر حال قوت ارادی کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ ہیں جو انسانی طور پر ہر شخص حاصل کر سکتا ہے اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آیات قرآنی سے اس قسم کے ”روحانی“ نتائج پیدا کر کے قرآن کی عظمت کو بلند کرتے ہیں، وہ درحقیقت سمجھتے نہیں کہ اس سے وہ قرآن کو اس کے صحیح مقام سے

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) اہل طریقت و معرفت کا بالعموم دعویٰ یہ ہے کہ شریعت محض ظاہری اعمال کا نام ہے۔ ”روحانیت“ جو مذہب کی غایت ہے انہی کے ہاں ہے اور اس کا ثبوت اسی قسم کی خارجی عادات باتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔

لے خود مسلمان بزرگوں کے ہاں ایسے ایسے اوراد و نقوش موجود ہیں جو عجیب و غریب الفاظ پر مشتمل ہیں۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ 'خالد' میں کسی بزرگ کی کتاب "عطار الملتان" کا ترجمہ مسلسل شائع ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے حیل القہر بزرگان دین کے عملیات مذکور تھے۔ مثلاً ایک عمل یہ تھا۔

الہی بحرۃ میلثا، کسیننا، کشفوطط، کشافیطونس، تبرنیش، اذفیطرنی، یوانسٹ بوس و کلہم قلیرو علی اللہ قصد سبیل  
و منہاجا بردو شار بید کم اجمعین: ایک تعویذ یہ تھا "حٹی حٹی حٹی حٹی حٹی حٹی (بچوں کے گلے میں ڈال دیا جائے) ایک  
ادہ عمل تھا۔ بسم اللہ علیقہ، یلیقہ، ثلیقہ، تلیقہ: بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و علی دلی اللہ (خاندان) بغرض اجرائے حاضرات ایک  
چلتا ہوا عمل ہے۔ جب اس قسم کے الفاظ و کلمات سے بھی وہی نتائج مرتب ہو سکتے ہیں تو پھر قرآنی آیات کی کیا تخصیص ہے؟

کس قدر پست سطح پر لے آئے ہیں جس شخص کے قلبِ سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اور اس کی نگاہوں کو فوراً بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو وہ جب خدائے حق و قیوم کی اس زندہ و پابندہ کتاب کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے ہر حقیر اٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطہٗ خداوندی کی شوکت و سطوت کے پیشِ نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس سراجِ منیر کی درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جب تدبیر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو حقائق و معارف کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے جلوہ بار ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے ”مصنف“ سے لگایا جاسکتا ہے تو اس کتابِ حکیم کی بلندئِ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا ”مصنف“ خود خدائے علیم و بصیر ہو۔ اگر اس کی تقدیس کا جائزہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا محل کون ہے تو اس کتابِ مقدس و مبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس و اعظم کا قلبِ منور تھا جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے شمولات سے کیا جاسکتا ہے تو اس زندہ و پابندہ کتاب کے علوم مرتبت کا کیا اندازہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرم عمل ہو اور جس کے قوانین، اقوام و مللِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں۔ اور پھر اگر اس نسخہٗ تکوینِ حیات کی ارجمندی کی قدر و قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچانی ہو تو اس کے متعلق پوچھتے سرزمینِ عرب کے ان ذرات سے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی بادہ نشین قوم، دیکھتے ہی دیکھتے قیصر و کسریٰ کی دولت و ثروت کی وارث بن گئی اور مکایمِ اخلاق کے اس مقامِ بلند پر فائز ہو گئی جو آج تک چشمِ عالم کو دیدہ حیراں بنا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک برقی خاطر تھی جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر طاغوتی قوتِ راکھ کا ڈھیر بنا گئی۔ ایک شمشیرِ برہنہ تھی جو فضائے عالم میں کوندی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر خداوندی بندشوں میں جکڑ رکھا تھا یہ تھی وہ کتابِ حکیم جو مسلمانوں کو اس لئے دی گئی تھی کہ وہ اسے قیامت تک کے لئے اپنا نصابِ زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ اگر کوئی مریض کسی طبیب سے سر درد کا نسخہ لے لے تو اس کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا کہ اس نسخہ کے مطابق

**قرآن کا غلط مصرف**

دوائیاں خرید کر انہیں حسبِ ہدایت استعمال کرے۔ لیکن اگر وہ اس کاغذ کو جس پر وہ نسخہ لکھا ہے سبز کپڑے میں سی کر، سر پر باندھ لے تو اس کی اس حرکت پر عقل ہنسے گی اور

علم روئے گا۔ پھر سوچئے کہ اگر کوئی شخص تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزائیں سال کی قید ہے، دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے گا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ قرآن کریم قوموں کے امراض کہن کا نسخہ کیمیا ہے، ایک ضابطہ قوانین ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نسخہ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیاجائے یا اس ضابطہ قوانین کی مختلف دفعات کے چلنے کا ٹے جائیں تو اس سے بڑھ کر اس کتاب حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہوگا؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی کرامات پسندی سے انسانی فضیلت کا معیار کس طرح بدل جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رُوس سے انسان کی فضیلت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ ہے، یعنی یہ کہ اس کی زندگی کس قدر قوانین خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص نہایت بلند سیرت و بلند کردار ہو، وہ گناہی کی زندگی جئے گا۔ کوئی اس کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس، ایک شخص کسی خانقاہ میں بیٹھا بھنگ کی لہروں اور چندو کی موجوں میں مستغرق ہو، لیکن اگر وہ ستہ کا نمبر صحیح بتا دے تو جیتے جی مرجعِ انا م رہے گا اور مرنے کے بعد اس کی قبر کی پرستش ہوگی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ معیارِ فضیلت، سیرت و کردار کی بلندی نہیں بلکہ شعبہ بازی قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی ایسے شخص سے اس قسم کے شعبہ آظہور میں آتے ہیں جو بے باکانہ لغو زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی لغویت پر طرح طرح کے پردے ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ اس کی "بزرگی" کی شان میں فرق نہ آنے پائے۔ اس قسم کے لوگوں کی عقیدت و عظمت کچھ اس طرح غیر شعوری طور پر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل، ان کی شان میں گستاخی کا کلمہ زبان تک لاتے خوف کھلتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کو محکمہ قضا و قدر میں ایسا دخل حاصل ہے کہ نہ معلوم ان کی سوراہی سے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس غلط معیارِ فضیلت سے قوانینِ الہیہ کی جو قدر و قیمت دلوں میں رہ سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو اگرچہ شریعت کے پابند ہیں لیکن معیارِ فضیلت اسی قسم کی چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی "پرستش" میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ اگرچہ زبان سے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کبھی لوگوں کو اس قسم کی باتوں کی جرأت نہیں دلاتے لیکن وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ لوگ کس طرح انہیں اور ان کے بزرگوں کو قبلہ حاجات و کعبہ مقصود سمجھتے ہیں لیکن بایں ہمہ

وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں کہتے اور اگر وہ بفرض محال زبان سے اس کی مخالفت بھی کریں تو بھی اس کا کیا اثر ہے جب وہ اپنے عمل سے لوگوں کو خود انسان پرستی کی طرف دھکیل کر لاتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں کے دلوں میں یقیناً خدا کی ایسی عظمت و عقیدت نہیں ہوتی جتنی خود ان حضرات کی ہوتی ہے اس لئے کہ وہ اپنی ہر مشکل میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گو کہتے ہی ہیں کہ ہم ان کے ”واسطہ“ سے اپنی درخواست خدا تک پہنچاتے ہیں (جو خود ایک غیر قرآنی عقیدہ ہے) لیکن فی الحقیقت اپنی مرادوں کا منہج انہیں بزرگوں کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا خدا کے ساتھ وہ تعلق کبھی نہیں رہ سکتا جو قرآن کریم قائم کرنا چاہتا ہے۔ سنئے کہ کس باب میں غیر مسلموں کی شہادت کیا ہے۔

اگر گہرائیوں میں اتر کر دیکھئے تو عملیات کا ہر طالب اس مقام کی طرف جدوجہد کرتا دکھائی دے گا جہاں وہ صرف بٹن دبا دے اور بقی سب کچھ آفاقی قوتیں بخود بخود کر دیں۔ وہ جب بہ ہزار مشقت اس قسم کی قوت حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ بہت سوں پر غالب آجائے تو اس سے اس ایک کو بھول جانے کی طرف میلان ہو ہی جاتا ہے۔ (LEVI) کے الفاظ میں ”فطرت کے امور کا بہت گہرا مطالعہ اس قسم کے غیر محتاط متحس کو خدا سے بے گانہ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی دماغی تکان اس کے ارتعاش قلب کو مفلوج کر دیتی ہے۔

(Mysticism, by Underhill)

**خانقاہیت کا جمود انگریز مشرب** | اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس خانقاہ نشینی کے طلسم نے جس طرح مسلمانوں جیسی یکسر برقی تپاں قوم کو جمود و تعطل کے بیکار مجسمے بنا کر رکھ دیا ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ عمل بالقرآن نے وہ قوم پیدا کی تھی جس کے ہاتھ میں اقوام عالم کی ”تقدیریں“ تھیں، جن کی نگاہوں سے موت کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔ جن کی ہیبت سے مصائب و مشکلات کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ جس طرف باگیں اٹھاتے، فتح و ظفران کی رکاب تھامتی۔ وہ جدھر رخ کر لیتے، کامرانی و کامیابی اُن کا بڑھ کر استقبال کرتی۔ وہ قوم جو ”اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی دوسری طاقت کو حائل نہ ہونے دیتی“ وہ جو اپنے تمام عوام و مراحل میں اپنی قوت بازو اور قوانین خداوندی کی تائید کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کرتی، یہ تھی وہ قوم جسے قرآن کریم نے دنیا میں قوانین البیہ کی منفی و تردید کے لئے

پیدا کیا تھا۔ لیکن (UNDERHILL کے الفاظ میں) اس منزل کی تلاش نے، جہاں انہیں صرف بٹن دبانا پڑے اور باقی سب کچھ غیر معلوم آفاقی قوتیں ان کے لئے خود بخود کریں، اس قوم کو رفتہ رفتہ ایسی حالت میں پہنچا دیا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں دوسروں کے آسروں کے ڈھونڈنے لگ گئے اور قدم قدم پر اس طرح غیروں کے محتاج ہوئے کہ ہر شخص انہیں ذلیل و خوار سمجھے۔ یہ سب اس لئے کہ وہ کشمکش حیات میں مروانہ وار حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے کامیابی و کامرانی کے لئے کشف و کرامات کے ”سم سم“ کے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح وہ تمام زندہ کرامتیں جو خود ان کے دست و بازو سے ظہور میں آتی تھیں افسانے بن کر رہ گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا

آزاد کا ہر لمحہ ہے اک زندہ کرامات

اس کا نتیجہ یہ کہ آج دنیا میں مسلمان سے زیادہ نکمی اور اپاہج قوم شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ ہے حال اس ”انجھو پسندی“ کا جسے ان کے فریب نگاہ نے بڑے بڑے مقدس غلافوں میں لپیٹ کر دکھا ہے اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اسلام جیسا زندہ اور زندگی بخش نظام حیات دھرم بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ عظیم المرتبت مجاہدین اسلام جن کے ایمان کی حرارت نے فضائے کائنات میں تموج پیدا کر دیا، مسلمانوں کے ذہن سے عام طور پر اتر چکے ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کی طرف اس قسم کی حسی کرامات منسوب ہیں ہر وقت ان کے قلب و نگاہ کے سامنے رہتے ہیں۔ یقین مانتے! یہ سب کشمکش حیات میں اعترافِ شکست ہے کشاکش زندگی میں سپر اندازی ہے، دنیائے عمل و حقیقت سے فرار کی راہ ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی کرامت وہ ہے جو جماعتِ مومنین کی قوتِ بازو سے ظہور پذیر ہو اور جس کا عملی نتیجہ اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ اس کرامت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کرامت نہیں۔ وہ کرامت جس سے جہانِ انسانیت میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے اور اس طرح یہ زمین ”اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔“

ہمارے ہاں اس مسلک کو ”تصوف“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تصوف کی تاریخ بیان کرنے کا یہ مقام نہیں۔ (اسے میں نے اپنی کتاب ”تصوف کی حقیقت“ میں واضح کیا ہے) اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ”تصوف“ (اقبالؒ کے الفاظ میں) ”سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے“ (مکاتیب اقبالؒ)۔



یہ فی الواقع ایک غیر اسلامی تصور ہے جسے ہم نے دوسروں سے مستعار لیا تھا۔ اسلام ایک نظام ہے جس میں اس قسم کے مسائل کی کوئی گنجائش نہیں۔

بعض حضرات (حقائق سے منہ موڑنے کے لئے) تصوف کی دو قسمیں بیان کر دیتے ہیں، یعنی اسلامی تصوف اور غیر اسلامی (عجمی) تصوف۔ لیکن جب تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" تو اسے اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اسلام، اسلام ہے اور بس۔ یہ ایک نظام مملکت ہے، نظام حکومت ہے، ضابطہ زندگی ہے جسے اس قسم کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں یا کشف و کرامات کی بھول بھلیوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کریم سے ان امور کی کوئی سند نہیں ملتی۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سحر کی اصلیت کیا ہے اور وہ کس طرح لوگوں کی نگاہوں کو فریب دیتا ہے۔ اس فریب کے علاوہ اس کی بنیاد کچھ نہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں لفظ سحر، جادو کے علاوہ، جھوٹ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

سورۃ ہود میں ہے۔

**سحر بمعنی جھوٹ** | **وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ**

اے سہ جیس فریزر لکھتا ہے

*Magic is a spurious system of Natural law as well as a fallacious guide of conduct; it is false science as well as abortive art.*

(The Golden Bough)

اغور فرمایئے! قرآن کریم نے جس حقیقت کو آج سے چودہ سو سال پہلے بے نقاب کیا تھا علمی تحقیقات اس کی کس طرح حرف تصدیق کئے چلی جا رہی ہیں۔ قرآن نے سحر کو باطل، جھوٹ، ہناوت، فریب قرار دیا ہے اور تحقیق کے بعد اس فن کی حقیقت بھی یہی ثابت ہوئی ہے۔ اسے زندگی کے حقائق سے کچھ تعلق نہیں۔

الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا آيَاتُ سَحَرٍ مُّبِينٌ ۝ (۱۱/۷)

اور (اے پیغمبر!) اگر تو ان لوگوں سے کہے "تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے" تو جو لوگ منکر ہیں وہ ضرور بول اٹھیں "یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے"

مادہ پرستوں کے نزدیک حیات بعد الممات (معاذ اللہ) ایک کھلا ہوا جھوٹ یا فریب ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ جب انھیں جہنم کی طرف لایا جائے گا تو پوچھا جائے گا کہ کہو! یہ بھی جھوٹ ہے یا سچ مچ کچھ سچے نظر آ رہا ہے۔

يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ تَارِيحَتِهِمْ دَعَا هَذِهِ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ فِيهَا

تُكَذَّبُونَ ۝ أَفَسِحْرٌ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۚ (۵۲/۱۵-۱۳)

(اور دیکھو) جس روز انہیں آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے کر لایا جائے گا (تو ان سے کہا جائے گا)

یہ وہی آگ ہے جسے تم (دنیا میں) جھٹلایا کرتے تھے (اور پوچھا جائے گا کہ کہو! یہ بھی جھوٹ ہی ہے

یا کیا تم (سچ مچ) کچھ دیکھ رہے ہو؟

سحر (جھوٹ) کی تشریح 'تکذیب' (جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے) نے کردی۔ کفار قرآن کریم کو بھی سحر (جھوٹ) کہا کرتے تھے اس لئے کہ اگر وہ اس کے وحی ہونے کے دعوے کو سچا تسلیم کر لیتے تو پھر کفر باقی کس طرح رہ سکتا! سورۃ انبیاء میں ہے۔

لَوْ هِيَ قُلُوبُهُمْ ۖ وَأَسْرُوا الْيَجُوعَىٰ ۖ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ هَلْ هَذَا

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ أَفَتَأْتُونَ السَّحَرَ وَأَنْتُمْ تَبْصِرُونَ ۝ (۲۱/۳)

اور دل ہیں کہ یک قسم غافل۔ اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی

اس کے سوا کیسا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو

جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

سورۃ احقاف میں اس کی وضاحت یوں فرمادی۔

وَإِذَا تُثْلَىٰ عَلَيْهِمْ أَيْتُنَا يَتَّبِعِ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا

جَاءَهُمْ ۚ هَذَا سَحَرٌ مُّبِينٌ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ

إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا

تَفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا ۚ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ  
الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ (۴-۸/۲۶)

اور (دیکھو) جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو نافرمان لوگ حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آتا ہے تو کہنے لگتے ہیں "یہ تو کھلا جھوٹ ہے" بلکہ وہ اور آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں "محمدؐ نے اسے خود ہی گھڑ لیا ہے" (تو اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو "اگر میں نے خود ہی اسے گھڑ لیا ہے تو تم لوگ مجھے خدا (کے عذاب) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے۔ جو باتیں تم بتاتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے اور وہ بڑا ہی مغفرت کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔

کفار کے اس قول کو چند آیات کے بعد "إِنَّا قَدْ نُفِثْنَا بِكَ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔  
وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ حَیْثَا مَا سَبَقُونَا إِلَيْهِ  
وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا آفَاكٌ قَدِیْمٌ ۝ (۱۱/۲۶)  
اور دیکھو یہ نہ ماننے والے لوگ ایمان لانے والوں کے متعلق کہنے لگے۔ اگر یہ (قرآن) کوئی  
بھلائی کی چیز ہوتا تو وہ (کمتر درجہ کے لوگ) اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کر سکتے اور چونکہ  
(نا فرمان لوگوں) کو قرآن سے ہدایت نہیں ملی ہے تو وہ اب جلد ہی پکاراٹھیں گے "یہ تو  
وہی پرانا جھوٹ ہے"

ولید نے اسی کو "سُحْرٌ يُؤْتَشَرُ" کہا تھا یعنی ایک انسان کا کلام ہے اور دجی کا دعویٰ (معاذ اللہ) وہ  
جھوٹ ہے جو اسی طرح سے چلا آ رہا ہے۔ (۲۴-۲۵/۴۴ نیز ۳۳/۳۴)  
سورہ زخرف میں ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ قَدِیْمٌ ۚ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ۝  
(۳۳/۳۰) (بیز ۶/۶۱ نیز ۱۰/۲۰ و ۳۸/۳۰)

اور (دیکھو) جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کہتے ہیں "یہ تو جھوٹ ہے اور بیشک ہم  
اس کا انکار کرنے والے ہیں۔

ہر زمانے کے کفار اپنے نبی کے متعلق یہی کہتے۔

كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ  
أَوْ مَجْنُونٌ ۝ (۵۱/۵۲)

(بالکل) اسی طرح ان سے پہلی امتوں کے پاس بھی خدا کا کوئی رسول نہیں آیا مگر لوگوں نے (بھٹ) یہی کہا کہ (یہ شخص) یا تو جھوٹا ہے یا پھر پاگل ہے۔

کفار حضرات انبیاء کرام کو ساحر (جھوٹا یا فریبی) کہتے لیکن جب دیکھتے کہ وہ دنیا جہان سے زالی باتیں کہتے ہیں، (یعنی ایسی باتیں جو ان کے مسلک و آئین یا ان کے اسلاف کی روشیں کہن کی رو سے زالی تھیں) تو وہ اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق یہ سمجھتے کہ ان کی یہ (معاذ اللہ) بہکی بہکی باتیں کسی کے سحر کا اثر ہیں۔ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ سے کہا۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ (۲۶/۱۵۳)

تو وہ کہنے لگے "اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تجھ پر کسی نے جادو

کر دیا ہے" (جو تو یوں بہک گیا ہے)۔

اسی طرح حضرت شعیبؑ سے کہا گیا۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ (۲۶/۱۸۵)

لوگوں نے کہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے

(کہ تم یوں بہک گئے ہو)۔

اور ذات رسالتؐ کے متعلق بھی۔

مَنْ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَى

إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَحْلًا تَمْشُونَ ۝ (۱۷/۲۴)

جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کا سنا ہوتا ہے اسے ہم اچھی طرح

لے کذاب اور سحر دونوں کا مطلب جھوٹ ہے۔ کذب کسی واقعہ کے متعلق خلاف بیان یا جھوٹ اور سحر باطل کو حق بنا کر پیش کرنے کا فریب۔ جھوٹ لفظ تو جھوٹا سا ہے لیکن البیسیت کے تمام تر بے اس کے اندہ سمجھاتے ہیں۔  
نہ سحر بمعنی سحر (جھوٹا) بھی آسکتا ہے۔

جانتے ہیں اور جب یہ ظالم باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں ”تم جس آدمی کے پیچھے پڑے ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔“

نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم نے یہ کفار کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) یہ شخص مستحویہ ہے اس پر کسی کے جادو کا اثر ہے۔ لیکن بدبختی کہ خود مسلمانوں کے یہاں بھی یہ عقیدہ موجود ہے کہ حضور (معاذ اللہ) مستحویہ تھے۔ چنانچہ بخاری شریف میں یہ روایت موجود ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ ۖ قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ حَتَّىٰ كَانَ يَخِيلُ إِلَيْهِ إِنَّهُ فَعَلَ شَيْئًا  
وَمَا يَفْعَلُهُ حَتَّىٰ كَانَ يَوْمَ دَعَا دُعَاءَ ثَمَرٍ قَالَ اشْعَبْتُ أَنْ أَلَهُ أَفْئَا  
نِي فِيمَا فِيهِ شِفَائِي أَتَانِي رَجُلَانِ فَقَعَدَ أَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِي وَالْآخَرُ  
عِنْدَ رِجْلِي فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِلْآخَرِ مَا دَجَمَ الرَّجُلُ قَالَ مَطْيُوبٌ - قَالَ  
وَمَنْ طَبَهُ قَالَ لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ - قَالَ فِيمَاذَا - قَالَ فِي مَشْطٍ وَمِشْطَانِ  
وَجَعْتُ طَلْعَهُ ذَكَرًا قَالَ فَايِنْ هُوَ قَالَ فِي بَيْتِ زُرَّوَانٍ - فَخَرَجَ إِلَيْهَا النَّبِيُّ  
ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ لِعَائِشَةَ حِينَ رَجَعَ غَضَّهَا كَانَهَا رُؤْسُ الشَّيَاطِينِ فَقُلْتُ  
اسْتَغْرَجْتُ فَقَالَ لَا أَمَّا أَنَا فَقَدْ شَفَانِي اللَّهُ وَخَشِيتُ أَنْ يَشِيرَ ذَلِكَ  
عَلَى النَّاسِ شَرًّا ثُمَّ دَفَنْتُ الْبَيْتَ - (بخاری جلد دوم ص ۱۳۷)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ آپؐ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک روز حضورؐ نے دعا رکھی۔ پھر دعا رکھی۔ دعا رکھنے کے بعد مجھ سے فرمایا، عائشہؓ تم کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے وہ حکم دیا ہے جس میں میری شفا کا راز (مضمحل) ہے۔ میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے۔ ایک میرے سر ہانے بیٹھا دوسرا پانٹتی۔ ایک دوسرے سے بولا اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ دوسرے نے کہا اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلا شخص بولا کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے کہا لبید بن اعصم نے۔ پہلے نے پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی میں اور کنگھی سے جھڑے ہوتے بالوں میں اور زہر چھوڑے کے غلاف میں۔ پہلا بولا یہ چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ دوسرا بولا چاہ زروان میں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ

زردان پر تشریف لے گئے اور لوٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کنوئیں کے کھجور، شیطانوں کی سردوں کی طرح ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا حضورؐ نے جادو کی چیز دہاں سے نکال ڈالی؟ فرمایا نہیں لیکن اللہ نے مجھے صحت عطا فرمادی۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں لوگ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس کے بعد وہ کنواں پاٹ دیا گیا۔

صاف نظر آتا ہے کہ معاندین اسلام نے اس قسم کی روایات مشہور کر رکھی تھیں۔ لیکن ان پر کیا گلا؟ ان کا تو کام ہی یہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کو دیکھئے کہ ہزار برس سے ایسی ایسی چیزوں کو پائینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور اگر کسی کی غیرت ایمانی، اور بصیرت فرقانی نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب کرنا گوارا نہ کرے تو اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔

آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق

**۸۔ واقعہ خضر** | حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں قرآن کریم میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے جسے عام طور پر حضرت موسیٰؑ اور ”خضر“ کی ملاقات کہا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں اس بزرگ کا نام نہیں آیا۔ قوم کی عجوبہ پسندی نے عجیب و غریب قصے ان کی طرف منسوب کر رکھے ہیں جن پر ہماری شاعری اور ہماری افسانوں کی ایک دنیا قائم ہے۔ اصل واقعہ صرف اتنا ہے جو سورہ کہف کی آیات ۶۱ لغایت ۸۲ میں مذکور ہے جس میں فرمایا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ  
أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝ (۱۸/۶۰)

اور موسیٰؑ نے اپنے ساتھی (خادم) سے کہا ”میں اپنی کوشش سے باز آنے والا نہیں جب تک اس جگہ نہ پہنچ جاؤں جہاں دونوں سمندر (یا دریا) آملے ہیں، میں تو (اپنی راہ) چلتا ہی رہوں گا۔

قرآن نے حضرت موسیٰؑ کے اس ساتھی کا نام نہیں بتایا۔ اس کے بعد ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَعْرِ  
مَارِجًا ۝ (۱۸/۶۱)

پھر جب دونوں سمندروں (یا دریاؤں) کے ملنے کی جگہ پہنچ گئے، تو اس مچھلی کا انہیں خیال

نہیں رہا جو اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ (مچھلی ہنوز زندہ تھی) اس نے سمندر میں جانے کے لئے رنگ کی طرح ایک راہ نکال لی۔

اس سے آگے بڑھے تو کھانے کا وقت قریب آ گیا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي جَدَّاءُنَا ن لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا  
هَذَا نَصَبًا ۚ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي  
نَسِيتُ الْخُبْرَ ن وَمَا أُنْصِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ فَاتَّخَذَ  
سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ مَجْجَبًا ۝ (۱۸/۶۲-۶۳)

جب وہ آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے آدمی سے کہا "آج کے سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا۔ اللہ صبح کا کھانا کھالیں۔ اس نے کہا، کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ جب ہم (دریا کے کنارے) چٹان کے پاس ٹھہرے تھے، تو مجھے مچھلی کا کچھ خیال نہیں رہا تھا۔ اس نے عجیب طریقے پر دریا کی راہ نکال لی (تعجب ہے کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرنا بالکل بھول گیا) اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ یہ شیطان کا کام تھا۔

اس پر حضرت موسیٰ نے فرمایا۔

قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ ۚ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۝ (۱۸/۶۴)

موسیٰ نے کہا، اب مجھے خیال پڑتا ہے کہ جس مقام کی تلاش میں ہم نکلے تھے وہ وہی تھا۔ چنانچہ وہ انہی پاؤں لوٹ گئے۔

جب آپ واپس لوٹے تو اللہ کے ایک بندے سے ملاقات ہوئی۔

فَوَجَدَ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا اتَّبِعُهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنَاهُ  
مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ (۱۸/۶۵)

(پھر جب چٹان کے پاس پہنچے) تو انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ مل گیا۔ اس شخص پر ہم نے خصوصیت کے ساتھ ہر بانی کی تھی۔ اسے اپنے پاس سے (وحی کا) علم عطا فرمایا تھا۔

حضرت موسیٰ نے آپ کی معیت کی خواہش کی۔

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ

تَعْلِمَنِ مِمَّا عَلِمْتَ رُسُشًا ۝ (۱۸/۶۶)

موسیٰ نے اس سے کہا ”آپ اجازت دیں تو آپ کے ساتھ رہوں، بشرطیکہ جو علم آپ کو اس خوبی کے ساتھ عطا کیا گیا ہے اس کی کچھ تعلیم مجھے بھی دے دیں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ مجھے اس پر تو اعتراض نہیں لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بڑے جلد باز واقع ہوئے ہو اس لئے تم ضبط اور تحمل سے کام نہیں لے سکو گے۔

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ (۱۸/۶۷)

اس نے جواب دیا ”ہاں، مگر تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکو گے؛

اس لئے کہ

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ (۱۸/۶۸)

جو بات تمہاری سمجھ سے باہر ہوگی جب تم اُسے دیکھو گے تو صبر نہیں کر سکو گے، جلدی مچا دو گے۔

لیکن حضرت موسیٰ نے وعدہ کیا کہ آپ اپنی بیتابی تمنا کو اپنے سینے میں تھامے رکھیں گے اور ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے اور تاکید کر دی کہ

قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۝ (۱۸/۶۹)

فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ

ذِكْرًا ۝ (۱۸/۷۰-۷۱)

موسیٰ نے کہا ”اگر خدا نے چاہا، تو آپ مجھے متحمل مزاج پائیں گے۔ میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔“ اس نے کہا، ”اچھا اگر تمہیں میرے ساتھ رہنا ہی ہے تو اس بات کا خیال رکھو کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہوں، تم کسی بات کی نسبت سوال نہ کرنا۔

چنانچہ اب ایک نیا سفر شروع ہوا۔

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّيْفِينِ خَرَقَاهَا ۝ قَالَ أَخَرَقْتَهَا



لَتُخْرِقَ أَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝ (۱۸/۴۱)  
 پھر ایسا ہوا کہ دونوں سفہ میں نکلے۔ یہاں تک کہ سمندر (دریا) کے کنارے پہنچے اور کشتی  
 میں سوار ہوئے۔ اب موسیٰ کے ساتھی نے یہ کیا کہ کشتی میں ایک جگہ دراڑ ڈال دی۔ یہ دیکھتے  
 ہی موسیٰ بول اٹھا۔ ”آپ نے کشتی میں دراڑ ڈال دی کہ مسافر غرق ہو جائیں؟ آپ نے کیسی  
 خطرناک بات کی۔“

بھئیے! پہلے ہی واقعہ پر ضبط نہ ہو سکا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ (۱۸/۴۲)  
 اس نے کہا ”کیا میں نے نہیں کہا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے؟“  
 حضرت موسیٰ نے کہا کہ مجھ سے بھول ہو گئی، معاف کر دیجئے۔  
 قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُزِهِنِيْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا  
 موسیٰ نے کہا ”بھول ہو گئی اس پر نہ پکڑیئے۔ ایک بات بھول چوک میں ہو جائے تو آپ  
 سخت گیری کیوں کریں۔“

چنانچہ وہ پھر آگے بڑھے اور ایک اور واقعہ پیش آگیا۔  
 فَانْطَلَقَا فَاِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ ۚ قَالَ اَقْتَلْتَنِيْ نَفْسًا زَكِيَّةً  
 بِغَيْرِ نَفْسٍ ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا ذَكْرًا ۝ (۱۸/۴۳)  
 پھر وہ دونوں آگے چلے۔ یہاں تک کہ (ایک بستی کے قریب پہنچے اور) انہیں ایک لڑکا ملا۔  
 موسیٰ کے ساتھی نے اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر موسیٰ بول اٹھا، آپ نے ایک بے گناہ کی جان  
 لے لی۔ حالانکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی۔ آپ نے کیسی برائی کی بات کی۔  
 اس پر انہوں نے پھر کہا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ (۱۸/۴۵)  
 اس نے کہا، کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا، تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔  
 حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ اس مرتبہ اور درگزر کر دیجئے۔ اگر اس کے بعد پھر ایسا کروں تو بیشک مجھے  
 اپنی معیت سے الگ کر دیجئے۔

قَالَ إِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَآؤُلَآءِ لُصِّحْبِي ۖ قَدْ بَلَغْتَ  
مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا ۝ (۱۸/۷۶)

موسیٰ نے کہا ”اگر پھر میں نے کچھ پوچھا، تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا۔ اس صورت میں آپ پوری طرح معذور سمجھے جائیں گے۔

اب آگے بڑھے تو ایک واقعہ اور پیش آگیا جو پہلے دو واقعات سے بھی زیادہ تیز انگیز تھا۔  
فَالْطَّلَاقُ حَتَّىٰ إِذَا آتَيْنَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطَعْنَا أَهْلَهَا فَبِأَوَّلِ  
يُضَيِّقُونَهُمْ فَأَوْجَدُوا فِيهَا جَدَارًا يُرِيدُونَ أَنْ يَنْقُصُوا قَامَهُ ۖ قَالَ  
لَوْ شِئْتُ لَفَعَدْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ (۱۸/۷۷)

وہ دونوں اور آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک گاؤں کے پاس پہنچے۔ گاؤں والوں سے  
کہا، ہمارے کھانے کا انتظام کر دو۔ انہوں نے مہمان نوازی کرنے سے صاف انکار کر دیا پھر  
ان دونوں نے دیکھا، گاؤں میں ایک (برائی) دیوار ہے اور گرا چاہتی ہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ  
کے ساتھی نے (اس کی مرمت شروع کر دی اور) اُسے از سر نو مضبوط کر دیا۔ اس پر موسیٰ (سے)  
نہر گیا (بول اٹھا) ”اگر آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ ان لوگوں سے وصول کرتے“  
(بغیر معاوضہ کے بیکار کی محنت کیوں کی؟)

اس پر انہوں نے کہا کہ اب بس! ہمارا تمہارا ساتھ نبھ نہیں سکے گا۔

قَالَ هَٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۖ سَأُنَبِّئُكَ بِمَا لَمْ  
تَسْتَطِيعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝ (۱۸/۷۸)

تب موسیٰ کے ساتھی نے کہا ”بس! اب مجھ میں اور تم میں جدائی کا وقت آگیا۔ ہاں، جن  
باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا، ان کی حقیقت تمہیں بتلا دیتا ہوں۔

اب اُن باتوں کی حقیقت دیکھئے جن کی لم، حضرت موسیٰ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ  
أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝ (۱۸/۷۹)

سب سے پہلے کشتی کا معاملہ ہو۔ وہ چند غریب آدمیوں کی کشتی تھی جو سمندر میں محنت مزدوری

کرتے ہیں وہ جس طرف بڑھ رہے تھے وہاں ایک بادشاہ ہے (ظالم) جس کسی کی (اچھی) کشتی پاتا ہے، زبردستی لے لیتا ہے۔ میں نے چاہا ان کی کشتی میں ایک عیب نکال دوں۔ (تاکہ یہی دیکھ کر بادشاہ کے آدمی چھوڑ دیں)۔

دوسرا معاملہ لڑکے کے قتل کا تھا۔

وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا  
وَكُفْرًا ۚ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّا زَكَاؤُهُ ۖ  
أَقْرَبَ رُحْمًا ۝ (۸۰-۸۱/۱۸)

باقی رہا لڑکے کا معاملہ، تو اس کے ماں باپ بڑے امن پسند ہیں۔ میں یہ دیکھ کر ڈرا کہ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے ان کے لئے موجب اذیت بن جائے گا۔ پس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس لڑکے سے بہتر انہیں لڑکا دے، دینداری میں بھی اور محنت کرنے میں بھی۔

یعنی لڑکے کے ماں باپ بڑے امن پسند تھے لیکن لڑکا خود بڑا سرکش، باغی اور قانون شکن واقع ہوا تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ کہیں اس کے ماں باپ بھی اس کی قانون شکنی اور بغاوت کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ لہذا اللہ کے اس بندے (رسول) نے اسے قتل کر کے لوگوں کو اس کی فتنہ و فساد کی آگ اور اس کے ماں باپ کو مفت میں مجرم بننے کی عقوبت سے بچالیا۔

تیسرا واقعہ دیوار کی تعمیر کا تھا۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ  
لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا ۚ فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا  
وَيَسْتَفِيزَا كَنْزَهُمَا قَبْلَ رَحْمَةِ رَبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي  
ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۚ (۸۲/۱۸)

اور وہ خود دیوار درست کر دی گئی تو (اس کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ) شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ہے، جس کے نیچے ان کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ پس تمہارے پروردگار نے چاہا، دونوں لڑکے اپنی جوانی کو بچپن میں اور اپنا خزانہ محفوظ پاکر نکال لیں۔

(اگر وہ دیوار گر جاتی، تو ان کا خزانہ محفوظ نہ رہتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اسے مضبوط کر دیا جائے)  
یہ ان لڑکوں کے حال پر پروردگار کی ایک ہر بات تھی جو اس طرح ظہور میں آئی اور یاد رکھو میں  
نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا (اللہ کے حکم سے کیا)۔ یہ ہے حقیقت ان باتوں کی  
جن پر تم صبر نہ کر سکتے!

واقعہ اتنا ہی ہے۔ لیکن اس پر تاویلات کی ماسیہ آرائیاں اتنی طول طویل پڑھادی گئی ہیں کہ  
نفس واقعہ کی حیثیت محض ”مصرعِ طرح“ کی رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب  
حضرت موسیٰ کو ہنوز نبوت عطا نہیں ہوئی تھی اور وہ تلاشِ حقیقت میں مضطرب و بے قرار پھرتے تھے۔  
وحی سے پہلے ان کے پاس ذریعہ علم صرف عقل تھی۔ عقل اور وحی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ عقل کا طریق  
اکشافِ حقیقت ہوتا تجرباتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ حقیقت تک پہنچتی ہے اس کے برعکس، وحی ان تجرباتی کڑیوں  
کو حذف کر کے ایک ہی جہت میں اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں عقل نے طول طویل مراحل کے بعد  
پہنچنا تھا۔ (تفصیل اس کی ”ابلیس و آدم“ میں ”وحی“ کے عنوان کے تابع گزر چکی ہے) جس وقت وحی کسی  
آنے والی بات کا ذکر کرتی ہے تو چونکہ عقل اپنی منطقی کڑیوں سے اس تک پہنچ نہیں سکتی اس لئے وہ  
اس پر معترض ہو جاتی ہے اور اتنا انتظار نہیں کرتی کہ مانہ ذرا اور آگے بڑھ جائے تو حقائق خود بخود بے نقاب  
ہو کر سامنے آجائیں۔ اس واقعہ میں قرآن نے عقل اور وحی کی اس کشمکش کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم  
نے اس کی تصریح نہیں کی کہ وہ ”اللہ کا بندہ“ کون تھا جو حضرت موسیٰ کو ملا تھا۔ فقط اتنا ہی بتایا ہے کہ  
وہ عَبْدٌ مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) تھا جسے اللہ نے اپنے ہاں سے علم عطا  
فرمایا تھا (۱۸/۶۵) لیکن آگے چل کر کچھ باتیں ایسی آگئی ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس ”اللہ کے بندے“  
کا مقام بہت بلند تھا۔ چنانچہ لڑکے کے قتل کے سلسلہ میں انہوں نے کہا ”فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِمَهُمَا“  
(۱۸/۸۰) ”ہمیں خوف ہوا کہ وہ بچہ کہیں کفر و سرکشی نہ اختیار کر لے“۔ فَأَمَّا ذُنَا (۱۸/۸۱) ”سو ہم نے  
چاہا“ کہ اللہ انہیں اس سے بہتر لڑکا عطا کر دے۔ اس سے اگلی آیت میں ”بہ سلسلہ واقعہ دیوار کہا کہ  
فَأَمَّا إِذْ زُجِّلَتْ“ (۱۸/۸۲) ”تیرے رب نے چاہا“ کہ وہ بچے بلوغت تک پہنچ جائیں۔ ان ہر دو  
واقعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام معاملات سے مقصود تکمیلِ مشیت، خداوندی تھی چنانچہ  
ذرا آگے چل کر کہا کہ وَ مَا فَعَلَتْهُ عَنْ أَمْرِی (۱۸/۸۳) ”یہ سب کچھ میں نے اپنے حکم سے نہیں کیا“

اللہ کے حکم سے کیا جس کا میں تابع فرمان (عبد) ہوں۔ (آیات بالا میں فُخْشِیْنَا اور فَاَسْرُدْنَا کا انداز عام اسلوب سے الگ ہے۔ اس ضمن میں ”جوئے لور“ میں حضرت لوطؑ کے تذکرہ جلیلہ میں فرستادگانِ خداوندی کے اندازِ گفتگو پر ایک نگاہ ڈالئے۔ حقیقت سامنے آجائے گی)۔

ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے یہ واقعہ مثیلاً بیان کیا ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ سب کچھ سچ مچ واقعہ ہوا تھا، تو بھی اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو ادھر ادھر کی دوراز کار تاویلات کی محتاج ہو۔

اس واقعہ میں ایک جزو البتہ ایسا ہے جس کے سمجھنے کے لئے ذہن میں ذرا سا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے لیکن وہ الجھاؤ بھی اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب پہلے یہ تصور کر لیا جائے کہ اس ”اللہ کے بندے“ نے ایک جھوٹے سے معصوم بچے کو مار ڈالا اور مار ڈالا اس خدشہ کی بنا پر کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے لئے ایسا ثابت ہوگا۔ قرآن کریم نے اسے غلام کہا ہے (۱۸/۸۰، ۱۸/۷۴)۔ غلام اسے کہتے ہیں جس کی سین بھیگ رہی ہوں، یعنی نوجوان۔ اور مجازاً پیدا ہونے سے جوانی تک کی عمر کے لڑکے کو بھی غلام کہتے ہیں۔ اس لئے اس مقام پر (جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا) غلام سے مراد ایک نوجوان لڑکا ہے۔ اب رہا خدشہ سو اس کے لئے قرآن کریم کے الفاظ ہیں فُخْشِیْنَا اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا ۙ کُفْرًا (۱۸/۸۰) اَرْهَقَ کے معنی ہیں زبردستی سے کسی دوسرے کو ڈھانپ دینا۔ (دیکھئے ۱۰/۲۶) اب معنی واضح ہو گئے کہ وہ لڑکا ملک (یا شریعت) کے قانون کا منکر اور سرکش اور باغی تھا۔ لیکن اس کے ماں باپ قانون کے فرماں بردار اور امن پسند تھے۔ اس کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ماں باپ پر بھی زبردستی کرتا تھا۔ اس لئے خدشہ یہ تھا کہ کسی دن اس زبردستی سے وہ انہیں بھی اسی قسم کی سرکشی میں اپنے ساتھ نہ ملا لے۔ اس لئے اس کا قتل اس کے فساد و سرکشی کے جرم کی بنا پر تھا جو قانون کی رُو سے بالکل جائز تھا اور ضروری اس لئے کہ اگر اسے ہلکتا مل جاتی تو اندیشہ تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی زبردستی ان جرائم میں شریک کار بنالیتا۔ یا اگر وہ ان کے پاس پناہ لیتا تو قانون کی نگاہوں میں وہ بھی برابر کے مجرم قرار پا جاتے۔ فَاَسْرُدْنَا اَنْ یُّبْیِّنَ لَهُمَا رَبُّهُمَا خَبَرًا مِّنْهُ زَكُوَّةٌ ۙ وَاَقْرَبَ دُحْمًا (۱۸/۸۱) کے الفاظ بھی اس لڑکے کی سیرت پر گواہی دیتے ہیں کہ اس میں نیکی کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی ماں باپ کے لئے جذبہ رحم اور ہمدردی تھا اس لئے دعار یہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سرکش اور ظالم بیٹے کے بدلہ

میں ایک ایسا لڑکا عطا کرے جو نیکو کار ہو اور رحمدل۔ حضرت موسیٰ نے اس لڑکے کو نفْسًا زَكِيَّةً (۱۸/۴۴) ”ایک بے گناہ جان“ کہا تھا، اس لئے کہ انہیں اس کی سرکشی کا علم نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس ”اللہ کے بندے“ نے ایک فوجوان کو راہ چلتے پکڑ کر مار ڈالا ہے۔ وہ لامحالہ ہی کہہ سکتے تھے کہ ”تم نے ایک بے گناہ انسان کو ناحق مار دیا (۱۸/۴۴)۔ لیکن اس ”اللہ کے بندے“ کو معلوم تھا کہ وہ سرکش اور مفسد لڑکا ہے جس کے فتنہ و فساد سے نہ صرف بے گناہوں کا خون ہی ہو رہا ہے بلکہ خطرہ ہے کہ اس کے شعلوں کی پیٹ میں اس کے نیک ماں باپ بھی نہ آجائیں۔

ہم نے جیسا کہ پہلے لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ کو نبوت ملنے سے پیشتر کا ہے اور جن صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی وہ خدا کے رسول تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس واقعہ میں کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہ جاتی، لیکن عام طور پر اس واقعہ کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ کی نبوت کے بعد کا ہے اور جو بزرگ انہیں ملے تھے وہ ایک ”روحانی پیشوا“ (خواجہ نصر) تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ

(۱) جب حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی کو بھی ایک مرشد طریقت کی ضرورت تھی تو عام انسان مرشد کی ہدایت و تلقین کے بغیر کس طرح سیدھی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(۲) شریعت کے احکام ظواہر پر مبنی ہوتے ہیں لیکن اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حقائق و بواطن ظواہر سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے مرشد وہی ہو سکتا ہے جس کی نگاہ بواطن و اسرار پر ہو اور اگر اس کا کوئی عمل ظواہر سے غلاف بھی ہو، تو بھی اس پر حرف گیری نہیں کرنی چاہیئے۔

شریعت اور طریقت

اس صغریٰ و کبریٰ کی بنیادوں پر ”پیری مریدی“ کی عظیم الشان عمارت تیار ہو گئی اور یہیں سے شریعت اور طریقت کا بنیادی فرق شروع ہو گیا، یعنی دین کی اصل اسرار و رموز ہیں جو ظواہر پرستوں (اہل شریعت) کی سمجھ میں نہیں آ سکتے اور ان کے سمجھنے کے لئے ”علم لدنی“ کی ضرورت ہے جو مخفی طریق پر سینہ بسینہ ارباب طریقت میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قرب الہی کا ذریعہ ہی اسرار و معارف ہیں جنہیں عام نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ مرشد کی

لے یاد رکھئے قرآن کریم کی رو سے خدا کے سوا کوئی مرشد نہیں۔ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نگاہ ان بواطن و اسرار پر ہوتی ہے اس لئے اس کا کوئی حکم اگر ظاہر کے خلاف بھی ہو تو بھی اس پر جرح و تنقید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ صحیح راہ عمل یہی ہے کہ انسان اپنے مرشد کی اطاعت میں آنکھیں بند کئے چلا جائے۔

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر منماں گوید  
کہ سالک بے خبر ہو در راہ و رسم منزل لہا

اگرچہ اس واقعہ میں ”پیری مریدی“ کا کوئی سوال ہی نہیں اور اس لئے مندرجہ صدر ”نتائج“ کی تردید میں لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت نہیں، بایں ہمہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بتا دیا جائے کہ قرآن کی رو سے بھی ”پیری مریدی“ کی کوئی حقیقت نہیں اور ”اسرار و رموز“ کی نظر فریب عمارت جس کی آئینہ بندی بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے، ایک ایسی بنیاد پر استوار ہے جس کی سند قرآن کریم میں نہیں مل سکتی۔ اس کا جذبہ محرکہ بھی دراصل انسان کی وہی عجوبہ پسندی ہے جو کھلی ہوئی حقیقتوں سے سیراب

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) يُضِلُّنَ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّشْرِئًا ۝ (۱۸/۱۷) جسے اللہ ہدایت دے تو وہی (درحقیقت) راہ ہدایت پر ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو اس کے لئے کوئی کار ساز مرشد نہیں: اور وہی ہادی ہے وَ كَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًّا وَ نَصِيْرًا (۲۵/۳۱) ”اور تیرا رب ہادی اور نصیر کافی ہے“ یہ مرشد خداوندی قرآن کریم سے ملتی ہے۔

قُلْ اَوْحٰی اِلٰیَّ اَنَّهُۥ اَسْتَمِعْ نَفْرًا مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝  
يُّهْدِيْٓہٗۤ اِلٰی الشَّرٰٓئِیِّ فَاَمَّا یَہٗ ؕ وَ كُنْ لِّشَرِّکِ بِرَبِّتَآ اَحَدًا ۝ (۷۲/۲-۱)  
(اے پیغمبر اسلام!) تم کہو کہ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتلایا گیا ہے کہ جنگلی آدمیوں کی ایک جماعت نے سنا تو وہ (اپنی قوم کے پاس گئے اور کہنے لگے) ”ہم نے عجیب طریقہ سے قرآن کو سنا جو نیکی کے رستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں کریں گے۔“

اور ہدایت بھی وہیں سے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہونے کے بجائے سربسرا زوں کی تلاش میں لذت محسوس کرتی ہے۔

نبی اکرم شریعت لائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا اور ارشاد فرمادیا کہ  
يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ  
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے (خدا کے بندوں  
تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا  
پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادا کئے فرض رسالت میں کوتاہی کی)، اور اللہ تمہیں انسانوں (کے  
شر) سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ  
اختیار کی ہے۔

حضور نے اس وحی کا ایک ایک لفظ امت تک پہنچا دیا۔ آپ اسی قرآن کی تعلیم فرماتے تھے۔ خود بھی اس پر  
عمل کرتے اور اسی کے مطابق دوسروں سے عمل کرا کر ان کی ذات کی نشوونما کرتے تھے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رُسُلًا مِنْهُمْ ۖ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ  
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا  
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (۲/۱۲۹)

وہ خدا جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیج دیا جو ان کے سامنے خدا کی  
آیتیں پڑھتا ہے اور ان کی ذات کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا  
ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے گھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

کوئی راز نہیں | اس تعلیم و عمل میں نہ کوئی راز تھا، نہ خفیہ سرگوشیاں۔ یہ سب کچھ کھلے بندوں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ (۲/۱۸۵)۔

یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول (م شروع) ہوا ہے۔ وہ انسانوں کے لئے رہنما ہے۔  
ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔



ہوتا تھا۔ مسلمان تو ایک طرف، غیر مسلموں سے بھی کسی قسم کا اخفائے راز نہ تھا۔ حضورؐ نے یہ فریضہ رستہ بکمال حسن و خوبی ادا فرمایا۔ اس زمین پر فدائی حکومت قائم ہوئی اور حجتہ الوداع میں لاکھوں کے مجمع سے پوچھا کہ کہو! میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا یا نہیں؟ ہر ایک نے اس کی شہادت دی اور اس پر حضورؐ نے خود اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا **اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ**۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اس کے بعد یہ تصور میں بھی لایا جاسکتا ہے کہ دین کے بہت سے (یا کھوڑے سے) اسرار و رموز حضورؐ نے (معاذ اللہ) چھپا کر رکھ لئے تھے اور دو چار مخصوص حضرات کو چپکے چپکے بتا دیئے تھے تاکہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو؛ لیکن باہیں ہمہ آپ دیکھیں گے کہ یہ عقیدہ موجود ہے کہ اسرار و بواطن، جو دراصل دین کی اساس اور روح ہیں، پردہ راز میں رکھے گئے تھے اور ان کی تعلیم خفیہ طور پر ہوئی تھی جہاں سے یہ سلسلہ سینہ بسینہ آگے منتقل ہوا۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر تصوف کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔ چنانچہ خود بخاری شریف میں یہ روایت موجود ہے۔

عن ابی ہریرۃ قال حفظت عن رسول اللہ دعاء میں . فاما  
احدهما فبثثته و اما الآخر فلو بثثته قطع هذا المعلوم.  
(بخاری جلد اول ص ۲۴)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے دو برتن (لے کر) یاد رکھے۔ ایک کو تو میں (لوگوں کے سامنے) کھول چکا۔ رہا دوسرا، تو اگر میں اس کو بیان کر دوں تو یہ حلق کاٹ دیا جائے (یعنی اسرار و معرفت)۔

یہ ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن کریم ہی کی تعلیم فرمایا کرتے تھے جس کے متعلق حضورؐ کو ارشاد تھا کہ **بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو)۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی حضورؐ نے اسی قرآن کی تعلیم دی ہوگی۔ اب تعلیم کے ایک حصہ کو ظاہر کرنا اور ایک حصہ کو چھپا رکھنا کس طرح سے جائز ہو سکتا ہے؟ حالانکہ قرآن کریم میں بالتصریح موجود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ تعلیم کو چھپائے اس کے لئے عذاب الیم کی وعید ہے (۲/۱۷۴)۔ خود حضرت ابو ہریرہؓ نے اس آیت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ میں اسی لئے بکثرت احادیث کی روایت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کتمان کتاب سے سخت منع فرمایا ہے۔ (بخاری جلد اول ص ۲۴) اور بخاری شریف میں اسی کتاب علم کے تحت ایک باب "لیبلغ العلم الشاهد الغائب"

کے عنوان سے موجود ہے۔ ان تصریحات کے پیش نظر تعلیم نبویؐ کے کسی حصہ کو چھپانا کیا معنی رکھتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسے ”اسرار و رموز کی تعلیم“ کے سلسلہ میں بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر ہم تصوف کی تاریخ نہیں لکھنا چاہتے (کہ یہ اس کا مقام نہیں) اور نہ **اسلام کا مقصود** یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی کہ یہ تمام عقائد کن کن راستوں سے اسلام میں داخل ہوئے اور کس طرح انہوں نے اسلام جیسے نھرے اور واضح نظام زندگی کو بھول بھلیاں بنا دیا۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اسلام کا مقصد ایک ایسا نظام حیات قائم کرنا ہے جس میں انسان خود بھی قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرے اور ان قوانین کو عملی صورت میں دنیا میں نافذ کر سکے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جاسکے جو قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔ نبی اکرمؐ نے اپنے عالمتاب عمل سے بتا دیا کہ یہ نظام کس طرح سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہوجاے تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس کی زندگی قرآن کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوگی۔ اس کا نام تزکیہ نفس ہے۔ یہ جماعت ایک ایسی مشینری ہوگی جس کا ہر پردہ اپنی اپنی جگہ پر نہایت محکم اور پایدار (اصلح) ہوگا۔ ان تمام پردوں کی نفل و حرکت سے یہ پوری مشین سرگرم عمل ہوگی اور اس کے عمل کا نتیجہ دنیا میں حکومت قرآنی کا قیام و استحکام ہوگا۔ اسی کا نام استخلاف فی الارض ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ  
فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ  
دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ  
أَمْنًا ۖ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ  
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (۲۴/۵۵)

خدا نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے صلاحیت بخش کام کئے ہیں یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں زمین کی حکومت ضرور عطا فرمائے گا جیسا کہ وہ ان سے پہلے (تو من اور صالح) لوگوں کو عطا فرماتا رہا ہے اور یہ کہ ان کے اُس دین (اسلام) کو جسے

وہ ان کے لئے پسند فرما چکا ہے تمکن (اور قوت و شوکت) عطا فرمائے گا اور یہ کہ بیم و خوف (کے زمانہ) کے بعد (اُن کا زمانہ) امن (کے زمانہ) سے تبدیل کر دے گا۔ (ان عنایات کے وعدے صرف اس وجہ سے ہیں کہ وہ میری ہی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرتے ہیں اور (میری اطاعت و محکومیت میں) میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور (یاد رکھو کہ) جو کوئی اس (کھلے وعدہ) کے بعد بھی نافرمانی اختیار کرے تو سمجھ لو کہ یہی لوگ (دراصل) سرکشی کرنے والے لوگ ہیں۔

**لیکن مسلمانوں نے کیا کیا؟** یہ سب کچھ حاصل ہو گا مجاہدانہ سعی و عمل سے۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے (مختلف اسباب و علل کی بنا پر) یہ درخشندہ نصب العین او جمل ہو گیا اور قلب و نگاہ کی محکومی سے تن آسانی اور سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، تو انہوں نے بھی (دوسری اقوام کی طرح) دین کو محض انفس راوی تربیت کا ذریعہ سمجھ لیا اور اس کے لئے مختلف راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ وہ کھلی ہوئی شاہراہ (صراطِ مستقیم) جس پر گامزن ہو کر دنیا میں قرآنی حکومت قائم کی گئی تھی، بالکل واضح تھی جس میں کوئی پیچ و خم نہ تھا۔ لیکن یہ پگڈنڈیاں جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ قرب الہی کے مختصر راستے (Short cuts) ہیں، پیچ در پیچ تھیں جن کا علم خاص خاص "سالمینِ راہِ حقیقت" کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ واضح شاہراہ پر چلنے کے لئے (جس پر خدا کے مقدس کارواں اور اس دانائے سبل کارواں سالار کے نقوش قدم ستاروں کی طرح چمکتے تھے) تبدیل قرآنی کی روشنی کافی تھی۔ لیکن ان پیچدار راہوں میں جب تک کوئی "مُرشدا" ہاتھ پکڑ کر آگے نہ جائے، ہر وقت راستہ کھوجانے کا خطرہ تھا۔ یہ ہے اسلام و بوطن کی وہ دنیا جو اس ظاہری دنیا سے بالکل الگ ہے جہاں کے آئین و دستور

لے یہ خصوصیت کبریٰ صرف قرآنِ کریم ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ فرد اپنی تکمیل ذات (یعنی تکمیل شرفِ انسانیت) کے لئے جماعت کا محتاج ہے۔ اس لئے نظامِ اسلامی کے لئے جماعتی زندگی لاینفک ہے۔ قرآن کے علاوہ ہر مذہب (جس شکل میں وہ آج دنیا میں موجود ہے) اور ہر فلسفہ نے یہی کہا کہ انسان کی "روحانی ترقی" یا ذات کی نشوونما، صرف انفرادی طور پر ہو سکتی ہے۔ رہبانیت یا تصوف اسی کا نام ہے۔

نزلے اور راہ و رسم منزل انوکھے ہیں اور ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ اس فن کی تحصیل کی راہیں ہیں جن کا ذکر سحر کے عنوان میں کیا جا چکا ہے۔

## سیخ فطرت اور تصوف | باطنیت (MYSTICISM) کس طرح اور اک حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتی اس کے لئے "ابلیس و آدم میں" وحی

کے عنوان کے تابع تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت ضمناً ایک اور گوشہ پر بھی نگاہ ڈالئے۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ سماعت و بصارت (sense perception) کو علم انسانی کے حصول کے ذرائع قرار دیتا ہے اور تجربات و مشاہدات حسی کے ذریعہ سیخ فطرت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ کس محکم نظام کے ماتحت سرگرم عمل ہے اور اس سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں۔ وہ تخلیق ارض و سموات، تکویر لیل و نہار، تنویر شمس و قمر، تقدیر شجر و حجر، غرضیکہ ایک چھوٹے سے پھوٹے ذرہ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے مجرّ العقول نظام فلکی تک ہر شے میں غور و فکر کا حکم دیتا ہے اور اسی غور و فکر پر علم الاشیاء کی محکم عمارت قائم کرتا ہے۔ مسلمان اسی انداز تحقیق و تفتیش کو لے کر اٹھے اور جس شاہراہ زندگی پر جا رہے ہیں۔ ہوئے کائنات کی مستور قوتوں نے ان کے سامنے اپنے سینے کھول دیئے۔ انہوں نے علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں سمجھ لیا تھا کہ

فطرت کا علم خدا کی خدائی کا علم ہے۔ جب ہم فطرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو گویا ہم آقائے مطلق سے قریب تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔

(خطبات صفحہ ۷۷)

لیکن اس دورِ عمل کے بعد جب "طاؤس و رباب" کا زمانہ آیا، تو حکمت یونان کی افسوں گری ان کے قلب و دماغ پر چھا گئی اور انہوں نے قرآنی طریق حصولِ علم و سیخ فطرت کو چھوڑ کر زخمی مسالک اختیار کر لئے۔ سقراط نے اپنی توجہات کا مرکز عالم آفاق کے بجائے "انسان" کو قرار دیا تھا۔ اس کے شاگرد (افلاطون) نے اس باب میں اور بھی شدت اختیار کی اور نیلئے محسوسات کو پائے استحقاق و منفرد سے ہٹا کر صرف "باطنی دنیا" کو حقیقی علم قرار دے دیا۔ یہی وہ حکمت تھی جو تصوف کا حسین و (فلٹ نوٹ ص ۱۸۷ صفحہ پر دیکھئے)

مقدس نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے دل و دماغ پر ستولی ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم      از گروہِ گوسفندانِ قدیم  
آنچنان افسونِ نامحسوس خورد      اعتبار از دست و چشم و گوش برد  
گفت سیرِ زندگی در مردن است      شمع را صد جلوه از افسردن است  
بر تخیلِ مائے فساں رواست      جم اُذ خواب آور و گیتی رُباست  
گوسفندے در لباسِ آدم است      حکم اُو بر جانِ صوفی حکم است

غور فرمائیے کہ عمل کی دنیا تو ایک طرف، علمی دنیا میں بھی یہ ”باطن پرستی“ کس طرح عینِ اسلام بن گئی۔ حکمتِ یونان کے علاوہ ایرانیوں کی نسل پرستی بھی اس باطن پرستی کا بہت بڑا موجب بنی، لیکن ان مختلف کڑیوں کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔

**علم النفس** | اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے عالمِ آفاق کے ساتھ ساتھ عالمِ انفس میں غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَفِي الْأَمْزِجِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۱)

اور (دیکھو) یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (خدا کی) بہت سی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں (تم ان پر غور کیا کرو)۔

اس سے متصل آیت میں یہ بھی فرمادیا کہ

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱/۲۱)

اور خود تمہاری ذات میں بھی (بہت سی نشانیاں موجود ہیں) تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ لے

ہر چند اس سے ذرا پہلے یہودیت اور عیسائیت کے مسلکِ ربانیت کے اثر کے باعث، کہیں نہیں مسلمان صوفیوں کی خانقاہیں بھی قائم ہو چکی تھیں، لیکن اسے ایک مستقل شعبے کی حیثیت حکمتِ یونان ہی کے ماتحت آکر حاصل ہوئی۔ لہٰذا یونانی مفکر اس امر پر زور دیتے تھے کہ کائنات سکونی ہے۔ یہ تصویر بھی قرآنی تصور کے خلاف تھا جو کائنات کو حرکتی قرار دیتا ہے۔ ان دونوں تصورات میں کیا فرق ہے؟ یہ الگ الگ بحث ہے جس کی توضیح کا یہ مقام نہیں۔

سورہ روم میں اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا جہاں ارشاد ہے کہ علم صحیحہ کے حصول کے لئے عالمِ طبیعی میں تدبیرِ تاریخِ اُمم میں تفکر اور عالمِ انفس میں تبصر نہایت ضروری ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِإِحْسَنٍ ۖ وَإِنَّ أَكْثَرِيَّ النَّاسِ لَبِلَاقِي رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ۚ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ٥ (۸-۳۰)

اور کیا ان لوگوں نے خود اپنے آپ پر غور نہیں کیا؟ (اگر غور کرتے تو خدا کی قدرت کی ہزار ہا نشانیاں انہیں خود اپنے ہی اندر مل جاتیں) آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے خدا نے حق کے ساتھ اور ایک معیار و معیت کے لئے پیدا کیا ہے اور بلاشبہ بہت سے لوگ اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہیں۔ کیا وہ زمین میں گھومے پھر نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلی امتوں کا انجام کیسا کچھ ہو چکا ہے؟ وہ طاقت و قوت میں ان سے زیادہ مضبوط تھے اور انہوں نے زمین کو بھی ان سے زیادہ بویا جوتا اور جتنا ان لوگوں نے زمین کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ ان لوگوں نے آباد کر رکھا تھا۔ ان کے رسول بھی ان کے پاس واضح دلائل کے ساتھ آچکے تھے (مگر انہوں نے انکار و بد عملی کی زندگی کو نہ چھوڑا بالآخر اس کا نتیجہ بھی ان کے سامنے آکر رہا) خدا ایسا نہیں تھا کہ ان پر (خواہ مخواہ) ظلم کرتا اور بلاوجہ انہیں تباہ کر دیتا۔ لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے۔

لیکن اس "عالمِ انفس" سے مراد کوئی باطنی دنیا نہیں۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ دیگر اقوام کے علاوہ، تم خود اپنی قوم پر ہی نگرِ بصیرت سے غور کرو۔ لیکن اگر "انفس" سے مراد خود انسان ہی ہو تو انسان کے جسم کی مشینری اور حیاتیات کا علم ایک عظیم دنیا اپنے اندر رکھتا ہے اور اگر اس سے مفہوم "انسانی ذات" (human personality) ہی لیا جائے، تو بھی اس سے علمِ انفس

(psychology) ہوگا جسے علم الفطرت کی طرح ایک سائنس کی حیثیت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو افراد سے گزر کر جب اقوام تک پہنچتا ہے تو ان انقلابات کا پتہ دیتا ہے جو ان کی زندگی کے سرچوں میں کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی انقلابات، نفسیاتی انقلابات ہی کا مظہر ہوتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ثابت ہے جسے قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمُرِيْدٌ مُّغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۗ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۱۳/۱۱ یز)

(اور) یہ بات اس لئے ہوئی کہ اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ جو نعمت وہ کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے، اسے پھر کبھی نہیں بدلتا، جب تک کہ خود وہ گروہ اپنی نفسیاتی کیفیت کو نہیں بدلتا اور (یہ اس لئے کہ) اللہ (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔

اقوام و ملل کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی و قلبی ماجریات کا یہی وہ علم ہے جس کے ذریعہ آج اقوام مغرب باقی اقوام عالم کی دنیائے فکر و نظر پر غیر محسوس طور پر چھائی ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہاں ابھی یہ علم اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ اگر اس علم کو بھی انتہائے تکمیل تک پہنچایا جائے اور پھر اس کے ماحصل سے قرآنی روشنی میں متمتع ہوا جائے تو دیکھئے کہ یہ دنیا کس طرح جنت ارضی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اصل تبدیلی تو نگاہ کے زاویوں کی تبدیلی ہے۔

فروع دیگر میں جہاں دیگر شود

این زمین و آسماں دیگر شود

**علم لدنی** | حضرت موسیٰ کے واقعہ زیر نظر میں اس بزرگستی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا** (۱۸/۶۵) ”اسے ہم نے اپنے ہاں سے علم سکھایا تھا۔“ یہاں سے ہمارے ہاں ”علم لدنی“ کی عجیب و غریب اصطلاح آگئی ہے۔ علم لدنی سے مراد لیا جاتا ہے ایسا علم جو طابری ذرائع و وسائط سے حاصل نہ کیا جائے بلکہ کسی مخفی طریقہ سے یونہی مل جائے۔ یہ بھی درحقیقت ”ظاہری و باطنی“ (شریعت و حقیقت) کی تفریق و تمیز ہی کی ایک شق ہے اور حصول علم کا وہی باطنی طریقہ جسے ابھی حکمت یونان کے مائٹس لکھا جا چکا ہے مندرجہ صدر آیت میں اللہ تعالیٰ

نے فرمایا ہے کہ ”ہم نے اپنے اس بندے کو اپنے ہاں سے (مِنْ لَدُنَّا) علم عطا فرمایا تھا“ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مِنْ لَدُنَّا سے قرآن کریم کی مراد کیا ہے؟

جیسا کہ اس سے پیشتر کئی ایک مقامات پر لکھا جا چکا ہے، وحی وہ علم ہے جو مادی اسباب و ذرائع کے بغیر حضرات انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے، لیکن یہ موهبت کبریٰ مخصوص ہے نبوت کے ساتھ۔ اس میں کسی دوسرے انسان کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کو مِنْ لَدُنَّا (یعنی اللہ کی طرف سے عطا فرمودہ) کہا ہے۔ قرآن کریم کے متعلق فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ آيَاتِنَا ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ

الف۔ لام۔ را

(۱۱/۱)

یہ کتاب ہے جس کی آیتیں (اپنے مطالب و دلائل میں) مضبوط کی گئیں، پھر کھول کھول کر واضح کر دی گئیں۔ یہ اس کی طرف سے ہے جو حکمت والا (اور ساتھ ہی) ساری باتوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

سورہ نمل میں ت۔

وَإِنَّكَ لَتَلْقَىٰ الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝ (۲۴/۹۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) بلاشبہ تمہیں یہ قرآن اُس (خدا) کی طرف سے سکھایا جاتا ہے جو حکمت والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

وحی کے علاوہ وہ صلاحیتیں جو انسانی طبائع میں از خود موجود ہوتی ہیں اور انہیں اکتساباً حاصل نہیں کیا جاتا، ان کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ ”ہمارے ہاں“ سے ملتی ہیں۔ حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے۔

يُحْيِي خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۚ وَحَنَانًا  
مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۖ وَكَانَ تَقِيًّا ۚ (۱۲-۱۳/۱۹)

”اے یحییٰ“ تو کتاب الہی کے پیچھے مضبوطی سے لگ جا۔ چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ ہم نے اسے علم و فضیلت بخش دی۔ نیز اپنے ہاں سے دل کی نرمی اور نفس کی نشوونما کی صلاحیت عطا فرمائی۔

لیکن مِنْ لَدُنَّا ان انعامات و خطائن کے متعلق بھی آیا ہے جو مادی اسباب و ذرائع کے



ماتحت حاصل ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت زکریا نے بیٹے کے متعلق دعا مانگی۔

هٰذَا لَكَ ذُعَا زَكْرِيَّا رَبِّهٖ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً  
طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَا ۝ (۳۱/۳۸)

اسی جگہ کا یہ معاملہ ہے (یعنی قربان گاہ کا) زکریا نے اپنے پروردگار کے حضور دعا مانگی تھی ”خدایا! تو اپنے خاص فضل سے مجھے پاک نسل عطا فرمایا (جو مریم کی طرح نیک اور عبادت گزار ہو)۔ بلاشبہ تو ہی ہے کہ دعائیں سننے والا اور التجائیں قبول کرنے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ اولاد طبعی اسباب کے ماتحت ہی عطا ہوتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھتے ہجرت (نبی اکرم) کے بعد بعض کمزور اور ضعیف مسلمان مکہ میں گھر گئے تھے۔ ان کی دعاؤں کو قرآن کریم نے اپنی آغوشِ رافت میں محفوظ کر لیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ اَوْ تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ..... وَ اَجْعَلْ لَّنَا  
مِنْ لَدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)

اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا! ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا! (یعنی مکہ سے نجات دلا) اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنادے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے!“

ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ امداد ظاہری اسباب کے ماتحت ہی پہنچی تھی جب مجاہدین کی مسلح جماعت ان کی حمایت کے لئے آگے بڑھی تھی کوئی باطنی مدد نہیں تھی۔ سورہ قصص میں اہل مکہ کے متعلق فرمایا کہ اگرچہ ان کی آبادی بے برگ و گیاہ دادی میں واقع ہوئی ہے لیکن ان کا رزق اطراف و اکنافِ عالم سے کھنچا چلا آتا ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں سے ”رزق قرار دیا ہے۔

اَوْ لَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا اِمِنًا يُحْجَبِيْ اِلَيْهِ تَمَرَاتٌ كُلِّ شَيْءٍ  
رَّزَقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۸/۵۷)

کیا ہم نے انھیں امن دلے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھینچے چلے آتے ہیں۔  
یہ ہماری طرف سے رزق ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔  
اعمال انسانی کی جزا کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ کے ہاں سے ملتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَإِنْ تِلْكَ حَسَنَةٌ يُفْعَلُهَا  
ذُ يُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۴/۴۰) نیز (۴/۴۱)

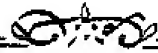
(یاد رکھو) اللہ (مکافات عمل میں) ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا (کہ عمل کے بدلے میں  
کسی طرح کی کمی ہو جائے یا کوئی بدلے سے محروم رہ جائے) اس کا قانون تو یہ ہے کہ اگر ذرہ  
برابر بھی کسی نے نیکی کی ہے تو وہ اسے دوگنا کر دے گا اور پھر اپنے پاس سے ایسا بدلہ بھی عطا  
فرمائے گا جو بہت بڑا بدلہ ہوگا!

اسی سلسلہ میں ان آیات کو بھی دیکھئے۔ (۱۴/۸۰، ۲/۴، ۱۱۸/۱۰، ۱۱۸/۲)

ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مِنْ لَدُنَّا (ہماری جناب سے) ارشاد  
فرماتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ یعنی ان امور میں جن کا تعلق کسب و ہنر سے نہیں ہوتا اس سے  
مفہوم بلا مادی اسباب و ذرائع ہوتا ہے (جیسے وحی) لیکن جن امور میں انسانی کسب و ہنر کو دخل ہوتا ہے  
ان میں مقصود اسباب و ذرائع کے ماتحت ظہور نتائج ہوتا ہے۔ وحی خاصہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس علم  
کو علم لَدُنِّي (بلا مادی اسباب و ذرائع اور بغیر انسانی کسب و ہنر من جانب اللہ) کہا جائے گا۔ لیکن وحی  
کے علاوہ ہر قسم کا علم انسانی کسب و ہنر سے حاصل ہوگا۔ چونکہ وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، اس لئے اب  
تمام علوم عام اسباب و ذرائع کے ماتحت انسانی کسب و ہنر سے ہی حاصل ہوں گے اور ان کا دروازہ  
ہر انسان کے لئے کھلا ہوگا جو ان کا متلاشی ہو۔ اسلام کسی چور دروازہ کا قائل نہیں۔ اس لئے آج اس آسمان  
کے نیچے علم لَدُنِّي (من جانب اللہ بلا کسب و ہنر علم) صرف قرآن کریم کی وقتین کے اندر ہے، اس سے باہر  
اور کہیں نہیں۔ اس کے علاوہ تمام علوم اکتسابی ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھئے قصہ حضرت موسیٰؑ میں "اللہ کے بستہ"  
نے کہا تھا کہ "مَا فَعَلْتُهِ عَنْ أَمْرِي" (میں نے یہ کچھ اپنے اختیار و فیصلہ سے نہیں کیا)۔  
آج یہ جرأت کسے ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جس کی قرآنی سند اس کے پاس نہ ہو اور پھر دعویٰ  
کرے کہ "مَا فَعَلْتُهِ عَنْ أَمْرِي" (میں نے یہ اپنے فیصلہ سے نہیں کیا، بلکہ خدا کے

حکم سے کیا ہے! آج خدا کے فیصلے اور اس کے احکام قرآن کریم کے اندر ہیں۔ جو شخص ان کے مطابق عمل اور حکم کرتا ہے وہی کہہ سکتا ہے کہ ”مَا فَعَلْتُهَا عَنْ أَهْرِي“ اس کے علاوہ کوئی لاکھ کشف والہام اور ”عَلِمَ لَدُنِّي“ کا مدعی ہو، اس کا اس قسم کا دعویٰ باطل ہے۔ جیسا کہ ابلیس و آدم (باب ۲۱) میں جو لکھا جا چکا ہے، کشف والہام (جسے بنی بر) علم لدنی کہا جاتا ہے) قوتِ نفسی کے مظاہرے میں جو انسانی طور پر حاصل کئے جاسکتے ہیں اور ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس لئے نہ ان کا دین سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ کسی کے لئے حجت قرار پاسکتے ہیں۔ حجتِ دینی کتاب اللہ ہی ہے جو سرتاپا یقین اور حقیقت ہے۔

[قصہ حضرت موسیٰؑ اور ”خدا کے اس بندے“ کے سلسلہ میں، میں نے ”مفہوم القرآن“ میں آیت (۱۷/۸۲) کے فٹ نوٹ میں جو تشریح پیش کی ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔]



وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ٥

# سِطَوَاتِ اودى

## شوکتِ یمانی

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہاں گیری  
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایمان کی تفسیریں

## حضرت داؤد علیہ السلام

ہم گذشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ جناب طاوت، بنی اسرائیل کے کمانڈر مقرر ہوئے تھے جن کی زیر سرکردگی حضرت داؤد نے طاوت کو قتل کیا تھا۔ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے ملک و سلطنت کے ساتھ ساتھ نبوت و رسالت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان کا زمانہ قریب ۳۰۰۰ ق م سمجھنا چاہیے۔ قرآن کریم میں فقط اتنا ہے کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے تھے۔

وَدَّهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ  
قَبْلُ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَيُوسُفَ ۚ وَمُوسَى  
وَهَارُونَ ۚ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (۴/۸۴)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہ راست دکھائی اور ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھا چکے ہیں۔

اور ابراہیم کی نسل سے داؤد، سلیمان، یاقوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (یہی) راہ دکھائی۔ ہم اسی طرح حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔  
آپ پر روز نازل ہوئی تھی۔ (۴/۵۵: ۴/۵۶) جس میں در اثرت ارضی کے آئین و قوانین مذکور تھے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا  
عِبَادِي الصَّالِحُونَ ۝ (۲۱/۱۰۵)

اور (دیکھو) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ ”زمین کی دراشت انہی بندوں کے حصے میں آئے گی جو اپنے اندر دراشت ارضی کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔“  
یہ کتاب، تورات (عہد عتیق) کے مجموعہ میں شامل ہے اور جو حال تحریف والحاق کے اعتبار سے خود تورات کا ہے وہی اس مجموعہ کی دوسری کتابوں کا بھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ (اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ) کو علم عطا فرمایا تھا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ وَقَارَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲۴/۱۵)

اور ہم نے داؤد اور (اس کے بیٹے) سلیمان کو علم (نبوت) عطا فرمایا۔ چنانچہ (شکرگزاری کے طور پر) وہ دونوں پکار اٹھے ”اس خدا کی ہزار ہزار تعریف ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر (علم نبوت کے لئے منتخب فرما کر) برتری بخشی۔“

اور بالخصوص معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ۔

وَشَدَدُ ذُنَا مُلْكِهِ ۚ وَ آتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَ فَضَّلَ الْخَطَابَ (۳۸/۲۰)

ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کر دیا اور (مزید برآں) ہم نے اسے دانائی اور معاملہ فہمی عطا فرمائی۔

اور اس قوت فیصلہ کے ساتھ چونکہ شرف نبوت بھی حاصل تھا اس لئے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ فیصلے حق پر مبنی ہوں اور ذاتی رجحانات کسی معاملے پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔

يٰۤاٰدٰدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ

بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ

الَّذِيْنَ يَظْلُمُوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ يَمْسُوْنَ

نَسُوًا يَوْمَ الْحِسَابِ ؕ (۳۸/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں (گذشتہ طاقتوں کا) جانشین بنا دیا ہے۔ پس تم

لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو اور اپنے جذبات کی پیروی نہ کرو اور (اگر تم نے

ایسا کیا تو یہ چیز تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی) (یاد رکھو) جو لوگ اللہ کے راستے

سے بھٹک جاتے ہیں تو چونکہ وہ حساب (اور مکافاتِ عمل) کے دن کو بالکل بھول جاتے ہیں اس لئے ان کے واسطے (بہت ہی) سخت عذاب ہے۔

اس لئے آپ کے متعلق فرمایا کہ وہ صاحبِ قوت بھی تھے (اور استخلاف فی الارض قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں)۔ لیکن یہ قوت، قوتِ فرعونِی نہیں تھی، بلکہ اس عظیم الشان قوت و حکومت کے ساتھ ساتھ ان کی ہمہین نیازِ آستانہ ایزدی پر جھکی رہتی تھی۔ اِنَّهٗ اَدَّابٌ (۲۸/۱۷) وہ قانونِ خداوندی کے مطیع و منقاد تھے اور اس کے بدلے میں اللہ نے بڑے بڑے سرکش قبائل کو ان کا مطیع و فرماں بردار بنا رکھا تھا۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعُشِيِّ ۚ وَالطَّيْرُ  
مَحْشُورٌ ۚ كُلٌّ لَّهٗ اَدَّابٌ ۝ (۱۸-۳۸/۱۹)

بلاشبہ ہم نے پہاڑی قبائل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام اس کے ساتھ ”سبح“ کرتے تھے اور قبیلہ طیر کو جمع کر دیا تھا۔ سب کے سب اس کی طرف رجوع ہونے والے (مطیع و منقاد) تھے۔

اس آیت میں الجبال کے معنی پہاڑی قبائل بھی ہو سکتے ہیں اور الطیر کے معنی قبیلہ کے منتسب خانہ بدوش افراد جن سے شاہی رسالے (گھوڑوں کے رسالے) مرتب ہوتے تھے۔ تسبیح کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مطلب، تسبیح کے دانے گننا نہیں ہوتا بلکہ فرائضِ مفوضہ کی سرانجام دہی ہیں پوری پوری قوتوں سے سرگرم عمل رہنا ہے۔ لہذا اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ بڑے بڑے سرکش پہاڑی قبائل حضرت داؤد کے تابع فرمان تھے جو ان کے ساتھ، ان کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں دن رات سرگرم عمل رہتے تھے۔ نیز خانہ بدوش قبیلہ طیر کے افراد کو بھی اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ان پر حضرت داؤد کے گھوڑوں کے رسالے مشتمل تھے۔ نیز دھاتوں سے اسلحہ سازی کا کام لیا جاتا تھا۔ (۱۱-۳۴/۱۰) یہی ایک مردِ مومن کی خصوصیت ہے کہ یہ جب اس کا ہو جاتا ہے جس کی ساری دنیا ہے تو پھر ساری دنیا اس کی ہو جاتی ہے۔ یہ اس کے حضور جھکا ہوا اور ساری دنیا اس کے حضور جھکی ہوئی۔ سورہ انبیاء میں ہے۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فَاعِلِينَ ۝  
وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لَمُحْصِنَكُمْ مِنْ بَاسِكُمْ ۖ

فَقُلْ أَنْتُمْ شَاكِرُونَ ۝ (۴۹-۲۱/۸۰)

اور ہم نے داؤد کے لئے پہاڑی قبائل کو مستحضر کر دیا تھا کہ وہ تمام امور کو سرانجام دیتے اور اسی طرح قبیلہ طبر کو بھی اور ہم ایسا ہی کرنے والے تھے (مزید برآں) ہم نے اسے تمہارے لئے زرہ بکتر بنایا سکھایا کہ وہ تمہیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے تو کیا تم (ہماری نوازشات کے ہشکر گزار نہیں ہوتے۔

قرآن کریم نے حضرت داؤدؑ کے کوائف حیات کی تفصیل نہیں دی۔ البتہ ان کے ایک فیصلے کا ذکر خصوصیت سے فرمایا ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَدَاوُدَ وَ سُلَيْمَنَ إِذْ يَخُصِمَنِ فِي الْحَرْثِ إِذْ لَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ۝ فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَنَ ۚ وَ كُنَّا آتِينَا حُكْمًا وَ عِلْمًا ۚ (۴۸-۲۱/۴۹)

اور داؤد اور سلیمان (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب انھوں نے ایک کھیت کے معاملہ میں کہ لوگوں کی بکریاں اس میں منتشر ہو گئی تھیں فیصلہ کیا تھا اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے۔ پس ہم نے سلیمان کو اس بات کی پوری سمجھ دے دی اور ہم نے فیصلہ کرنے کا منصب (اور ذہن) کا علم، ان میں سے ہر ایک کو عطا فرمایا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا مقدمہ پیش آیا تھا جس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں نے فیصلہ دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کے فیصلے کو زیادہ صائب قرار دیا۔ سورۃ ص میں بھی ایک تنازعہ کا ذکر ہے۔ اس کا ذکر سورۃ ص کی آیات ۲۱ تا ۲۵ میں آیا ہے۔ یہ واقعہ اتنا اہم اور اس میں جو حقیقت پوشیدہ ہے وہ ایسی عالمگیر ہے کہ ہم ان آیات کا مفہوم — مفہوم القرآن سے نقل کرتے ہیں جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ (آپ کا جی چاہے تو آپ قرآن کریم کھول کر سامنے رکھ لیں اور متعلقہ آیات کو دہاں دیکھ کر، اس مفہوم کو سمجھتے جائیں) مفہوم یہ ہے۔

(اُس کی قوم بڑی جاہل اور وحشی تھی — ایسی جاہل کہ عام آداب معاشرت تک سے بھی واقف نہیں تھی۔ وہ اپنے معاملات اُس کے سامنے پیش کرنے کے لئے آتے تو نہ وقت دیکھتے نہ راستہ۔ جب اور جدھر سے جی چاہا آگھستے۔ وہ اس پر بھی برا فروخت نہ ہوتا اور اُن سے مُنہ نہ موڑتا، بلکہ نہایت سکون و



ثبات سے ان کی اصلاح کی فکر کرتا رہتا۔ ایک مصلح کا یہی انداز ہونا چاہیے (مثلاً) ایک دفعہ وہ اپنے گھر کے اندر کسی کام میں مصروف تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو آدمی، دیوار پھاند کر اندر گھس آئے ہیں۔

وہ گھبرا گیا کہ نہ معلوم ان کی نیت کیا ہے جو یہ اس طرح دیوار پھاند کر اچانک اس کے مکان کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم ایک مقدمہ کے دو فریق ہیں۔ ہم میں باہمی جھگڑا ہو گیا ہے اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتا ہے۔ سو ہم میں حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے دیکھنا! تم نا انصافی نہ کرنا۔ ہمیں عدل و انصاف کی راہ پر لگا دینا۔

دو کوئی اور ہوتا تو انہیں ڈانٹ کر باہر نکال دیتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ انہوں نے بر بنائے جہالت ایسا کیا ہے۔ اس لئے اس نے انہیں آرام سے سمجھایا اور پھر کہا کہ اچھا! اب تم اپنا واقعہ بیان کرو۔ اس پر مستغیث نے کہا کہ (سو سنو)۔ یہ میرا بھائی ہے۔ (اب دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر مجھ سے برتاؤ کیا کرتا ہے؟) اس کے پاس ننانوے (۹۹) دنبیاں ہیں۔ اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ (اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے) مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دے دے۔ (چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر، اس لئے) باتوں میں مجھے دبا لیتا، (اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں) — یہ ہے میرے اس بھائی کا رویہ! اب بتاؤ کہ اس کا یہ مطالبہ جائز ہے یا ناجائز۔

داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ کہ اپنی ننانوے دنبیوں کو سونالے اور تیرے پاس ایک دنبی بھی درپنہ دے، سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے یا باہمی شرکت سے کاروبار کرتے ہیں، تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کچھ وہ لوگ نہیں کرتے جو قوامین خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

(داؤدؑ نے جب اس معاملہ کی گہرائی پر غور کیا تو یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آگئی کہ معاملہ صرف ان دنبیوں کا نہیں۔ یہ اُس غلط معاشی نظام کا سوال ہے جس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور دن بدن، معاشرہ کے ان دو طبقوں میں بُعد زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے چنانچہ اس نے محسوس کیا کہ یہ اُس کا فریضہ ہے کہ اس غلط معاشی نظام کو

صحیح خطوط پر متشکل کرے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے رب سے سامانِ حفاظت طلب کیا۔ ایسی بلند ہمت جس سے وہ تمام مخالفتوں کا مقابلہ کر سکے۔ اور اس نے تہمتہ کر لیا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی اصلاح کر کے رہے گا۔

ہم نے اُس کے لئے سامانِ حفاظت بہم پہنچا دیا۔ وہ ہر معاملہ میں ہمارے قوانین سے قریب تر رہتا تھا اس لئے اس کے تمام معاملات کا مال نہایت حسین اور خوشگوار ہوتا تھا۔

چنانچہ ہم نے اس سے کہہ دیا کہ (تم بالکل اطمینان اور بے خوفی سے معاشرہ کی اصلاح کرو)۔ ہم نے تمہیں ملک میں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کرو یعنی قوانینِ خداوندی کی رُو سے، عدل و انصاف کے مطابق۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کا اتباع (اور رعایت) مت کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں صحیح راستے سے بہکا دیں گے۔ یاد رکھو! لوگ صحیح راستے سے اس لئے بہک جاتے ہیں کہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کو فراموش یا نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ سخت تباہی ہوتا ہے۔

**افسانہ طے کر ازیاں** | قرآن کریم میں فقط اتنا ہی ہے اور بات بالکل واضح ہے لیکن تورات اٹھا کر دیکھئے کہ اس میں اس قدر افسانہ طرازی سے کام لیا گیا ہے اور خدا کے اس مقدس رسول کی شانِ اطہر کی طرف ایسی خرافات منسوب کی گئی ہیں جن کے تصور سے انسانیت کا جگر کانپ اُٹھے۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ اس لغویت کو یہاں نقل کیا جاتا لیکن آسمانی کتاب انسانی تحریف و الحاق کے تقابل کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ اس لئے طوعاً و کرہاً اسے درج کیا جاتا ہے۔ تورات (سموئیل کی کتاب، حصہ دوم، باب ۱۱) میں لکھا ہے۔

اور ایک دن شام کو ایسا ہوا کہ داؤد اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور بادشاہی محل کی چھت پر ٹپلنے لگا اور وہاں سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو ہنار ہی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے اس عورت کا حال دریافت کرنے کو آدمی بھیجے۔ انہوں نے کہا، کیا وہ انعام کی بیٹی بت سبھ جو حتیٰ اور یا کی جو رو ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کے اس عورت کو بلالیا۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آئی اور وہ اس سے ہم بستر ہوا۔ کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک

ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اس نے داؤد پاس خبر بھیجی کہ

میں حاملہ ہوں۔ (سموئیل ۲، باب ۱۱، آیات ۲-۵)

معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ یہ سب کچھ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کے متعلق، ”آسمانی کتاب“ میں درج ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ (حضرت) داؤدؑ نے (خاکم بدین) ایک مکروہ چال سے اس عورت کے خاوند کو جنگ میں بھجوا دیا اور خاص خفیہ ہدایات کے ماتحت اسے ایسے مقام پر رکھا جہاں سے وہ بچ کر نہ آ سکے چنانچہ وہ جنگ میں مارا گیا اور یوں (حضرت) داؤد علیہ السلام اس عورت کو اپنے گھر لے آئے۔ اس کے بعد باب نمبر ۲ میں مذکور ہے۔

اور خداوند نے ناتن کو داؤد کے پاس بھیجا۔ اس نے اس کے پاس آ کے اس سے کہا، ایک شہر میں دو شخص تھے، ایک تو دولت مند اور دوسرا کنگال۔ اس مالدار پاس بہت بے شمار بھیر، بکری اور گائے بیل کے گلے تھے، پر اس کنگال پاس بھیڑ کی اس پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے مول لیا تھا اور پالا تھا اور وہ اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ بڑھی تھی اور اس کے پیالے سے پیتی تھی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کی بیٹی کی جگہ تھی۔ اور ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مسافر دولت مند پاس آیا۔ سو اس نے اپنے گائے بیل اور بھیڑ بکری کو بچا رکھا اور اس مسافر کے لئے جو اس پاس آیا تھا نہیں پکایا۔ بلکہ اس کنگال کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لئے جو اس پاس آیا تھا پکا ڈالی۔ تب داؤد کا غصہ اس شخص پر بہ شدت بھڑکا اور اس نے ناتن کو کہا زندہ خداوند کی قسم کہ وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے۔ سو وہ شخص چو گئی پٹھیا اسے پھیر دے، کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور کچھ رحم نہ کیا۔

تب ناتن نے داؤد کو کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے۔ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا ہے کہ میں نے تجھے مسح کیا تاکہ اسرائیلیوں پر سلطنت کرے۔ اور میں نے تجھے ساؤل کے ہاتھ سے چھڑایا اور میں نے تیرے آقا کا گھر تجھے دیا اور تیرے آقا کی جو روؤں کو تیری گود میں دیا اور اسرائیل کو یہوداہ کا گھر نہ تجھ کو دیا اور اگر یہ سب کچھ تھوڑا تھا تو میں تجھ کو فلانی فلانی چیز بھی دیتا۔ سو تو نے کیوں خداوند کے حکم کی تخفیر کر کے اس کے آگے بدی کی؟ کہ تو نے حتیٰ اور یا کو تیغ سے قتل کروایا

اور اسکی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اسکو بنی عمون کی تلوار سے مردا ڈالا سوا بتیرے گھر سے تلوار بھی جاتی نہ رہیگی کہ تو نے مجھے حقیر کیا اور حتیٰ اور باکی جو رو کو لے کے اپنی جو رو کیا۔ (متن ۱۲۱۔ ۱۲۲) یہ تو رہا حضرت داؤدؑ کے متعلق۔ اسی کتاب میں آپ کے ایک بیٹے کا حسبِ ذیل قصہ لکھا ہے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ داؤدؑ کے بیٹے ابی سلوم کی ایک خوبصورت بہن تھی جس کا نام تتر تھا۔ اس پر داؤدؑ کا بیٹا امنون عاشق ہوا۔ اور امنون ایسا بے چین ہوا کہ اپنی بہن تتر کے لئے بیمار پڑا کیونکہ وہ کنواری تھی۔ سو امنون نے اس سے کچھ کرنا اپنے لئے دشوار جانا اور داؤدؑ کے بھائی سمو کا بیٹا یوندب، امنون کا دوست تھا اور یوندب بڑا اہل شخص تھا۔ سو اس نے اس سے کہا کہ تو بادشاہ کا بیٹا ہو کے کیوں دن بدن دُبلتا جاتا ہے؟ کیا تو مجھے خبر کرے گا؟ تب امنون نے اس سے کہا کہ میں اپنے بھائی ابی سلوم کی بہن تتر پر عاشق ہوں۔ سو یوندب نے اس سے کہا کہ تو بستر پر پڑا رہ اور اپنے تئیں بیمار رہنا اور جب تیرا باپ تجھے دیکھئے آئے، تو تو اسے کہہ کہ میری بہن تتر کو پر دانی دیکھئے کہ آئے اور مجھے بھی کھلائے پلائے اور میرے سامنے کھانا پکائے تاکہ میں دیکھوں اور اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔

تب امنون پڑا رہا اور اپنے تئیں بیمار بنایا اور جب بادشاہ اس کے دیکھنے کو آیا تو امنون نے بادشاہ سے کہا کہ میری بہن تتر کو آئے دیکھئے کہ وہ میرے سامنے دو پھلکے پکائے، تاکہ میں اس کے ہاتھ سے کھاؤں۔ سو داؤدؑ نے تتر کے گھر کھلا بھیجا کہ تو بھی اپنے بھائی امنون کے گھر جا اور اس کے لئے کھانا پکا۔ سو تتر اپنے بھائی امنون کے گھر گئی اور وہ بستر پر پڑا ہوا تھا اور اس نے آٹا لیا اور گوندھا اور اس کے لئے پھلکے پکائے اور انہیں لیسکر ایک قاب میں دھرا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کھانے سے انکار کیا۔ تب امنون نے کہا، سب مرد میرے پاس سے نکل جائیں اور ہر ایک اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ تب امنون نے تتر سے کہا کہ کھانا کوٹھری کے اندر لا تاکہ میں تیرے ہاتھ سے کھاؤں۔ سو تتر نے وہ پھلکے جو پکائے تھے، لئے اور کوٹھری میں اپنے بھائی کے پاس لائی اور جب وہ کھانا اس کے سامنے لائی کہ اُسے کھلائے تو اس نے اسے پکڑا اور اس سے کہا کہ اے میری بہن! مجھ سے ہم بستر ہو۔ وہ بولی نہیں میرے بھتیجا! مجھے رسوا نہ کر کہ اسرائیلیوں میں ایسا کرنا اچھا

نہیں۔ سو تو ایسی اتھی نہ کر۔ اور میں کیا کروں گی کہ میری رسوائی رفع ہو اور تو بھی اسرائیلیوں کے  
 احمقوں میں سے ایک کی مانند ہوگا۔ پس اب بادشاہ سے کہئے سو وہ مجھے تجھ سے منع نہ کرے گا۔  
 لیکن اس نے اس کی بات نہ مانی کہ وہ اس سے زور آور تھا، سو اس سے زبردستی کی اور اس سے  
 ہم بستر ہوا۔ (سموئیل ۲، ۱-۱۳/۱۵)

غور فرمائیے! یہ ایک خانوادہ نبوت کا ذکر ہو رہا ہے! استغفر اللہ۔ اور ذکر کس کتاب میں ہو رہا ہے تورات  
 مقدس میں! یعنی اس کتاب میں جسے آسمانی کتاب کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی تورات میں حضرت داؤدؑ  
 کے بڑھاپے کا ایک واقعہ یوں لکھا ہے۔

اور داؤد بادشاہ بوڑھا ہوا کہن سال ہوا اور وہ اس پر کپڑے اڑھاتے تھے پردہ گرم نہ ہوتا  
 تھا۔ سو اس کے خادموں نے اس سے کہا کہ ہمارے خداوند بادشاہ کے لئے ایک کنواری  
 عورت ڈھونڈی جائے جو کہ بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اس کی خبر گیری کیا کرے۔  
 اور اس کی گود میں سو رہا کرے، تاکہ ہمارا بادشاہ خداوند گرم ہو۔ چنانچہ انہوں نے اسرائیل  
 کی ساری مملکت میں ایک نوجوان خوش شکل عورت کی تلاش کی اور شونیت ابیشال  
 کو لایا۔ سو اسے بادشاہ پاس لائے اور وہ جوان عورت بہت شکیل تھی۔ سو وہ بادشاہ کی  
 خبر گیری اور اس کی خدمت کرتی تھی۔ لیکن بادشاہ نے اس سے صحبت نہ کی۔

(سلاطین ۱، ۴-۱۱)

ہماری کتب تفسیر | ایسی کتاب میں اگر حضرت داؤدؑ کے متعلق اور یا کی بیوی کا قصہ بھی درج ہے  
 تو کیا تعجب؟ لیکن افسوس ہے کہ ہمارا مذہبی لٹریچر اس قسم کی لغویات سے  
 متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معالم التنزیل تفسیر کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں ایک دلچسپ تہیہ کے  
 بعد اسی حیا سوز واقعہ کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے اس عورت کو باغ میں حوض کے کنارے ہناتے ہوئے دیکھا۔ داؤدؑ  
 کو اس کا حسن بہت پسند آیا اور بہت دیر تک اس کو دیکھتے رہے۔ اتنے میں اس  
 عورت نے ان کا سایہ دیکھ لیا اور اپنے بال بکھر لئے اور اپنے بدن کو ڈھانپ لیا۔ اس  
 سے ان کا شوق اور بڑھا۔

اس کے بعد اس تدبیر کا ذکر ہے جس کی رو سے حضرت داؤدؑ نے اس عورت کے خاوند کو اپنے بھانجے کی مدد سے میدان جنگ میں قتل کرادیا اور پھر اس عورت سے نکاح کر لیا اور اس عورت کے بدن سے حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے۔ (استغفر اللہ) لیکن صاحبِ معالم التنزیل نے یہ افسانہ محض اپنے قیاس سے نہیں بلکہ ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس میں مذکور ہے۔

”انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے فرماتے تھے کہ جب داؤدؑ نبی نے اس عورت کی طرف دیکھا تو بنی اسرائیل پر اس نے ایک لشکر تیار کیا اور پے سالار کو حکم دیا کہ جب دشمن کا سامنا ہو تو فلاں آدمی کو تابوت کے آگے مقرر کر دینا۔ اور اس زمانے میں تابوت کے ساتھ نصرت طلب کی جاتی تھی۔ جو شخص تابوت کے آگے چلتا تھا نہیں لوٹتا تھا۔ حتیٰ کہ قتل کیا جاتا یا لشکر سے بھاگ جاتا۔ پس اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا اور دو فرشتے نازل ہوئے جو اس کے سامنے اس کا قصہ بیان کرتے تھے۔ پس داؤدؑ سمجھ گیا اور سجدے میں گر پڑا اور چالیس رات تک سجدے میں پڑا رہا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں سے ہنری اگ کر اس کے سر سے گزر گئی..... الخ

حیرت ہے کہ ان بزرگوں کو یہ کچھ لکھتے وقت اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ خرافات کس ہستی کے متعلق لکھی جا رہی ہیں اور کس ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں؟ یہ انسانیت سوز چیزیں ہمارے ہاں کس طرح گھس آئیں؟ یہ بادیِ تمیق ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ ان کی مقدس کتاب میں اس قسم کے نوافسانے مذکور ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی کتاب کو کسی طرح بھی مسلمانوں کے سامنے نہیں لاسکتے تھے اس لئے انہوں نے یہ کوشش کی کہ یہی چیزیں خود مسلمانوں کے ہاں رائج کر دی جائیں۔ اس کے لئے آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک روایت وضع کر کے اُسے (پناہ بخدا) ذاتِ رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ جب کوئی بات حضورؐ کی طرف منسوب ہو گئی تو پھر اس کے ”حدیث“ ہونے میں کیا شبہ رہا۔ لہذا یہی روایات ہماری کتبِ تفاسیر کی اساس بن گئیں اور یوں اسلام جیسا اورانی دین اپنے مقام سے اتر کر کتبِ یہود و نصاریٰ کی سطح پر آگیا۔ اب یہود و نصاریٰ کو کون الزام دے، جب خود مسلمانوں کے اپنے ہاں بھی ایسا ہی کچھ موجود ہوا دیکھتے بات کتنی واضح ہے لیکن بایں ہمہ اگر آج کوئی شخص ان روایات کے صحیح ہونے سے اس بنا پر انکار کر دے کہ حضورؐ کی شانِ اقدس سے بعید ہے کہ وہ دیگر انبیاء کرام کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب

فرماتے تو آپ کی پوری دنیا کے مذہب اپنی انتہائی قوت و شدت سے اس کے خلاف مجاذہ جنگ قائم کر لیتی ہے اور نہیں سوچتی کہ یہ حمایت کس بات کی ہو رہی ہے! لیکن الحمد للہ کہ قرآن کا نورانی دامن اس قسم کے سیاہ دھبوں سے پاک اور صاف ہے اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود ذات باری تعالیٰ نے لیا ہے، اس لئے اس میں اس قسم کے خرافات باریابی نہیں پاسکتے۔ اس لئے ہم نہایت جرأت سے قرآن پیش کر سکتے ہیں کہ یہی اس آسمان کے نیچے خدا کی محفوظ و مصون کتاب ہے، باطل جس کے نزدیک نہیں چھوسکا۔

حضرت داؤدؑ کا ضمنی ذکر آیات (۲۵۱: ۲/۸۵) میں بھی آیا ہے۔

**تورات کا ایک اور قصہ** | شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ تورات کریم میں فقط اتنا ہی آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں سے تھے لیکن تورات نے آپ کا پورا نسب نامہ بھی دیا ہے جس کی رو سے آپ حضرت یوسفؑ کی اولاد میں سے نہیں بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے یہودا کی اولاد ہیں۔ تورات میں حضرت سلیمانؑ کی والدہ (یعنی اویا کی بیوی) کا جو قصہ مذکور ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں لیکن یہودا کی نسل جس میں حضرت داؤدؑ علیہ السلام بھی شامل ہیں کس طرح آگے بڑھی تھی، یہ قصہ اس سے بھی زیادہ شہ مناک ہے۔ کتاب پیدائش میں مذکور ہے۔

اور یہودا اپنے بوٹھے بیٹے یحییٰ کے لئے ایک عورت بیاہ لایا جس کا نام تھر تھا اور غیر یہودا کا پلوٹھا خداوند کی نگاہ میں شریر تھا۔ سو خداوند نے اسے مار ڈالا۔ تب یہودا نے اوتان کو کہا کہ اپنے بھائی کی جورو کے پاس جا اپنی بھانجی کا حق ادا کر اور اپنے بھائی کے لئے نسل چلا، لیکن اوتان نے جانا کہ یہ نسل میری نہ کہلائے گی اور یوں ہوا کہ جب وہ اپنے بھائی کی جورو کے پاس جاتا تھا تو لطفے کو زمین پر ضائع کرتا تھا، تاہم وہ کہ اس کا بھائی اس سے نسل پائے اور اس کا یہ کام خداوند کی نظر میں بہت بُرا تھا۔ اس لئے اس نے اسے بھی ہلاک کیا۔ تب یہودا نے اپنی بہوتر کو کہا کہ اپنے باپ کے گھر میں بیوہ بیٹھی رہو جب تک کہ میرا بیٹا سہیلہ بڑا ہو۔ کیونکہ اس نے کہا کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح مر جائے۔ سو تم اپنے

باپ کے گھر میں جا رہی۔ اور بہت دن گزرے کہ سوع کی بیٹی یہوداہ کی جو درمگنی اور جب یہوداہ کو اس کا غم بھولا تو وہ اپنی بھیڑوں کی پشیم کترنے والوں کے پاس تمننت میں اپنے دوست اور لامی تیرہ کے ساتھ گیا اور ترسے یہ کہہ گیا کہ دیکھ تیرا سر اپنی بھیڑوں کی پشیم کترنے والوں کے لئے تمننت کو جاتا ہے۔ تب اس نے اپنی بیوی کے کپڑوں کو اتار پھینکا اور برقع اوڑھا اور اپنے کو لپیٹا اور عینیم کے مدخل میں جو تمننت کے راستے پر ہے جا بیٹھی، کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ سیلہ بڑا ہوا اور مجھے اس کی جو رو نہیں کر دیا ہے۔ یہوداہ اسے دیکھ کر سمجھا کہ کوئی کسی ہے کیونکہ وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے تھی اور وہ راہ سے اس کی طرف کو پھرا اور کہا کہ چلے مجھے اپنے ساتھ خلوت کرنے دیجئے، کہ اس نے نہ جانا کہ یہ میری بہو ہے۔ اس نے کہا کہ تو جو میرے ساتھ خلوت کرے گا مجھے کیا دے گا؟ وہ بولا میں گلے میں سے بحری کا ایک بچہ بھیجوں گا۔ اس نے کہا کہ تو مجھے جب تک اُسے بھیجے، کچھ گرد دے گا؟ وہ بولا کہ میں کیا گرد تجھے دوں؟ وہ بولی اپنی چھاپ اور اپنا بازو بند اور اپنی لائٹی جو تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس نے دیا اور اس کے ساتھ خلوت کی اور وہ اس سے حاملہ ہوئی۔ پھر وہ اٹھی اور چلی گئی اور برقع اتار رکھا اور رنڈاپے کا جوڑا پہن لیا اور یہوداہ نے اپنے دوست اور لامی کے ہاتھ بحری کا بچہ بھیجا تاکہ اس عورت کے ہاتھ اپنا گرد پھیر لائے پر اس کو نہ پایا۔ تب اس نے اس جگہ کے لوگوں سے پوچھا کہ وہ بیسوا جو عینیم میں راستے پر نظر آتی تھی کہاں ہے؟ وہ بولے کہ یہاں کوئی کسی تھی تب وہ یہوداہ کے پاس پھر آیا اور کہا کہ میں اسے نہیں پاسکتا ہوں اور وہاں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ کسی وہاں پر نہ تھی۔ یہوداہ بولا کہ خیر وہی لے نہ ہو کہ ہم بدنام ہوں؟ کچھ میں نے تو بحری کا بچہ بھیجا پر تو نے اسے نہ پایا۔

اور یوں ہوا کہ قریب تین مہینے کے بعد یہوداہ سے کہا گیا کہ تیری بہو قمر نے زنا کیا اور دیکھ اُسے چھالے کا حمل بھی ہے۔ یہوداہ بولا کہ اسے باہر لاؤ کہ وہ جلانی جائے۔ جب وہ نکالی گئی اُس نے اپنے سر کو کھلا بھیجا کہ مجھے اس شخص کا حمل ہے جس کی یہ چیزیں ہیں اور کہا دریافت کیجئے یہ چھاپ اور بازو بند اور یہ عصا کس کا ہے؟ تب یہوداہ نے اقرار کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ صادق ہے، کیونکہ میں نے اُسے اپنے بیٹے سیلہ کو نہ دیا۔



لیکن وہ پھر اس سے ہمبستر نہ ہوا۔

اور اس کے جننے کے وقت میں یوں ہوا کہ اس کے پیٹ میں تو ام تھیں اور جب وہ جننے لگی تو ایک بچے کا ہاتھ نکلا اور دائی چنائی نے پکڑ کر اس کے ہاتھ میں نارابا ندھ کر کہا کہ یہ پہلے نکلا۔ اور یوں ہوا کہ اس نے اپنا ہاتھ پھر کھینچ لیا اور کیا دیکھتی ہے کہ وہیں اس کا بھائی نکل آیا اور وہ بولی تو کیا ہی پھاڑتا ہے؟ یہ پھاڑتھہراؤے گی۔ سو اس کا نام فارص رکھا گیا۔ بعد اس کے اس کا بھائی جس کے ہاتھ میں نارابا ندھا تھا نکل آیا اور اس کا نام زارح رکھا گیا۔ (پیدائش ۶ - ۳۸/۳۰)

یہی فارص یا فرص ہے جس کی اولاد میں حضرت داؤد بتائے گئے ہیں۔ اور حضرت داؤدؑ ہی کیا، حضرت مریمؑ کے شوہر (یوسف) بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ چنانچہ انجیل متی کے پہلے باب میں یہ تمام سلسلہ نسب موجود ہے۔

غور فرمائیے کہ آج جن کتابوں کو آسمانی اور الہامی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ کن خرافات کا مسخ بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن انسان کی مسخ شدہ فطرت (یا یوں کہیے کہ جذباتِ عقیدت و تعصب کی دوا دیکھئے کہ اس کے باوجود ایک دنیا ہے کہ انہیں آسمانی تصور کئے جا رہی ہے اور حقیقت (قرآنی حقائق) کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔



# حضرت سلیمان علیہ السلام

## (۹۵۰ ق.م)

حضرت داؤدؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے۔  
 وَوَرِثَ سُلَيْمَنُ دَاوُدَ ۖ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَنَظِقَ الطَّيْرِ وَ  
 أَوْثِقْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۖ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ۝ (۲۷/۱۴)  
 اور (دیکھو) سلیمان داؤد کا وارث ہوا اور کہنے لگا ”لوگو! ہمیں منطق الطیر سکھایا گیا ہے اور ہر چیز  
 عطا کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ تو خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔

اس آیت میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ باپ (حضرت داؤدؑ) کے بعد بیٹے (حضرت سلیمانؑ) کی جانشینی  
 کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں انداز حکمرانی موجودہ زمانے سے مختلف تھا۔ اس وقت کی قبائلی سی زندگی میں،  
 رئیس قبیلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی زندگی جب ذرا اور وسیع ہو جاتی تھی تو قومی زندگی بن جاتی تھی  
 جس میں پھر سردار قوم کو بڑی اہمیت حاصل رہتی تھی۔ بنی اسرائیل میں بھی اس زمانے میں یہی قومی انداز  
 زندگی مروج تھا۔ باقی رہی نبوت، سو اس میں کسی قسم کے نسبی تعلق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ خالص عہد  
 خداوندی تھا جو اس قلب کو عطا ہوتا تھا جو اس کے لئے خاص طور پر چنا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت  
 مسلسل چلا آ رہا تھا۔ یہ مشیت خداوندی کے پروگرام کے مطابق تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ منطق الطیر کے معنی ”پرندوں کی بولی“ نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں

طیر سے مراد گھوڑوں کا لشکر ہے (جو حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے زمانہ میں بیشتر قبیلہ طیر کے افراد پر مشتمل تھا) اور منطق کے معنی اس لشکر کے قواعد و ضوابط ہیں۔ لہذا اس سے مطلب ہے گھوڑوں کے رسالہ کے متعلق علم یہ اُس زمانہ میں بہت بڑی چیز تھی۔

حضرت سلیمانؑ خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کی بارگاہِ صمدیت کے حضور جھکنے والے تھے۔  
 وَ هَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَدَّابٌ ۝ (۳۸/۳۱)  
 اور (دیکھو) ہم نے داؤد کو سلیمان (سابیٹا) عطا کیا۔ وہ کیسا اچھا بندہ تھا۔ بلاشبہ وہ خدا کی طرف بہت ہی رجوع ہونے والا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و حکمت سے نوازا تھا۔  
 وَ كَلَّا اتَيْنَا حُكْمًا وَ عِلْمًا ۚ وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحُونَ  
 وَ الطَّيْرَ ۚ وَ كُنَّا فَعِيلِينَ ۝ (۲۱/۴۹) نیز (۲۴/۱۵۱)  
 اور ہم نے حکم دینے کا منصب اور (نبوت کا) علم ان میں سے ہر ایک کو عطا فرمایا تھا۔ نیز ہم نے پہاڑی قبائل کو داؤد کے لئے مسخر کر دیا تھا جو اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے اور اس طرح قبیلہ طیر کے افراد کو بھی اور ہم ایسا ہی کرنے والے تھے۔

حضرت سلیمانؑ کی قوتِ فیصلہ کے متعلق سابقہ عنوان (حضرت داؤدؑ) میں ذکر آچکا ہے۔ آپ کی عمر حکومت میں بنی اسرائیل کی جاہ و حشمت اور عروج و اقبال اپنے نقطہ کمال پر تھا۔ بڑی بڑی سرکش قویم (شیاطین و جنات) آپ کے تابع فرمان تھیں۔ عظیم القدر شہنشاہ، خراج و تحائف پیش کرنے کے لئے آپ کی بارگاہِ جلالت و سطوت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ خشکی پر ان کے جنود و عساکر مسلط تھے۔ سمندروں میں ان کے جہاز بازو (بادبان) پھیلانے اڑے چلے جاتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے سنگین قلعے تعمیر کرائے۔ یورشلیم کا مقدس ہیکل معرض وجود میں آیا۔ گھوڑوں کے رسالے کی مدد سے ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا۔ غرضیکہ شاہِ ادبی و شگفتگی، مرقہ الحالی، جاہ و جلال، جبروت و سطوت پوری بہار پر تھی۔  
 (دیکھئے ۲۱/۸۱، ۳۴/۱۲، ۳۸/۳۶)۔

سورہ ص میں ہے،

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً

حَدَّثَنَا آصَابُ ۞ (۳۸/۳۶)

چنانچہ ہم نے اس کے لئے (سمندر کی تند) ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم کے مطابق جہاں وہ جانا چاہتا تھا، نرمی سے چلتی تھیں۔

جب تک دغانی جہازوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی کشتیوں کے چلانے میں ہوائیں سب سے بڑی قوت تھیں۔ جہاں تک تاریخ شاہد ہے حضرت سلیمانؑ نے پہلے پہل بادِ بالوں سے ہواؤں کو مسخر کیا۔ نقشے میں دیکھئے۔ فلسطین کے شمال و مغرب میں بحرِ متوسط اور جنوب کی طرف بحرِ احمر واقع ہے۔ ان دونوں سمندروں میں مخالف سمت کی ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن سے دور دراز کے ملکوں کا سامان فلسطین تک پہنچتا ہے اور یوں دنیا بھر کی برکت اس "ارضِ مقدس" میں جمع ہو جاتی ہے۔ تو رات میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بڑا زبردست تھا۔

پھر سلیمانؑ بادشاہ نے حصیوں، جہازوں کے نزدیک ہے دریائے قلزم کے کنارے پر جو اودوم کی سرزمین میں ہے جہازوں کی بحرِ بنائی اور ہر آم نے اس بحر میں اپنے چاکر ملاح جو سمندر کے حال سے آگاہ تھے سلیمانؑ کے چاکروں کے ساتھ کر کے بھجوائے اور وہ اوقیر کو گئے اور وہاں سے چار سو بیس قنطار سونا لے کے سلیمانؑ بادشاہ کے پاس آئے۔

(سلاطین ۲۶-۲۸/۹)

**شیاطین و جناتِ سلیمانی** | پھر بڑی بڑی سرکش قوئیں اور وحشی قبائل آپ کے زیرِ تسخیر تھے جن سے مختلف نوعیتوں کا کام لیا جاتا تھا۔

وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ وَ يَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ  
وَكُنَّا لَهُمْ حَفِظِينَ ۞ (۲۱/۸۲)

اور سرکش لوگوں میں سے ایسے جو سلیمانؑ کی خاطر (سمندروں میں) غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔

(نیز دیکھئے ۱۲-۱۳/۳۴ ذ ۳۴-۳۸/۴۰)

جیسا کہ "البیس و آدم" میں "جنات" کے عنوان میں بیان کیا چکا ہے، حضرت سلیمانؑ کے عہد کے جنات سے مراد وہ وحشی اور خانہ بدوش قبائل ہیں جو شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل بتے تھے حضرت سلیمانؑ

نے ان قبائل کو اکٹھا کیا اور ان سے ہیکل کی تعمیر میں مزدوروں کا کام لیا۔ چنانچہ توریت میں ہے۔  
اور یہی باعث ہے جس سے سلیمان بادشاہ نے لوگوں کی بیگاری کہ خداوند کا گھر اور اپنا قصر اور منو  
اور یروشلم کی شہر بنایا اور صورت اور مجدہ اور جزر بھی بنا کرے۔ (سلاطین ۱۱ ۹/۱۵)  
ان بیگاریوں کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

اور سلیمان نے ارادہ کیا کہ خداوند کے نام کے لئے ایک گھر اور اپنی سلطنت کے لئے ایک  
گھر بنائے۔ اور سلیمان نے ستر ہزار بار برداروں اور پہاڑ میں اسی ہزار پتھر توڑنے والوں کو بھیرایا  
اور تین ہزار چھ سو آدمی کہ ان سے کام لیں۔ (تواریخ ۲ ۲/۲-۱)  
یہ مزدور اسرائیلی نہ تھے بلکہ ان سے غیر تھے۔

اور سلیمان نے اسرائیل کے ملک میں کے سارے پردیسیوں کو گنوا یا، بعد اس کے  
گننے کے جو اس کے باپ داؤد نے گنوا یا تھا اور وہ ایک لاکھ تریپن ہزار چھ سو بھیرے ہوئے  
اس نے ان میں سے ستر ہزار کو بار برداری پر اور اسی ہزار کو پہاڑ کے پتھر توڑنے پر مقرر کیا  
اور ان پر تین ہزار چھ سو کوڑیئے بھیرائے کہ لوگوں سے کام لیں۔

(تواریخ ۲ ۱۷-۱۸/۲)

دوسری جگہ ہے۔

لیکن وہ ساری گردہ جو عتیوٹ اور امویوٹ اور فرڈیوٹ اور سوئیوٹ اور یہوئیوٹ سے باقی  
رہی، اور اسرائیلی نہ تھی، ہاں ان کی اولاد جو بعد ان کے زمین میں باقی رہی جنہیں بنی اسرائیل  
نے نابود نہیں کیا۔ سو سلیمان نے ان سے خراج کے بدلے کام لیا جیسا کہ آج کے دن ہوتا ہے،  
لیکن سلیمان نے اپنے کام کیلئے بنی اسرائیل میں سے کسی کو مزدور ہونے کے واسطے مقرر نہ  
کیا کہ وہ جنگی مرد اور اس کے لشکر کے سوار اور اس کی گاڑیوں اور اس کے سواروں کے  
بندوبست کرنے والے تھے۔ (تواریخ ۲ ۷-۸/۸)

ان تفصیل میں ”جناب سلیمانی“ کا مفہوم واضح ہو گیا ہو گا، یعنی وہ وحشی قبائل جو شہروں سے دور جنگلوں  
اور پہاڑوں میں نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔

آیات مذکورہ صدر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں صنعت و حرفت کتنی ترقی کر چکی تھی۔ ہر

یہ بھی کہ حضرت سلیمانؑ ان کاریگروں سے تماثل بھی بنواتے تھے۔ تماثل کا لفظ تصاویر اور مجسمات دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں مصوری (painting) یا مجسم سازی (sculpture) کا بھی رواج ہو چکا تھا۔

بحری بیڑے کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کا بری لشکر بھی بڑا عظیم الشان تھا جس میں کوہستانی عسکری قبائل اور مہذب آبادی کے افراد سب شامل تھے۔

وَحِشْرَ لَسُلَيْمَانَ جُنُودًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ  
يُؤْذِعُونَ ۝ (۲۴/۱۷)

اور (دیکھو) سلیمان کے لئے ہر قسم کے لشکر جمع کر دیئے تھے کیا از قسم وحشی اور بڑی قبائل اور کیا از قسم متمدن اور حضری قبائل نیز گھوڑوں کے رسالے (کثرت تعداد کی وجہ سے اژدہا م ہو جائے) انہیں روکا جاتا (اور ضبط کے اندر رکھا جاتا) تھا۔

گھوڑوں کے متعلق سورہ ص میں ہے۔

إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّفِيفَتُ الْجَبَادُ ۖ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ  
حُبَّ الْخَيْرِ عَنِ ذِكْرِ رَبِّي ۖ حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۚ رُدُّوْهَا  
عَلَيَّ ۖ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ۝ (۳۸/۲۳-۲۱)

جب سلیمان کے سامنے شام کے وقت اسیل اور عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو سلیمان پکار اُٹھے (یا درکھو) میں نے ان کی محبت کو اس لئے پسند کیا ہے کہ یہ خدا کے کام کریں گے۔ حتیٰ کہ وہ آگے بڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ نے پھر اپنے ملازموں کو حکم دیا، ان گھوڑوں کو ذرا پھر میرے سامنے لاؤ۔ انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (محبت سے)

لے تو رات (سلاطین نمبر ۱) ۲۸-۱۵/۲۹ میں ہے:

اور سلیمان کے لئے مصر میں خاص قسم کے گھوڑے جمع ہوتے تھے اور بادشاہ کے سوداگران جمع ہوؤں کو مقررہ دام پر لیتے تھے۔ اور ایک گاڑی چھ سو منقال پر مصر سے نکلتی اور اوپر لائی جاتی تھی اور گھوڑا ڈیڑھ سو منقال پر اور اسی طرح حئیوں کے سارے بادشاہوں اور آراچی بادشاہوں کے لئے ان ہی کے ہاتھ سے نکال لاتے تھے۔

ہاتھ پھیرنے شروع کر دیئے اور انہیں سہلانے لگے۔

یہ شکر ایسا عظیم الشان تھا کہ جس خطہ ملک سے گزر جاتا وہاں کے لوگ خوف کے مارے ادھر ادھر چھپ جاتے۔ اس سلسلہ میں سورہ نمل میں جو تفصیل آتی ہے اسے ہم 'مفہوم القرآن' سے نقل کرتے ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔ سورہ نمل کی آیات (۱۹-۲۷) میں ہے۔

(ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلیمانؑ کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت اس کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ بطور حفظِ ماتقدم اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں وادی نمل پڑتی تھی۔ ملک سبا کی طرح اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی)۔ جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جا کر پناہ گزیں ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لشکر جرار اتنا معلوم کئے بغیر تم اس کے دشمن کی قوم سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہو یا نہیں، تمہیں یونہی کچل ڈالے۔ (فوجیں یہی کچھ کیا کرتی ہیں۔ ان کے راستے سے بہت جانا ہی قرینِ مصلحت ہوتا ہے)۔

سلیمانؑ نے یہ سنا تو مسکرایا (کہ یہ بے چارے سچے ہیں۔ انہوں نے یہی دیکھا اور سنا ہے کہ جب شاہی لشکر کہیں سے گزرتا ہے تو وہ اندھا دھند سبا ہی چائے چلا جاتا ہے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ کسی بادشاہ کا لشکر نہیں، خدا کے ایک رسول کی سپاہ ہے جس کا مقصد بے گناہوں کو ستانا نہیں ان کی خفیت کرنا ہے)۔ پھر اس نے اپنے خدا سے دعا مانگی کہ بارِ الہا! مجھے تو نے اس قدر عظیم مملکت عطا کی ہے۔ تو اس کے ساتھ ایسا ضبط اور اپنے آپ پر کنٹرول بھی عنایت فرما کہ میں تیری اس نعمتِ عظمیٰ کو جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر ارزاں فرمائی ہے اس طرح صرف کروں کہ یہ نوح ان کے لئے سبا ہی کا موجب بننے کے بجائے ان کے معاملات کو سنوارنے کا ذریعہ بنے اور میرا ہر قدم تیرے قوانین سے ہم آہنگ ہو۔ اس طرح میں تیرے قانونِ ربوبیت و مرحمت کی بنا پر تیرے ان بندوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤں جن کی صلاحیتیں نشو و نما پالیتی ہیں اور جن کے ہاتھوں انسانیت کے معاملات سنوتے ہیں۔

**قومِ سبا** پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت اتنی وسیع اور طاقتور تھی کہ اردگرد کے بادشاہ خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے قرآنِ کریم

میں ملکہ سبا (Sheba) کا ذکر آیا ہے۔ قوم سبا کا مسکن جنوبی عرب (مین کا مشرقی علاقہ) تھا اور ماریہ دار السلطنت۔ یہ اس زمانہ کی مہذب اور طاقت ور قوم تھی، تجارت میں بہت آگے۔ زمین زرخیز قیمتی دھاتیں، جواہرات، ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مال تجارت کن کن کے ساحل پر جا کر اترتا، وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام، فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت، نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب مائیکہ زمانہ عروج سمجھے۔ پہلی صدی ق۔ م میں یہ قوم تباہ ہو گئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی رمی ہوئی سطوت کی زندہ شہادتیں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لئے انہوں نے بڑے بڑے بند (DAMS) بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دار السلطنت ماریہ کے قریب تھا جسے سد ماریہ کہتے ہیں۔ (حجاز کے عرب بند کو "سد" اور عرب مین عرم کہتے ہیں)۔ یہ بند پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے ارد گرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین ایک وسیع و عریض باخ بن گئی تھی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَا فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَاءَتْهُمْ عَنْ يَمِينٍ وَ  
شِمَالٍ ۚ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۖ بَلَدًا طَيِّبَةً  
وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ (۳۴/۱۵)

اور قوم سبا کے لئے ان کے وطن کی (سرسبز و شادابی کی) حالت میں بڑی نشانی تھی۔  
دورویہ (ہرے بھرے باغ تھے دائیں بائیں کوئی روک ٹوک نہ تھی) اپنے پروردگار کا رزق (تھا)  
جی بھر کے کھاؤ اور اس کا شکر کرو (کتنی بڑی نعمت تھی) عمدہ (صاف ستھرا پُر فضا) شہر اور حفاظت  
کرنے والا پروردگار۔

لیکن دولت و حکومت کے نشے نے ان میں بھی اسی قسم کی بدستیاں پیدا کر دیں جن سے ان سے پہلے قوم عاد و ثمود، نمار آلود ہو چکی تھیں۔ نتیجہ وہی ہوا، جو ان قوموں کا ہوا تھا۔ پہلے یہ بند ٹوٹا، جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گرد و پیش کا علاقہ ایسا دیران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیڑوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ (۱۶-۱۷-۳۴)۔

یہ اس قوم کا انجام تھا۔ لیکن ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت ان کے عہد شوکت و اقبال کا



عروج تھا۔ اللہ نے اس قوم کو بہت کچھ دے رکھا تھا۔ لیکن یہ بجائے اس کے کہ خدا کی ان نعمتوں پر شکر گزار ہوتے، انہوں نے ادھر ادھر دست درازیاں شروع کر دیں اور جوع الارض | **ہوسِ استعماریت** | نے ایسی استعماریت کا جذبہ پیدا کر دیا کہ ان کی خواہش تھی کہ ہر جگہ ان ہی کی حکومت اور ہر مقام پر انہی کی تجارت ہو۔ تجارت سے حکومت اور حکومت سے فرعونیت اسی طرح سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا انجام ظاہر ہے۔

فَقَالُوا زَيْنًا بَعْدَ بَيْنٍ أَسْفَارَنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَ مَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَقٍ ۚ (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۲۴/۱۹)  
تو وہ کہنے لگے ”ہمارے پروردگار! ہماری سلطنت و حکومت کی دوستیں ناپید اکند (کر کے) ہمارے سفروں کو طویل بنا دے۔ لیکن (ساتھ ہی) انہوں نے اپنے آپ پر زیادتی بھی کی۔ چنانچہ ہم نے اُن (کی شوکت و حشمت) کو افسانہ بنا ڈالا اور ان کی جمعیت کو اچھی طرح تتر بتر کر ڈالا۔ بلاشبہ اس واقعے میں ہر استقامت پذیر اور شکر گزار بندے کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں!

ہوایہ کہ جب یونانیوں اور رومیوں نے شام اور مصر پر قبضہ کیا تو ان کے لئے خشکی کے راستے سے تجارت مشکل تھی۔ اس لئے کہ یہ تمام علاقہ عربوں کا تھا اور یہ لوگ عربوں سے خائف تھے۔ خود عرب بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ملک دوسروں کی گزرگاہ بن رہے۔ اس دشواری کے پیش نظر یونانیوں اور رومیوں نے ہندوستان سے تجارت کا راستہ ہی بدل دیا اور خشکی کے بجائے بحیرہ عرب سے سیدھے بحر احمر کے راستے شام و مصر تک مال لے جانے لگے۔ اس سے خشکی کا راستہ اُبڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی اہل سبا کی تجارت ختم ہو گئی اور (فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ) اب ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں یا وہ کھنڈرات جو ان کی تباہی و بربادی کے مرثیہ خوان ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کریم نے (سورہ سبا، آیات ۲۰-۲۱-۲۲) میں جو کچھ کہا ہے اسے ”مفہم القرآن“ کے الفاظ میں سنئے۔ فرمایا:

حقیقت یہ ہے کہ ابلیس نے عام انسانوں کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ قوانین خداوندی کا شیع نہیں کریں گے بلکہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلا کریں گے (۲۸-۳۱/۱۵) تو اس قسم کی قوموں نے اسے بتا دیا کہ وہ اپنے خیال میں سچا تھا۔ (یعنی ان لوگوں نے اپنی روش سے ابلیس کے خیال کو سچ کر دکھایا)

کیونکہ ان میں سے سوائے مومنین کے ایک گروہ کے سب اس کے پیچھے چلے۔  
حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو ایسی قوت حاصل نہ تھی کہ وہ انسان پر غالب آجاتا (جب وہ کائنات کی کسی شے پر غالب نہیں آسکتا، تو انسان پر جو اشیائے کائنات کو سحر کر سکتا ہے، کس طرح غالب آسکتا تھا؟ لیکن یہ ہمارے اس پروگرام کا نتیجہ ہے جس کی رُو سے ہم نے 'انسان کو' اشیائے کائنات کی طرح، مجبور پیدا نہیں کیا، بلکہ صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ جی چاہے تو وحیِ خداوندی کا اتباع کرے اور جی چاہے تو اس راستے کو چھوڑ کر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ "ابلیس اُس پر غالب آگیا" اور انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کرنے سے مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حیاتِ آخرت پر ایمان لا کر ان لوگوں سے متمیز اور ممتاز زندگی بسر کرے جو اس بارے میں شک میں رہتے ہیں۔ (زندگی کی سرفرازیوں اور خوشگوازیوں کا دار، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان میں پوشیدہ ہے اور اس قانون پر ایمان لایا نہیں جاسکتا جب تک حیاتِ اخروی پر ایمان نہ ہو)۔  
تیرا شوہر نہ دینے والا، ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے تاکہ ہر ایک کا عمل، اس کے قانون کے مطابق، نتیجہ مرتب کرے۔

**واقعہ ملکہ سبا** | یہ تھی وہ قوم جس کے عہدِ شباب میں اس کی حکمران (ملکہ سبا) حضرت سلیمانؑ کے ہاں تحائف پیش کرنے کے لئے آئی۔ سورۃ نمل میں اس واقعہ کی تفصیل ہے

(آگے چل کر ایک مقام پر ایسا ہوا کہ) سلیمانؑ نے گھوڑ سوار ہر کاروں کو، جو اُس وقت وہاں موجود نہیں تھے، طلب کیا۔ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا کہ ان کا سردار بُدھ کہاں ہے؟ کیا وہ یونہی کہیں ادھر ادھر گیا ہے یا وہ اپنی ڈیوٹی سے غائب ہے؟

اگر وہ اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو گیا ہے تو (فوجی قوانین کے مطابق) میں اسے سخت سزا دوں گا۔ اور اگر اس نے، اس کے لئے کوئی واضح اتھارٹی (اجازت نامہ) یا وجہِ جواز پیش نہ کی تو ہو سکتا ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے۔ (مفہوم ۲۰-۲۱/۲۴)

اس زمانے میں آدمیوں کے نام پرندوں اور جانوروں کے نام پر بھی رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ خود تورا

میں ہے کہ ایک اودمی شہزادے کا نام ہُد ہُد تھا۔ (سلاطین ۱، ۱۱/۱۴)۔ ہندوؤں کے ہاں طوطا رام اور چوہا مل جیسے نام اب تک رکھے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے مذکورہ صدر آیت میں جس ہُد ہُد کا ذکر ہے وہ رسالے کا کوئی افسر تھا۔  
اس کے بعد ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس ملک پر ایک ملکہ حکمران ہے جس کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ (یعنی وہ اپنی مملکت میں خود مکنتی ہے اور اپنی ضروریات کے لئے کسی بیرونی قوم کی محتاج نہیں) اور اس کا اندرونی نظم و نسق اور کنٹرول بھی بڑا عظیم الشان ہے۔  
لیکن وہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں، خدا کی نہیں کرتے۔ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں اس قدر خوشنما بنا رکھا ہے کہ وہ اپنے مسلک کو بالکل صحیح اور درست سمجھتے ہیں۔ اس نے انہیں صحیح روش زندگی کی طرف آنے سے ایسے روک رکھا ہے کہ وہ اس کی طرف راہ نمائی نہیں حاصل کر پاتے۔

(حیرت ہے کہ وہ لوگ خدا کو اپنا معبود نہیں تسلیم کرتے۔ اس خدا کو جو کائنات کے مخفی ذخیروں سے، ہر چیز کو عند الضرورت باہر لاتا ہے اور اس کا علم صرف خارجی کائنات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اپنے دل میں کیا رکھتے ہو اور ظاہر کیا کرتے ہو۔

وہ خدا جس کے علاوہ کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں، اس عظیم کارگہ فطرت کا مرکز کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(تعجب ہے کہ یہ لوگ اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے اور ایسی صاحب اختیار و ارادہ ہستی کو چھوڑ کر سورج کو اپنا خدا مانتے ہیں جسے اپنے طلوع و غروب پر بھی کوئی اختیار نہیں)۔

سلیمانؑ نے یہ سب کچھ سنا اور کہا کہ بہت اچھا۔ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ تمہارا بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ (خبر رساں لہجہ میں) ان کے بیانات کی تصدیق کر لینا ضروری ہوتا ہے۔

یہ ہمارا خط بود اور اسے سب کے اربابِ عمل و عقد تک پہنچا دو۔ پھر ان کے پاس سے ہٹ کر وہیں انتظار کرو اور دیکھو کہ ان کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔

ملکہ نے وہ خط پا کر اپنے مشیروں کی مجلس بلائی اور ان سے کہا کہ مجھے ایک ایسا خط ملا ہے جو بڑے ہی شریفانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔

یہ خط شاہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور اس کی غایت یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی صفتِ ربوبیت اور رحیمیت (یعنی سامانِ نشوونما کی ہم رسانی) ان لوگوں میں عام ہو جائے (۱/۲)۔

اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ تم میرے خلاف سرکشی اختیار نہ کرو بلکہ قوانینِ خداوندی کی مطیع و فرماں بردار بن کر چلی آؤ۔

خط کا مضمون سنا دینے کے بعد اس نے اپنے اہل دربار سے کہا کہ تم اس معاملہ پر غور کر کے مجھے بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے مشورہ کئے بغیر کسی معاملہ کا آخری فیصلہ نہیں کیا کرتی۔

انہوں نے کہا کہ اگر سلیمانؑ کے پاس بڑے بڑے جزار شکر ہیں، تو ہم نے بھی پوڑیاں نہیں بہن رکھیں۔ ہم بڑی قوتوں کی مالکِ سخت جنگجو قوم ہیں۔ اس لئے اس بنا پر اس سے خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ (لیکن یہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے جس کی طرف سے ہم تمہیں اطمینان دلاتے ہیں۔ اس کے دوسرے پہلوؤں پر آپ غور کر لیں۔ اس کے بعد آخری فیصلہ کریں۔ اس لئے کہ ایسے معاملات میں آخری فیصلہ آپ ہی کا ہو سکتا ہے۔ آپ جو فیصلہ بھی کریں گی ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔

اس نے کہا کہ اس بات کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تم جنگ سے گریز نہیں کرو گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب بادشاہ دوسرے ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے تیس تیس کر کے رکھ دیتے ہیں اور معاشرہ کا تختہ اس طرح الٹ دیتے ہیں کہ وہاں کے صاحبِ عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار بنا دیتے

ہیں۔ یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، بلکہ کسی میں بھی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ (اس لئے ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس بادشاہ کی طرف سے ایسا نہیں ہوگا۔ لہذا، میں یہ سمجھتی ہوں کہ جہاں تک ہو سکے، ہمیں جنگ کی نوبت نہیں آنے دینی چاہیئے)۔

میں (سردست) ان کی طرف کچھ تحائف بھیجتی ہوں اور انتظار کرتی ہوں کہ اس کا ان کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ (مشاہدہ اس طرح، جنگ کا ارادہ ترک کر دیں)۔  
(مفہوم القرآن ۲۳-۲۴/۳۵)

خبردار میں ہے۔

اور جب کہ خداوند کے نام کی بابت سلیمان کی شہرت سب کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے آزمانے آئی اور وہ بڑے جلو کے ساتھ اور اونٹوں کے ساتھ جن پر خوش بویاں لدی تھیں اور نہایت بہت سونا اور مہنگولے جواہر ساتھ لے کے یرشلم میں آئی اور اس نے سلیمان پاس آکے جو کچھ اس کے دل میں تھا اس سب کی بابت اس سے گفتگو کی۔ (سلاطین ۱۱) ۱۰/۲-۱  
لیکن دولت کا لالچ بھلا حضرت سلیمان کو کس طرح اپنے فریب میں لاسکتا تھا۔ ان کے پیش نظر اس قوم کی اصلاح تھی نہ کہ جلبِ منفعت۔ چنانچہ

جب ملکہ کا قاصد تحائف لے کر سلیمان کے پاس آیا تو اُس نے (تحائف وغیرہ دیکھ کر کہا کہ) کیا تم لوگ مال کا لالچ دے کر مجھے اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جس قدر مال و دولت مجھے اللہ نے دے رکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اس لئے تمہارا مال، میرے لئے وجہ کشش نہیں ہو سکتا۔ جو تحائف تم لائے ہو، وہ تمہارے نزدیک بڑے قابلِ فخر ہوں گے (لیکن میرے نزدیک ان کی کچھ قیمت نہیں۔ میرے نزدیک قدر و قیمت صرف اس کی ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو)۔

تم اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ (اور ان سے کہو کہ چونکہ تم نے ہماری شرائط کو تسلیم نہیں کیا، اس لئے اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ) ہم ایسے لشکروں کے

ساتھ تم پر چڑھائی کریں جن کا تم مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ ہم تمہیں تمہارے ملک سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور اس کے بعد تم ہمیشہ محکومی کی زندگی بسر کر فگے۔

(چنانچہ قاصد واپس چلا گیا اور سلیمانؑ نے چڑھائی کا ارادہ کر لیا۔ اور) اپنے اہل دربار سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ اہل سبا، باہر نکل کر جنگ کریں اور شکست کھا کر ہتھیار رکھ دیں، ان کے پایہ تخت پر شدت کا حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے آیا جائے۔ (ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ جنگ کئے بغیر ہی راہِ راست پر آجائیں)۔ چنانچہ اس نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہے جو اس ہم کو جلد از جلد سر کر سکتا ہے۔

اس پر وحشی قبائل کا ایک قوی ہیکل سردار جو جسمانی قوت کے علاوہ معاملہ فہمی میں بھی ماہر تھا، بولا کہ یہ ہم میں سرگردوں کا اور اتنی جلدی کہ قبل اس کے کہ آپ اس مقام سے کوچ کر کے آگے بڑھیں، ملکہ اور اس کا تخت حکومت آپ کے قدموں میں ہو گا۔ (آپ اس ہم کو میرے سپرد کیجئے) میں اسے سر کرنے کی قوت بھی رکھتا ہوں اور قابلِ اعتماد بھی ہوں۔

ایک دوسرے سردار نے جسے اس خط و کتابت کا پورا پورا علم تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، کہا کہ میں اس ہم کو اس سے بھی جلدی سر کر سکتا ہوں۔ ایسی جلدی کہ ملکہ سبا، پشتم زدن میں مفتوح و مغلوب یہاں آجائے۔

چنانچہ وہ ہم اس کے سپرد کی گئی اور اس نے اسے نہایت حسن و خوبی سے سر کر لیا۔ جب سلیمانؑ نے مالِ غنیمت کو اپنے سامنے دیکھا تو بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوا اور کہا کہ اس قوم کے خلاف اس قسم کی کامیابی انہی اسباب و ذرائع سے ممکن تھی جو ہمیں خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ وہ ایسے مواقع اس لئے ہم پہنچاتا ہے کہ لوگوں پر اس حقیقت کو آشکارا کر دے کہ میں اس کو دی ہوئی قوت و شہمت اور دولت و ثروت کو صحیح مصرف میں لاتا ہوں یا ان کا غلط استعمال کرتا ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو قوم بھی فطرت کی بخششوں کو صحیح مصرف میں لاتی ہے اس کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے اور جو لوگ ان کا غلط استعمال کرتے ہیں اس کا نقصان انہی کو ہوتا ہے۔ خدا کا نہ تو ان مفادات سے کچھ سنوڑتا ہے اور نہ ہی ان نقصانات سے کچھ بگڑتا ہے۔

یہ سب انسان کے اپنے لئے ہے۔ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ وہ انسانوں کی محنت کے حاصل سے کچھ لے۔ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔

لیکن یہ فتح میدان جنگ میں ہوئی تھی، ان کے دارالسلطنت تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کے لئے سلیمانؑ نے اہل شکر سے کہا کہ تم (دیگر مقامات کو زیادہ گزند نہ پہنچاؤ) ایوان حکومت پر اس شدت کا حملہ کرو کہ اس کا خلیہ بگڑ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ارباب حکومت اس سے راہ راست پر آجائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا (تو پھر دوسری تدابیر پر عمل کیا جائے گا)۔

(مفہوم القرآن ۳۶-۲۶/۴۱)

یعنی حضرت سلیمانؑ نے تجویز کیا کہ قبل اس کے کہ ملکہ سبا کے لشکر میدان میں مقابلہ کے لئے آجائیں ہیں چاہیئے کہ جلدی سے اس کے دارالسلطنت پر زور کا حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے آئیں۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمانداروں میں سے پوچھا کہ اس ہم کو کون جلد از جلد سر کر سکتا ہے۔ اس پر وحشی قبائل کے ایک قوی ہیکل سردار نے، جو جسمانی قوت کے علاوہ معاملہ فہمی میں بھی ماہر تھا، کہا کہ میں اس ہم کو اتنی جلدی سر کر سکتا ہوں کہ قبل اس کے کہ آپ یہاں سے آگے کوچ کریں، ملکہ اور اس کا تخت و تاج آپ کے قدموں میں ہوگا۔ ایک اور افسر تھا جسے اس خط و کتابت کا بھی علم تھا جو ملکہ سبا کے ساتھ ہوئی تھی، اس نے کہا کہ میں اس ہم کو اس سے بھی زیادہ جلدی سر کر سکتا ہوں۔ اتنی جلدی کہ آنکھ بھٹکنے کے عرصہ میں ملکہ کا تخت آپ کے سامنے ہوگا۔ چنانچہ وہ ہم اس کے سپرد کر دی گئی اور اس نے اسے نہایت حسن و خوبی سے سر کر لیا۔ اس کے بعد قرآن کریم میں ہے۔

(چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہو گئی اور ملکہ سبا نے شکست مان لی) جب وہ سلیمانؑ کے سامنے آئی تو اس نے کہا کہ کیوں؟ یہی تھی وہ تیری قوت و ثروت جس کے بل بوتے پر تیری قوم اس قدر سرکش ہو رہی تھی؟ اس نے کہا کہ ہاں! وہ قوت و ثروت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں اس کا پہلے ہی سے احساس ہو گیا تھا۔ اب ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

وہ فرماں پذیری تو اس سے بہت پہلے قبول کر لیتی، لیکن جو چیز اس کی راہ میں حائل ہو رہی تھی، وہ اس قوم کا مذہب تھا، یعنی وہ معبود جن کی وہ قوم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتی تھی (ان کا خیال تھا کہ وہ معبود ان کی ضرورت مند کریں گے اور وہ غالب رہیں گے۔ لیکن ان کا یہ خیال خام تھا)۔

(مفہوم القرآن ۴۲-۲۶/۴۳)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے لشکر سے کہہ دیا تھا کہ فوجی بلخار سے اس پایہ تخت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو ضرور پہنچے گا لیکن دیکھنا! تم اس سے زیادہ اسے خراب نہ کرنا۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ممکن ہے کہ یہ لوگ اس سے راہ راست پر آجائیں۔ چنانچہ وہ شہر فتح ہو گیا اور ملکہ، حضرت سلیمانؑ کے سامنے آئی تو آپ نے اس سے کہا کہ دیکھو! یہی تھی ناں تمہاری قوت و سطوت جس کے بل بوتے پر تیری قوم اس قدر مرکزش ہو رہی تھی؟ اس پر ملکہ نے کہا کہ ہاں! ہماری قوت و سطوت کچھ ایسی ہی تھی۔ ہمیں اس کا پہلے ہی احساں ہو گیا تھا۔ اب ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

اس کے بعد ان دونوں سلطنتوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کو اپنے ہاں بطور شاہی مہمان کے بٹھرایا اور ایک شیش محل میں اس کے قیام کا انتظام کیا۔ اس نے اس سے پہلے شیش محل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ جب اس نے بلوریں فرش میں درو دیوار کا عکس دیکھا تو سمجھا کہ سامنے پانی ہے۔ وہ اس منظر سے گھبرا سی گئی۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی گھبراہٹ کو بھانپا تو کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ پانی نہیں شیشے کا فرش ہے (۲۴/۴۴)۔ اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ملکہ کو توحید کی دعوت دی اور وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئی۔

قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ ۝۲۴

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۴/۴۴)

ملکہ پکار اٹھی ”اے پروردگار! بیشک میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ خدا

پروردگارِ عالم کی مطیع و فرماں بردار ہو گئی!

یہ تھا ماحصل اس تمام واقعہ کا۔

**حضرت سلیمانؑ کا جانشین** حضرت داؤدؑ کا جانشین تو حضرت سلیمانؑ جیسا اولوالعزم شاہنشاہ اور برگزیدہ رسول تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا بیٹا ایسا نہیں تھا۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو دو مقامات پر استعارہ بیان کیا ہے۔ سورہ صٰحٰہ میں ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ ۝ وَاَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِیِّهِ جَسَدًا ۝ ثُمَّ اَنَابَ ۝ (۳۸/۳۴)

سلیمان ان خصوصیات کا حامل تھا۔ لیکن اُسے اپنے بیٹے کی طرف سے جو اُس کا جانشین



ہونے والا تھا، بڑی کوفت تھی۔ وہ ایک جد تھا بے روح (۳۴/۱۴) اور ان صفات کا مالک نہیں تھا جو اس مملکت کے انتظام کے ضروری تھیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس سے دل برداشتہ ہو جاتا، وہ قوانین خداوندی کی طرف اور شدت سے رجوع کرتا (۳) تاکہ وہ نظام مملکت کو اور مستحکم کر دے۔

یعنی ان کے تخت کا وارث ایک بے جان دھڑ تھا۔ بایں ہمہ سلطنت کا اقبال ایسا تھا کہ اس بے جان دھڑ کا رُعب بھی ایک عرصے تک قائم رہا اور بڑی بڑی سلطنتوں کے متعلق ہوا بھی یہی کرتا ہے۔ محکوم قوم پر اُقت و سطوت کا رعب کچھ اس طرح غالب ہوتا ہے کہ تخت و تاج کو سنبھالنے والے ستون، خواہ اندر ہی اندر دیک سے کھوکھلے ہو چکے ہوں، لیکن جب تک ان کی شکل و صورت قائم ہے محکوم قوم کے افراد اپنی خوئے غلامی سے مجبور بدستور ان کے حضور سجدہ ریز رہتے ہیں۔ اور جب تک یہ ستون خود اپنے بوجھ سے دب کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں، ان کی روش اطاعت و فرماں پذیری میں فرق نہیں آتا۔ اس وقت البتہ انہیں ضرور احساس ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ یونہی رعب میں اطاعت کرتے رہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتا تو ان کھوکھلی لکڑیوں کو ہم خود ہی کیوں نہ الگ کر دیتے۔ لیکن غلاموں میں یہ بصیرت کہاں کہ ٹھوس اور کھوکھلی لکڑی میں تمیز کر سکیں؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کو سورہ سبأ کی آیت ۱۴ (۳۴/۱۴) میں یوں بیان فرمایا ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَاتِهِ ۖ فَلَمَّا خَرَ تَبَيَّنَتِ الْجُنُودُ أَن لَّوْكَالُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا كُنْتُمْ فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِينَ ۝ (۳۴/۱۴)

اس کی موت کے بعد اُس کا بیٹا، اس کا جانشین ہوا۔ لیکن وہ اپنے باپ دادا کی طرح نہ تھا۔ وہ محض ایک انسان نما حیوان تھا۔ بس آب و گل کا ایک متحرک پیکر (۳۸/۳۴)۔ چنانچہ اس کے ہاتھوں، شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی، سب ختم ہو گئی (بنی اسرائیل کے دس قبائل اُس سے سرکش ہو گئے)۔ چنانچہ جب اُن وحشی قبائل نے جو سلیمان کے عہد

میں اس طرح اطاعت شعار اور فرماں پذیر تھے، اس صورتِ حالات کو دیکھا تو وہ بھی سرکش ہو گئے اور انہیں افسوس ہوا کہ وہ اپنے پرانے خیال کے مطابق، 'اتنا عرصہ کیوں یونہی' اس جسدِ بے جان کی غلامی کرتے رہے۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس حکومت کا اب صرف نام ہی باقی ہے اور اس کے پیچھے قوت کچھ نہیں رہی، تو وہ اتنا عرصہ اس ذلت آمیز عذاب میں کیوں مبتلا رہتے؟

حضرت سلیمانؑ کا یہی بیٹا تھا جس کے متعلق تورات میں ہے۔

اور رجعام کی سلطنت کے پانچویں برس ایسا ہوا کہ مصر کے بادشاہ سیتقی نے پرشوم پر چڑھائی کی اور اس نے خداوند کا خزانہ اور بادشاہ کے گھر کا خزانہ لوٹ لیا۔ اس نے بالکل لوٹ لیا اور اس نے وہ سب ڈھالیں جو سلیمانؑ نے سونے کی بنائی تھیں لے لیں اور رجعام بادشاہ نے ان کے بدلے بیتل کی ڈھالیں بنائیں اور پاس باؤں کے سردار کے ہاتھوں میں جو بادشاہی گھر کے آگے چوکی دیتے تھے دیں۔ (سلاطین (۱) ۲۵-۱۲/۲۷)

حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کا بن کے ساتھ مل کر اپنی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن رجعام کے عہد سے اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر رجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے سیکل کے مقابلے میں دو بُت غلے تعمیر کرائے، جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

(سلاطین (۱) باب ۱۲، ۱۱)

**تورات کی افسانہ طرازی** | یہ تھے خدا کے جلیل القدر رسول حضرت سلیمانؑ لیکن دیگر انبیاء کرامؑ کی طرح تورات نے ان کے متعلق بھی کچھ کم افسانہ طرازی سے کام نہیں

لیا۔ کتاب سلاطین نمبر میں ہے:-

پر سلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا، سو آبی اور عموئی اور ادومی اور صیدانی اور حتی عورتوں کو۔ ان قوموں کی جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندر نہ جاؤ اور وہ تم پاس اندر نہ آئیں کہ وہ یقیناً تمہارے

دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرائیں گی۔ سو سلیمانؑ انہی سے عاشق ہو کے پٹنا۔ اس کی سات سو جوروں بیگمات تھیں اور تین سو حرمین اور اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمانؑ بوڑھا ہوا، تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کال نہ رہا، جیسا اس کے باپ اود کا دل تھا۔ سو سلیمانؑ نے صیدانیوں کی دیوی عستارات اور بنی عتوت کے نفرتی ملکوم کی پیری کی اور سلیمانؑ نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیری اپنے باپ اود کی طرح نہ کی۔ (سلاطین (۱) ۱ - ۱۱/۴)

یہ اور سحر و کمانت وغیرہ کے متعلق اسی قسم کے اور افسانے تھے جنہیں یہود حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ان خرافات کی تردید فرما کر خدا کے اس برگزیدہ رسول کا دامن ان لغو اتہامات سے پاک کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے:-

وَ اتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمَنَ ۖ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمَنُ وَ لَكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السَّمْعَرَ قَ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَآرُودَ وَ مَاوُودَ ۖ ..... وَ كَيْنُسَ مَا شَرَدَا بِهٖ أَنْفُسَهُمَا ۚ  
لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۰۳)

ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ یہ خدا کی صحیح تعلیم کو چھوڑ کر ان افسانوں کے پیچھے لگے رہتے تھے جو ان کے سرغنوں نے مملکت سلیمانؑ کے خلاف تراش رکھے تھے۔ ان میں سے ایک افسانہ یہ تھا کہ سلیمانؑ (جیسا پیغمبر) سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔ سلیمانؑ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ کچھ خود ان کے سرغنے کیا کرتے تھے۔ اور یہ (قصہ بھی جو ان لوگوں میں مشہور ہے) صحیح نہیں ہے کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی تھی (جیسا کہ ان لوگوں میں مشہور ہے) کہ وہ لوگوں کو جادوگری سکھلاتے تھے اور یہ کہ وہ جو کچھ بھی کسی کو سکھلاتے تھے تو یہ کہے بغیر نہیں سکھلاتے تھے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے، پھر تم کیوں کفر میں مبتلا ہوتے ہو؟ اور یہ کہ اس پر بھی لوگ ان سے ایسے عمل سیکھتے جن کے ذریعے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈالنا چاہتے، حالانکہ فی الحقیقت وہ کسی انسان

کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، اِلّا یہ کہ خدا کے حکم سے کسی کو نقصان پہنچنے والا ہو اور نقصان پہنچ جائے (یہ تمام قصے کہانیاں ان کی اپنی تراشیدہ ہیں ان میں کوئی بات بھی صحیح نہیں)۔ یہ لوگ کتابِ الہی کی تعلیم فراموش کر کے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو انہیں سراسر نقصان پہنچانے والی ہیں اور کوئی فائدہ نہیں رکھتیں اور (پھر کچھ یہ بات بھی نہیں کہ انہیں احکامِ الہی کی خبر نہ ہو) انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کوئی (اپنا دین و ایمان بچ کر) ایسے جھوٹ کا خریدار ہوتا ہے اس کے لئے آخرت کی برکتوں میں کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ (لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اس سے باز نہیں آتے) پس افسوس ان کی اس خرید و فروخت پر! کیا ہی بُری متاع ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی! کاش وہ جانتے کہ کس طرح اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد کر رہے ہیں!

یہ آیہِ جلیلہ بڑے اہم تاریخی مباحث کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یربعام نے احیا کاہن سے مل کر حکومتِ سلیمانی کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ یربعام کو حضرت سلیمانؑ نے شمالی حصّہ مملکت کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس نے بہت سے اور لوگوں کو ساتھ ملا کر سلطنت کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ حضرت سلیمانؑ کو اس کی اطلاع ملی، تو **مملکتِ سلیمان کے خلاف سازشیں** آپ نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن وہ بھاگ کر مصر چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد واپس لوٹا اور پھر دس اسباط بنی اسرائیل کو ساتھ ملا کر حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کے خلاف جنگ کی اور اپنی حکومت قائم کر لی، نہ صرف حکومت بلکہ بیت المقدس کے مقابلے میں بتخانے تعمیر کرائے، جہاں اعلانیہ بت پرستی ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل یوں بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بت پرستی اور اس کے ساتھ وہ سب اداہام و خرافات جو مندروں میں ہوتے تھے، جادوگری، کہانت، توہم پرستی، غرضیکہ کفر و شرک کا کوئی گوشہ نہ تھا جو ان پر مسلط نہ ہو چکا ہو۔ یہ سب کچھ حضرت سلیمانؑ کے دشمنوں نے کیا لیکن بعد میں یہودیوں نے اس تعلیم کو خود حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ کتابِ سلاطین سے ظاہر ہے۔ حقیقتی کہ اسی کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ تمام ریشہ دوانیاں حضرت سلیمانؑ پر (معاذ اللہ خدا کا عذاب تھا جو آپ پر بت پرستی کے جرم کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔

سوازبکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس

لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اُسے حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔ اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا ازبکہ تجھ سے ایسا ایسا کچھ ہوا اور تُو نے میرے عہد کو اور میری شہریتوں کو جو میں نے تجھے فرمایاں حفظ نہ کیا، اس واسطے میں سلطنت کو تجھ سے چھین لوں گا اور تیرے خادم کو دوں گا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر سے میں تیرے جیتے ہی ایسا نہ کروں گا۔ پر تیرے بیٹے کے ہاتھ سے چھین لوں گا

مگر ساری سلطنت نہ چھین لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کے لئے جسے میں نے چُن لیا ہے، ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔

(سلاطین نمبر ۹-۱۱/۱۳)

یربعام اور اس کے ساتھی وہ شیاطین (مشرکس و عنان تاب باغی) تھے جنہوں نے حضرت سلیمانؑ کے خلاف سازشیں کیں اور اس کے بعد آپ کی طرف اس قسم کی مشرکانہ تعلیم منسوب کی گئی۔

**سحر بابل** اب آگے بڑھتے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ سحر کی تعلیم دیتے تھے وہ سحر جس کا پرستار بابل تھا اور جس کے متعلق لوگوں میں یہ مشہور کیا گیا تھا کہ یہ بابل کے دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) پر منجانب اللہ نازل ہوا تھا اور وہاں سے آگے بڑھا ہے۔ یعنی انہوں نے اس کے ساتھ خدائی سند کو بھی شامل کر لیا تھا۔ تاریخی انکشافات اس پر شاہد ہیں کہ بابل سحر و کہانت اور شعبہ گری دفسوں سازی کا گہوارہ تھا۔ (راہز اپنی مشہور کتاب "بابل اور اشوری مذہب" میں لکھتا ہے۔

اہل بابل و نینوا کے مذہب کا معتد بہ حصہ جھاڑ پھونک کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ (ص ۱۲۵)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھکس کا مضمون نگار بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ "اہل بابل کا مذہبی لٹریچر سحر و کہانت سے بھرا پڑا تھا۔" جب کلدانیوں (اہل بابل) کی قومیت کلاشیہ ازہ بکھرا تو یہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور جہاں جہاں گئے، انہوں نے شعبہ بازی اور افسوں سازی کی اس نظر فریب تعلیم کو عام کرنا شروع کر دیا۔ [دیکھئے RAGAZIN کی کتاب "کالڈیہ" - یہودی شعبہ بازی اور سحر و کہانت کے بدل شیدائی تھے۔ اہل بابل کے ان بکھرے ہوئے معلموں کا سب سے زیادہ اثر انہی توہم پرستوں پر ہوا، چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا اس پر شاہد ہے کہ یہودیوں میں اہل بابل ہر جگہ بنگاؤ تھے جس دیکھے

جانے لگے اور (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رُو سے) ان کی تعلیم یہودیوں کے ہاں عام ہو گئی تھی۔ یہ تھی یہودیوں کی حالت جس پر جیوش انسائیکلو پیڈیا کی حسب ذیل شہادت قابل غور ہے۔

”قدیم یہودیوں میں جادو کی تعلیم عام تھی۔ حتیٰ کہ صدرِ مجالس یا محکمہ قضا کی رکنیت کے لئے جادو کا علم لائیفک شرط سمجھا جاتا تھا، خواہ یہ جادو کفار سے ہی کیوں نہ سیکھا جائے۔ ان کے بڑے بڑے علماء اسی علم کے ماہر تھے اور قانون کی نگاہ میں اس کا اثر مسلم تھا۔ لوگ اہل علم کی باتوں کی پرواہ کرتے یا نہ کرتے، لیکن ساحرین کی عقیدت ان کے رگ و ریشے میں سما جی تھی۔ اسی نے انہیں تباہ کر دیا۔“

(جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ہشتم)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب یہودی (بیت المقدس کی تباہی کے بعد) اسیر ہو کر بابل گئے ہیں اور وہاں کم و بیش ایک سو سال تک رہے، تو اس وقت انہوں نے اسی قسم کی تعلیم اہل بابل سے حاصل کی ہو۔ بہر حال، تاریخ کی متعدد شہادت اس حقیقت کی مظہر ہیں کہ یہودیوں اپنے پیغمبروں کی تعلیم سے برگشتہ ہو کر اس قسم کی خرافات میں الجھ چکے تھے۔ یہ کیفیت کچھ قدیم یہودیوں ہی کی نہیں تھی بلکہ عہدِ نبی اکرمؐ کے یہودیوں کا بھی یہی حال تھا۔ خود تو یہ جگڑے ہی تھے لیکن قیامت یہ ہے کہ انہوں نے اس تمام مجموعہ خرافات کو اپنے انبیائے کرامؑ (بالخصوص حضرت سلیمانؑ) کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ چنانچہ تلمود میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک انجسٹری تھی جس پر اسمِ اعظم کندہ تھا جس کی تاثیر سے انسان، حیوان، پرند، پرند، جنات، بھوت، سب آپ کے

**ایک اور افسانہ** مستخر تھے۔ جب آپ کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہو گیا۔ یہ بات خداوند بہتوا کو ناگوار گذری، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ احمودیس پالاک سے آپ کی

لے یہودی (بلکہ سامی اقوام) میں مروج جادو کی دل چسپ تفصیل (G. Campbell Thompson) کی کتاب (Semitic Magic: Its origin and Development) میں ملاحظہ کیجئے۔

لے آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں میں اسمِ اعظم کا تصور کہاں سے آیا؟

انگشتری چڑا کر لے گیا اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ حضرت سلیمان کی قوت کا راز تو اسی انگشتری میں تھا۔ جب وہ چھن گئی تو سب کچھ گیا۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ آموں کے ملک میں پہنچ کر آپ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر مچھلی لے کر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ بھکارن شہزادی نے وہ مچھلی اس سے خرید لی اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت سلیمان نے جنہوں نے اپنا نام قبلت رکھ چھوڑا تھا) فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ اسے فوراً اٹھالیا اور آنکھ جھپکنے کے عرصے میں یرشلم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور خود تختِ حکومت پر متمکن ہو گئے (یہودی تائید)۔ یہ ہیں وہ خرافات جو یہودیوں کی مقدس کتابوں میں خدا کے اس برگزیدہ بندے کی طرف منسوب ہیں۔ تورات اور کتبِ یہود نے حضرت سلیمان کی طرف اس قسم کے خرافات کو منسوب کیا۔ لیکن قرآن کریم نے آکر اعلان کیا کہ یہ سب اتہامات ہیں جن سے **قرآن اور تورات** خدا کے اس برگزیدہ رسول کا دامن پاک ہے (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ)۔

یہ اعلان آج سے قریب چودہ سو سال پہلے ہوا جب دنیا میں اس حقیقت کا شاہد کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد تاریخی انکشافات نے تورات اور کتبِ یہود کے بیانات کی تائید کی یا قرآن کریم کے اعلان کی؟ ان کا جواب مسلمانوں سے نہیں بلکہ غیر مسلم محققین کی زبان سے سنئے۔ انسائیکلو پیڈیا بلیکا (یعنی خود بائبل کے انسائیکلو پیڈیا) میں لکھا ہے۔

اتنا تو غالباً صحیح ہے کہ (حضرت سلیمان کی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی متعدد بیویاں تھیں لیکن آپ نے ان سب کے لئے عبادت خانے نہیں بنوائے تھے، نہ ہی خدائے یہوہ کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش شامل کی تھی۔ انہیں اس سرزمین میں جو خداوند یہوہ کی وراثت تھی خدائے واحد کے انکار کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق خدائے یہوہ کا وفادار پرستار تھا۔

ڈکشنری آف بائبل میں بھی اس کی تائید ان الفاظ میں موجود ہے۔

ایسا باور کرنا مشکل ہے کہ (سلیمان) بادشاہ خدا کے یہ وہ سے مرتد ہو کر بُت پرست ہو گیا تھا۔

یہ شہادتیں ان غیر مسلم (عیسائی) مؤرخین و محققین کی ہیں جو اپنے مذہب کی رو سے تورات کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اور قرآن کریم کو منجانب اللہ نہیں مانتے۔ غور فرمائیے کہ خود ان کی تحقیق کس کی تائید کر رہی ہے؟ لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک تورات آسمانی کتاب اور قرآن کریم انسانی تعلیم کا مجموعہ ہے۔ اس تعصب کا کیا علاج؟ لیکن بعید از انصاف ہو گا اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے کہ خود ہمارا لٹریچر بھی ان خرافات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، تالمود کا قصہ جس میں حضرت سلیمان کی "اسمِ عظم" والی انگشتری کا افسانہ مذکور ہے، آپ اور دیکھ چکے ہیں۔ یہ قصہ ہماری کتب تفسیر میں درج ہے یہاں تک کہ معالم التنزیل میں اتنا اضافہ اور بھی ہے کہ جب اس جن (یعنی جعلی سلیمان) کو حکومت کرتے کچھ عرصہ گزر گیا تو حضرت سلیمان کے صحابی آصف نے آپ کی ازواجِ مطہرات سے پوچھا کہ باہر تو اس کا (یعنی جعلی سلیمان) کا جس کے متعلق انہیں علم نہ تھا کہ وہ جعلی ہے) حال بہت بُرا ہے تمہارے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی ازواج نے کہا کہ یہاں اس کا حال بدتر ہے یہ تو حیض کی حالت میں بھی اقبناں نہیں کرتا اور غسلِ جنابت بھی نہیں کرتا۔ (معاذ اللہ، معاذ اللہ) پناہ بخدا۔ یہ کچھ خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبر کی ازواجِ مطہرات کے متعلق ذکر ہو رہا ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت | اور کتب تفسیر پر ہی کیا موقوف ہے خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قال سلیمان بن داؤد لا طوفن اللیلۃ علی سبعین امراًۃ تحمل کل امراًۃ فارساً یجاہد فی سبیل اللہ فقال لہ صاحبہ انشاء اللہ فلم یقل ولم تحمل شیئاً الا واحد ساقطاً احدی شقیہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو قالہا لجاہدوا فی سبیل اللہ۔ (بخاری شریف جلد دوم ص ۱۵۶)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، حضور اقدس صلم نے ارشاد فرمایا ایک بار سلیمان نے کہا کہ آج رات میں ستر عورتوں کا دورہ کروں گا اور ہر عورت حاملہ ہو کر ایک ایسا شاہسوار پیدا کرے گی جو



راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ سلیمان کے ساتھی (یعنی فرشتے) نے کہا انشاء اللہ کہو، لیکن حضرت سلیمانؑ نے نہ کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عورت عالمہ نہ ہوئی۔ صرف ایک عورت کے آدھا پتھر پیدا ہوا۔ حضور اقدس صلم نے فرمایا اگر سلیمان انشاء اللہ کہہ دیتے تو سب (سوار پیدا ہوتے اور) راہِ خدا میں جہاد کرتے۔

لیکن قرآن کریم کا عصائے کلبی باطل کی ان تمام رستیوں کو ننگنے کے لئے کافی ہے، خواہ یہ یہود کے صومعوں میں ہوں یا وہاں سے رینگتے رینگتے حرمِ کعبہ میں آگھسیں۔ خدا اور اس کا رسول ان تمام اتہامات سے بلند بالاتر ہیں۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

حضرت سلیمانؑ کا تذکرہ جلیلہ تو ختم ہوا۔ لیکن ایک واقعہ کے متعلق تھوڑی سی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے متعلق عجیب عجیب قسم کی روایات کتبِ تفسیر میں آئی ہیں۔ وہ واقعہ سورہ صٰح کی حسبِ ذیل آیات میں مذکور ہے (جو اس سے پہلے بھی سامنے آچکی ہیں)۔

وَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ ۖ نَحْمَدُ الْعَبْدَ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصَّفِيفَتُ الْجَبَّادُ ۖ فَقَالَ إِنِّي أُجِيبُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي ۖ حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۖ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَخَطَفَنِي مَسْحًا بِالسَّوْقِ وَالْعُنَاقِ ۝ (۳۰-۳۸/۳۳)

اور (دیکھو) ہم نے داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) عطا کیا۔ وہ کتنا اچھا بندہ تھا۔ بلاشبہ وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔ (یاد کرو) جب شام کے وقت اس کے سامنے اور اکیلے گھوڑے پیش کئے گئے تو وہ کہنے لگا کہ یاد رکھو میں نے اس مال کی محبت کو محض اپنے رب کی یاد کی وجہ سے پسند کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے آگے بڑھتے ہوئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، (انہوں نے خدام سے کہا) ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ۔ سو انہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (محبت کے) ہاتھ پھیرنے شروع کر دیئے (اور انہیں سہلانے لگے)۔

کتبِ تفسیر میں روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے بعد نماز ظہر اپنے گھوڑوں کا معائنہ شروع کیا۔ ۱ یہ

گھوڑے ان روایات کے مطابق، دریا سے نکلے تھے اور ان کے پر بھی تھے، جب نوسو دیکھ چکے، تو آپ کو نمازِ عصر یاد آئی۔ دیکھا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ آپ کی نماز فوت ہو گئی۔ اس سے آپ کو گھوڑوں پر سخت غصہ آیا۔ انہیں واپس لوٹایا اور آپ نے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں تلواسے کاٹ دیں، کیونکہ یہ نماز کی راہ میں حائل ہوئے تھے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ مذکورہ صدر آیات میں اس قصے کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں۔ یہ سب ذہن انسانی کی افسانہ طرز ازیں ہیں۔ قرآن کریم نے تو فقط اتنا بتایا ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس گھوڑوں کا جید شکر تھا۔ جب وہ ان کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے اس حقیقت کی وضاحت فرمادی کہ میں انہیں ذاتی کُروفر اور شان و شوکت کے لئے نہیں چاہتا، بلکہ خدا کے ”ذکر“ کی خاطر چاہتا ہوں اور ”ذکر“ کے متعلق قصہ حضرت موسیٰ میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم قیام و بقائے حکومتِ الہیہ ہے جس کے لئے مادی قوتوں کی از بس ضرورت ہے، بالخصوص گھوڑوں کے شکر کی۔ سورۃ انفال میں جماعتِ مومنین سے بھی کہا گیا ہے کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت تیار شدہ گھوڑوں کے رسالوں سے کرو۔

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ  
مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ  
وَعَدُوَّكُمْ وَ الْآخِرِينَ مِنْ دُونِهِمْ ۚ  
لَا تَغْلِبُوهُمْ ۚ اِنَّهُ يَغْلِبُهُمْ ۚ وَ مَا تُنْفِقُوا  
مِنْ شَيْءٍ فِىْ سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفِّ إِلَيْكُمْ وَ  
اَنْتُمْ لَا تَظْلُمُوْنَ ۝ (۸/۴۰)

اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے اپنا ساز و ساما ہتیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر اللہ کے (کلمہ حق کے دشمنوں) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔ نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں، اللہ انہیں جانتا ہے اور (بادکھو)

اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے،  
وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا، ایسا نہ ہو گا کہ تمہاری حق تلفی ہو!

اسی کی طرف حضرت سلیمانؑ نے اشارہ فرمایا۔ جب سب گھوڑے سامنے سے گزر گئے تو آپ نے انہیں ٹوٹانے کا حکم دیا، سب کو یا ان میں سے خاص خاص کو۔ اور چونکہ یہ اللہ کی راہ میں جاں نثاری کے جانور تھے اس لئے خود اپنے ہاتھوں سے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کی مالش کی، جس طرح حضرت عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ بیت المال کے اونٹوں کو اپنے ہاتھ سے تیل ملا کرتے تھے (یا محبت اور پیار سے انہیں چھتھپایا کرتے تھے)۔ یہ ہے ان آیات کا کھلا مفہوم جس پر ذہن انسانی کی عجوبہ پسندی نے افسانہ طرازی کی ایک عجیب و غریب عمارت کھڑی کر دی۔



وَاٰیُوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهُ <sup>۲۱</sup><sub>۸۲</sub>

# استقامتِ ایوبیؑ

جَبِ اسْ نِگارِہِ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا  
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر رُوحِ الامیں پیدا

## حضرت ایوب علیہ السلام

ربط مضمون کے اعتبار سے ہمیں دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے کوائف حیات مسلسل بیان کرتے جانا چاہیے لیکن عصری تسلسل کے لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام حضرت ایوب کا تذکرہ سامنے آجائے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت یعقوب اور عیسو حضرت اسحقؑ کے بیٹے تھے۔ عیسو اپنے گھر سے نکل کر اپنے چچا اسماعیلؑ کے ہاں نکل گئے اور وہیں ان کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ ان کے متعدد اولادیں ہوئیں جن میں سے عمالق اور عوض مشہور ہوئیں۔ عیسو کا عرف ادم (سرخ گوں) تھا۔ اس لئے یہ خاندان ادنیٰ کہلایا۔ بحر میت اور خلیج عقبہ کا درمیانی علاقہ ان کا مسکن تھا۔ تورات میں اس کا نام کوہ سعیر آیا ہے۔ ان کا دار الحکومت ریم (پٹرا) تھا۔ حضرت ایوبؑ عوض کے قبیلے سے متعلق تھے۔ تورات میں سفر ایوب ان کی طرف منسوب ہے۔ یو باب، اوب اور ایوب ایک ہی نام ہے۔ ان کا زمانہ ستلہ اور سنحہ ق م کے درمیان سمجھے سفر ایوب میں ان کا قصہ تفصیلی طور پر مذکور ہے اور تورات کے عام انداز کے مطابق اس میں زیب داستان

---

لے بعض ارباب تحقیق کا یہ بھی خیال ہے کہ سفر ایوب مجموعہ تورات میں قدیم ترین کتاب ہے جسے حضرت موسیٰؑ نے عبرانی میں منتقل کیا تھا۔ اس اعتبار سے حضرت ایوب کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، تاریخ نے ابھی ان معاملات میں یقینیات کا درجہ حاصل نہیں کیا، نہ ہمارا مقصد استقصاء تاریخی ہے۔ اس لئے ان مباحثات میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔

کے لئے بھی بہت کچھ بڑھایا چڑھایا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ حیثیت مجموعی سفرِ یوٰب کا بیاریہ بیان بڑا لاہوتی ہے۔ قرآن کریم نے آپ کی زندگی کا صرف ایک واقعہ بیان کیا ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ اٰیُوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ اِنِّیْ مُّسٰوِیُّ الضُّرِّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِیْمِیْنَ ۝

(۲۱/۸۳)

اور (یوٰب کا معاملہ یاد کرو) جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا، ”میں دُکھ میں پڑ گیا ہوں اور خدا یا! تجھ سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں۔“

**واقعہ حضرت یوٰبؑ** | اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی سخت تکلیف لاحق ہو گئی تھی جس کے دفعیے کے لئے آپ بھنور رب العزت دعائیں مانگتے تھے چنانچہ آپ کی دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا۔

فَاَسْتَجَبْنَا لَہٗ فَكَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ وَاَتَيْنٰہٗ اٰہْلَہٗ وَ مِثْلَہُمْ مَّعَہُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِندِنَا وَ ذُكِّرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۝

(۲۱/۸۴)

پس ہم نے اس کی پکار سُن لی اور جس دُکھ میں پڑ گیا تھا وہ دُور کر دیا۔ ہم نے اس کا گھرانہ (پھر سے) بسا دیا اور اس کے ساتھ ویسے ہی (عزیز و اقارب) اور بھی دے دیئے۔ یہ ہماری طرف سے اس کے لئے رحمت تھی اور یہ نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی عبودیت (حکومت و اطاعت) اختیار کرنے والے ہیں!

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تکلیف و مصیبت میں آپ کے متعلقین بھی آپ سے الگ ہو گئے تھے (اتفاقاً یا ارادۃً) اور جب یہ مصیبت کا زمانہ ختم ہوا تو تندرستی بھی ملی اور اس کے ساتھ بچھڑے ہوئے ساتھی بھی۔ سورۃ ص میں ہے۔

وَ اِذْ ذُکِّرْ عِبْدُنَا اٰیُوْبَ م اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ اِنِّیْ مُّسٰوِیُّ الشَّیْطٰنِ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ ۝

(۳۸/۴۱)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہمارے بندے یوٰب کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ ”(خدا یا!) مجھے سانپ نے ڈس کر سخت اذیت پہنچائی ہے (تو میری مدد کر!)“

اس مقام سے اس تکلیف کی وجہ معلوم ہو گئی جس کا ذکر سورۃ انبیاء کی مذکورہ حدیث میں آچکا ہے، یعنی آپ کو سانپ نے کاٹ لیا تھا اور اس کے زہر کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاج کے لئے آپ کو ایسے چشمے کا نشان دیا گیا کہ جہاں کا پانی اس قسم کے امراض کے لئے (اپنی معدنی اور کیمیائی اثرات کے لحاظ سے) دوائی کا حکم رکھتا تھا۔

اُنْ كُضِبِرْ جِلْدُكَ ۚ هَذَا مُغْتَسِلٌ مَّ بَاسٍ دُرِّ شَرَابٍ ۝ (۳۸/۴۲)

(ہم نے حکم دیا تھا) ذرا قسم بڑھا کر (تیز چلو) یہ نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا پانی موجود ہے (جو تمہاری تکلیف کے لئے دوا ہے)۔

اس کے بعد ان کے متعلقین کی بازیابی کا ذکر ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا

لِرُؤُوسِ الْأَلْبَابِ ۝ (۳۸/۴۳)

اور (دیکھو) ہم نے ان کا کنبہ انہیں (پھر سے) دے دیا اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی یہ ہماری

طرف سے (یاقوت کے حق میں) رحمت تھی اور عقل والوں کے لئے نصیحت ہے!

”اہل“ کے معنی کنبہ کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور جماعت کے لوگ بھی ”مثلہم معہم“ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے لوگ ہی تھے، یعنی پرانے ساتھی مل گئے اور ان کے مثل ان کے ساتھ اور بھی۔ اگلی آیت میں ہے۔

وَحُذِرْ بِمِثْلِكَ ضَعْفًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنُفْ ۖ إِنَّا وَحَدَّثُهُ

صَابِرًا ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ (۳۸/۴۴)

لے شیطان معنی سانپ کے لئے ”ابلیس و آدم“ میں شیطان کا عنوان دیکھئے۔

لے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے پاؤں کو پانی میں اچھی طرح ہلاؤ۔

تے حنث کے معنی دوسری جگہ یوں آتے ہیں۔

وَكَاؤُا يُصْرُونَ عَلَى الْجَنَّتِ الْعَظِيمِ ۚ (۵۶/۴۶)

اور (دیکھو) وہ لوگ بہت ہی بڑے گناہ (شرک و کفر) پر اصرار کیا کرتے تھے۔

اور ہم نے حکم دیا تھا کہ) اپنے ہاتھ میں (بتائی ہوئی) شاخوں کو مٹھا لو اور اس سے (مقامِ  
ماؤف) کو مارو۔ مگر (یاد رکھو) شرک میں نہ پڑ جانا۔ بلاشبہ ہم نے یٰقوب کو (بڑا ہی) صابر  
پایا۔ وہ کتنا اچھا بندہ تھا۔ درحقیقت وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع ہونے والا تھا!

اس آیت کی تفسیر میں طرح طرح کی روایات بیان کی گئی ہیں، جن کا ماخذ تورات کے افسانے  
ہیں۔ قرآن نے تو صرف اتنا بتایا ہے کہ حضرت یٰقوب سے کہہ دیا تھا کہ جاہل لوگ سانپ کے  
کاٹے کا علاج جھاڑ پھونک اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا سے کرتے ہیں۔ یہ شرک ہے۔ تم اس قسم  
کی کوئی بات نہ کرنا خواہ تمہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ اس کا علاج جڑی بوٹیوں سے ہوگا۔ ان  
بوٹیوں کو لو اور انہیں زخم پر رگڑو۔ چنانچہ حضرت یٰقوب نے نہایت استقامت سے اس تکلیف کو  
برداشت کیا اور شرک نہ جھاڑ پھونک کی طرف مائل نہ ہوئے بلکہ مستقل مزاجی سے اس کا علاج  
کرتے رہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ کونسی اتنی بڑی بات تھی جس کے لئے قرآن نے اس قصے کو بیان  
کیا؟ یہ ٹھیک ہے کہ آج یہ بات کچھ اتنی بڑی نظر نہیں آتی لیکن اُس زمانے میں جس کا ذکر  
ہو رہا ہے، یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ تو ہم پرستی کا دور تھا جس میں انسان قدمِ  
پر حقیقت کو چھوڑ کر خرافات کی طرف جھک جاتا تھا۔ اُس دور میں خدا کا جو بندہ، تکلیف برداشت  
کرتے لیکن توہم پرستیوں کی طرف مائل نہ ہونی واقع بہت بڑا انسان تھا۔ اس اعتبار سے قرآن نے حضرت  
یٰقوب کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (ہم نے اسے مستقل مزاج پایا) نَعْمَ الْعَبْدُ (کتنا  
اچھا تابع فرمان) اِنَّهٗ اَوْْدَابٌ (بہر تکلیف اور مصیبت میں خدا کی طرف رجوع کرنے والا)۔ یہ تھے حضرت یٰقوب۔  
تورات اور اس کے تتبع میں ہمارے ہاں کے اکثر مفسرین نے اس باب میں کیا کیا رنگ آمیزیاں کی ہیں ان کی  
تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ مختصر یوں سمجھئے کہ (کہا جاتا ہے کہ) اس تکلیف کے دوران میں آپ کی  
بیوی نے شیطان کے ورغلانے سے آپ کی طبیعت شرک کی طرف مائل کرنا چاہی جس سے آپ نے غضبناک ہو  
کر قسم کھائی کہ اگر میں تندرست ہو گیا تو تمہیں سولہ گزیاں ماروں گا۔ بیوی بھی صادق الایمان۔ اللہ تعالیٰ نے  
آپ کو قسم پورا کرنے کے لئے (معاذ اللہ) یہ حیلہ بتایا کہ سوتنکے لے کر ان کی جھاڑو بنادو اور



اس سے بیونی کو یونہی چھو دو، بات پوری ہو جائے گی۔ لیکن یہ محض مفتریات و منترعات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

---

قرآنِ کریم میں حضرت یونس کا ضمنی ذکر (۶/۸۵) اور (۴/۱۶۳) میں بھی آیا ہے۔

---

فَتَنَاخَلُ الظَّالِمِينَ لِرَآلِهِ اَلَا اَنْتَ بِمُحْسِنٍ ۝۶۷ ۝۶۸

# عزم یوسی

زندگانی ہے صد قطرہ نیساں ہے خودی  
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کرنے کے  
ہوا اگر خود نگر و خود گرو خود گیر خودی  
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنے کے

# حضرت یونس علیہ السلام

## مصدق م

یہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا جو عربی میں آکر یونس ہو گیا۔ تورات میں ان کا نوشتہ "کتاب یوناہ" بھی موجود ہے۔ مشدق م کے قریب ان کا زمانہ قیاس کیا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر جن اقوام و ملل کے حالات ہمارے سامنے آئے ہیں ان کا انداز یہ تھا کہ خدا کا رسول انہیں ان کے اعمال کے نتائج و عواقب سے ڈراتا۔ لیکن وہ صحیح راستہ اختیار کرنے کی بجائے سرکشی اور تکبر اختیار کرتے اور اللہ کے اٹل قانون کے ماتحت ان کے اعمال کے نتائج عذاب الہی بن کر ہلاک و برباد کر دیتے لیکن حضرت یونس کے تذکرہ میں ہمیں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ یعنی آپ نے قوم کو آگاہ کیا اور کہہ دیا کہ خدا کا عذاب اب آنے ہی والا ہے۔ اس پر قوم نے فوراً اپنی روش کو بدل لیا اور سرکشی و معصیت کاری کے بجائے عجز و نیاز سے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ شان کریمی نے ان کے عرقی انفعال کو موتی سمجھ کر چن لیا اور عذاب مبتدل بہ رحمت ہو گیا۔

**تورات کا بیان** | صحیفہ یوناہ میں ہے کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی سے حکم ملا کہ جا کر نینوا کے باشندوں کو ان کے اعمالِ بد کے نتائج سے ڈرائیں اور عذابِ خداوندی کی تنذیر پہنچائیں۔ نینوا اس زمانہ میں تہذیب و تمدن اور قوت و حشمت کا گہوارہ تھا۔ آپ اس عظیم الشان ہم کے تصور سے گھبرائے۔ (یہ تو اس کا بیان ہے) اور یا قاف سے ایک جہاز میں سوار ہو کر (نینوا کے بحیرے) ترسیس کی طرف چل دیئے۔ راستہ میں جہاز کو طوفان نے آ پکڑا۔ اس زمانہ میں ملاحوں کا عقیدہ تھا کہ

ایسے طوفان کے وقت کشتی میں کوئی نہ کوئی گنہگار موجود ہوتا ہے۔ جب تک اسے کشتی سے نکال نہ دیا جائے طوفان نہیں ٹھہرتا۔ چنانچہ مسافروں نے قرعہ اندازی شروع کی کہ کسے حوالہ دیا گیا جائے۔ حضرت یونسؑ نے سنا تو خود ہی اپنے جی میں خیال کیا کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون گنہگار ہوگا جو (معاذ اللہ) خدا سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے؟ آپ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ادھر قرعہ اندازی کا فیصلہ بھی آپ ہی کے متعلق ہوا۔ ملاخوں نے آپ کو سمندر میں ڈال دیا، جہاں آپ کو ایک مچھلی نگل گئی۔ آپ تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد اس نے آپ کو ساحل پر اگل دیا۔ اس حادثہ کے بعد آپ کو پھر نینوا جانے کا حکم ہوا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر اعلان کر دیا کہ چالیس دن بعد خدا کا عذاب آجائے گا۔ یہ سن کر باشندگان نینوا نے سرکشی و عصیت کے بجائے خدا کے حضور تذل اور تعبد کا اظہار شروع کر دیا اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک اللہ کے در سے کاپننے لگ گئے۔ اس سے ان کا عذاب ٹل گیا۔ لیکن یہ چیز حضرت یونسؑ پر گراں گزری کہ خدا کی طرف سے ایسی (وعدہ خلافی) کیوں ہوئی؟ وہ شہر سے باہر ایک چھتر بنا کر بیٹھ گئے۔ رینڈی کے درخت کی شاخیں ادھر ادھر پھیل گئیں۔ لیکن ایک مرتبہ اس کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا۔ صبح اُٹھ کر آپ کیا دیکھتے ہیں کہ درخت کے پتے سب خشک ہو چکے ہیں، آپ کو اس پر بہت رنج ہوا۔

تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اُس رینڈی کے درخت پر رحم آیا جس کے لئے تو نے کچھ محنت نہ کی اور نہ تو نے اُسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا۔ اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں جو اپنے دہنے بائیں ہاتھ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے اور مواشی بھی بہت ہیں شفقت نہ کروں؟ (یوناہ نبی ۱۰-۱۱/۴)

یہ تو رات بیان تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے قصہ حضرت یونسؑ کو کس انداز میں بیان کیا ہے۔ سورہ صافات میں ہے۔

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۖ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُونِ (۱۳۹-۱۴۰)

اور (دیکھو) یونسؑ بھی (ہمارے) فرستادہ پیغمبروں میں سے تھا۔ (یاد کرو) جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف لپک کر گیا تھا۔

اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ آپ (معاذ اللہ) خدا کے حکم کی تعمیل سے جی بڑا کر جھاگ نکلے تھے۔ قرآن کریم کی رو

سے اللہ کے ایک رسول کے متعلق ایسی بات کا تصور بھی کفر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سورۃ انبیاء میں آپ کے دشمنانک ہونے کا ذکر آیا ہے۔

وَذَا النُّونِ إِذْ ذُهِبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ۚ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۸۴-۸۸/۲۱)

اور (اسی طرح) ذالنون (کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنی قوم کی روش سے تنگ آکر غصہ کی حالت میں وہاں سے چل دیا (حالانکہ ہم نے ابھی اُسے ہجرت کا حکم نہیں دیا تھا۔ چونکہ اس کا وہاں سے چل دینا خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھا اس لئے اسے اس کا خیال تک بھی نہ تھا کہ اس سے اس کا کوئی مواخذہ کیا جائے گا۔ لیکن وہ اپنے غلط پروگرام کی وجہ سے مشکلات میں گھر گیا تو اس نے ہمیں پکارا اور عرض کیا کہ ہا ہا الہا! تیرے سوا کوئی حاکم نہیں۔ تیرے فیصلے پر نقص سے پاک ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اپنے اوپر بڑا ہی) ظلم کیا!

تب ہم نے اس کی پکار سُن لی اور غمگینی سے اُسے نجات دی (دیکھو ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں!)

ہم یہ دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول پہلے اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے باوجود یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ قوم صحیح راستے کی طرف نہیں آرہی تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس مقام کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کے متعلق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اس دعوت کے لئے فضا زیادہ سازگار ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس نے جب دیکھا کہ قوم اپنی سرکشی اور مخالفت سے باز نہیں آتی تو وہ قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے لئے چل نکلے۔ ابھی خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ ان کا یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں تھا اس لئے انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان کا یہ فیصلہ خدا کی نارضا مندی کا موجب ہوگا۔ لیکن جب انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو اس کا احساس ہوا کہ میں نے یہ فیصلہ خدا کے حکم سے پہلے ہی کر لیا اس لئے یہ منشاءے ایزدی کے مطابق نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے معافی چاہی۔

واقعہ کی دوسری کڑیاں سورۃ الصَّفَّت کی آیات (۱۴۰ — ۱۴۸/۳۷) میں بیان ہوئی ہیں۔ انہیں ہم مفہوم القرآن سے درج کرتے ہیں۔

(لیکن اس سے ذرا سی اجتہادی غلطی ہو گئی۔ وہ قوم کی مخالفت سے سخت گھبرایا اور بیشتر اس کے کہ اسے خدا کی طرف سے ہجرت کرنے کا حکم ملتا) وہ اپنے فرائض منصبی کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گیا اور دریا پار کرنے کے لئے 'دوسری سواریوں کے ساتھ' ایک کشتی میں بیٹھ گیا۔ (۲۱/۸۷)

(یہ اس کی طرف سے ہمارے قانون کے خلاف دانتہ سرکشی نہیں تھی۔ لیکن) یہ حال تھا تو ہمارے قانون کے خلاف۔ یوں اس سے یہ لغزش سزا دہو گئی۔

کشتی میں بوجھ زیادہ تھا۔ وہ ڈوب گئی اور یونس کو ایک بہت بڑی مچھلی نے منہ میں ڈبوچ لیا۔ وہ اس مصیبت کو دیکھ کر اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ وہ جو 'خدا کی اجازت کے بغیر' قوم کو چھوڑ آیا ہے، یہ اس کی سزا ہے۔

لیکن اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، انتہائی جدوجہد کی اور مچھلی کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

اگر وہ ایسا نہ کرتا اور بہت اچھا تیراک نہ ہوتا تو مچھلی اسے نگل لیتی اور پھر وہ قیامت تک باہر نہ آ سکتا۔

ہم نے اُسے دریا کے کنارے کھلے میدان میں ڈال دیا (۲۸/۴۹)۔ لیکن اس کشمکش اور دہشت کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔

اس نے ایک بڑے بڑے پتوں والے پودے کے سائے میں جا کر آرام کیا تو اس کی حالت سنبھلی۔

اور ہم نے اسے پھر اس کی قوم کی طرف بھیج دیا (وہ بہت بڑی قوم تھی) جس کی تعداد ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔

وہ لوگ ہمارے قانون پر ایمان لے آئے تو ہم نے اُسے 'ایک مدت معینہ تک' زندگی کے ساز و سامان سے نوازا۔ (اس قوم نے ایمان لے آنا تھا۔ یونس نے جلد بازی سے کام لیا جو ان سے یایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم اس وقت ملا کرتا ہے جب اس قوم

میں حق و صداقت کی قبولیت کا امکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے وہاں سے چلے جانا گویا اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی یونس کی اجتہادی غلطی تھی۔ (مفہوم القرآن ۱۳۸-۱۴۰/۳۷)

**اہل نینوا کی دوبارہ سرکشی** | چنانچہ اہل نینوا اس وقت تو خدا کے عذاب سے محفوظ ہو گئے، لیکن کچھ عرصہ بعد قریب ۶۹۰ ق م میں انہوں نے پھر وہی شیوہ سرکشی اختیار کر لیا اور نبی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں لیکن یہود کی روایات میں ملتا ہے) انہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا۔ وہ باز نہ آئے تو اس کے قریب ستر برس بعد اہل بابل نے ان پر حملہ کیا۔ ادھر سے وہ جہ میں سیلاب آیا اور اس سے نینوا کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ سورہ یونس میں واقعہ ہلکت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا اٰمَنُوا  
كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنَاهُمْ رٰحَةً  
حَتّٰى ۝ (۱۰/۹۸)

پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونس کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ (نزول عذاب سے پہلے) یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے سوائے کادہ عذاب اُس پر سے نال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور ایک خاص مدت تک مرسلمان زندگی سے بہرہ مند ہونے کی ہلکت دے دی۔

آیت (۲۱/۸۷) میں آپ کا ذکر ذالنون (مچھلی والا) کے لقب سے آیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر آپ کو صاحب حوت (مچھلی والا) کہا گیا ہے (۶۸/۲۸)۔ ضمنی طور پر حضرت یونس کا تذکرہ (۴/۱۴۳) اور (۶/۸۷) میں بھی آیا ہے۔



# پنکھڑیاں

ان حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، قرآن کریم میں تین اور رسولوں کا اجمالی ذکر آتا ہے جن کی تفصیل معلوم نہیں۔ اول حضرت ادریسؑ۔

**حضرت ادریسؑ** | سورۃ مریم میں ہے۔  
وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِذْ يٰسَىٰ زَاثَةُ كَانَ صِدِّيقًا

يٰسَىٰ ۙ وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝ (۱۹/۵۴-۵۵)

اور (اسے پیغمبر!) کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کر۔ بلاشبہ وہ بھی محترم سچائی اور نبی تھا اور ہم نے اسے بڑے ہی اونچے مقام تک پہنچا دیا تھا۔

اور سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَ اِسْمٰعٰیْلَ ۙ وَ اِذْ يٰسَىٰ وَ اِذْ اِلْكُفْلَ ۙ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۲۱/۸۵)

اور (اسی طرح) اسمعیل، ادریس، ذوالکفل، سب (راہ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے کا ہے اور آپ کا نام تورات میں حنوک یا اخنوع ہے۔ اگر آپ اخنوع ہی ہیں تو پھر آپ حضرت نوحؑ کے اجداد میں چوتھی پشت پر آتے ہیں۔ کیونکہ تورات نے حضرت نوحؑ کا نسب نامہ (حضرت) نوحؑ بن ملک، بن متوشلح، بن حنوک لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو

باب پیدائش ۲۱ — ۵/۲۹)۔



دوسرے حضرت الیاسؑ سورۃ النعام میں ہے۔

وَذَكِّرْنَا ذَا يَحْيٰى وَ عِيسٰى وَ الْيَاسَّ ۝ كُلُّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۸۵)

اور ذکر کیا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو کہ یہ سب صالح انسانوں میں سے تھے۔

اور سورۃ صافات میں ہے۔

وَ اِنَّ الْيَاسَّ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝  
اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ۝ اللّٰهُ رَبُّكُمْ وَ  
رَبُّ اَبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاتَّهُمُ لِحَضَرُوْنَ ۝ اَلَا  
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ۝ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلَمٌ  
عَلٰى الْيَاسِيْنَ ۝ (۱۲۳ - ۱۳۰/۱۳۴)

اور بلاشبہ الیاس بھی خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے تھا۔ (یاد کرو) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا (لوگو!) کیا تم خدا سے ڈرتے نہیں؟ کیا تم بعلؑ کو تو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو (یعنی) خدا کو جو تمہارا اور تمہارے پہلے آباء و اجداد کا پروردگار ہے (چھوڑ دیتے ہو؟) مگر انہوں نے الیاس کو جھٹلایا۔ پس بلاشبہ وہ ضرور (عذابِ آخرت میں) پکڑے جائیں گے، سوائے خدا کے غلصہ بندوں کے۔ اور ہم نے بعد کے آنے والوں میں اس کا ذکر خیر چھوڑ دیا۔ الیاس پر خدا کی طرف سے سلامتی ہو۔

قیاس یہ ہے کہ آپ وہی ہیں جن کا نام تورات میں اِلیاسی آیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ادریسؑ ہی کا دوسرا نام الیاسؑ ہے لیکن اگر حضرت ادریسؑ حضرت نوحؑ کے اجداد میں سے ہیں تو آپ حضرت الیاسؑ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ جیسا کہ آیت (۸۵ - ۹۶/۸۶) سے واضح ہے قرآن کریم نے آپ کو حضرت نوحؑ کی ذریت میں بتایا ہے۔ آپ غالباً انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہی ہیں۔

تیسرے حضرت ذوالکفلؑ سورۃ انبیاء میں ہے۔

**حضرت ذوالکفلؑ** ۱۱ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِذْرِیْسَ وَ ذَا الْکِفْلِ ۝ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۸۵/۲)

اور (اسی طرح) اسماعیلؑ، ادریسؑ اور ذوالکفلؑ سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔

لے بعل کے نفی معنی قوت و تسلط کے ہیں۔ یہ سامی قبائل میں سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام میں بالخصوص اس کی پرستش ہوتی تھی۔ تورات میں اس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ (مثلاً دیکھئے تواریخ ۱۲/۳۲)

دوسری جگہ ہے۔

وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ط وَ كُلُّ مِّنَ الْاَخْيَارِ (۳۸/۳۸)

اور (اے پیغمبر!) کتاب میں اسمعیل، الیسع اور ذاکفل کا ذکر کرو اور (دیکھو) یہ سب کے سب نیک لوگوں میں سے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔

گذشتہ سطور میں ان انبیائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قوموں کا حال ہنوز پتہ اخفا میں ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے دو تین ایسی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کی طرف مبعوث شدہ پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن جن کی ہلاکت اور بربادی، اسی قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت واقع ہوئی جو اپنے نتائج میں اٹل اور گرفت میں محکم ہے ان میں سے ایک اصحابِ شیع ہیں۔ سورۃ ق میں ہے۔

**قومِ شیع** اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ ثُبَيْع ط كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعْدِیْ (۵۰/۱۴)

اور گھنے جنگل والے اور قومِ ثُبَیْع بھی (ان ہی سرکش لوگوں میں سے ہیں) ان میں سے ہر ایک نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا، جس کے نتیجے میں ہماری وعید کے مستحق ہو گئے!

دوسرے مقام پر (سورۃ دخان) میں قریش کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ قوت و سطوت میں بڑھے ہوئے ہیں یا اصحابِ شیع جن کی بربادی پر یہ خود شاہد ہیں۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ ثُبَيْع لَا وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط اَهْلَكْنٰهُمْ اِنْهٰمْ کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ (۴۴/۲۷)

(قوت و سطوت کے اعتبار سے) وہ (قریش) بہتر ہیں یا قومِ ثُبَیْع اور وہ قومیں جو اس سے بھی پہلے گزر چکی ہیں؟ (سب کو معلوم ہے کہ) ہم نے انہیں سب کو ہلاک کر دیا۔ بلاشبہ وہ تھے ہی بڑے مجرم لوگ! (پھر قریش کو ہلاک کر ڈالنا ہمارے لئے کونسا مشکل ہے؟)

اصحابِ شیع کون تھے؟ تذکرہ حضرت سلیمان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مین کے مشرقی علاقہ میں سببا کی حکومت تھی۔ اسی قوم کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے حمیڈ کہتے ہیں۔ جب رومیوں

نے اہل سبائی تجارت کو مٹایا ہے تو عمیر کا ستارہ اقبال چمک اٹھا اور بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب شُبَّح اختیار کیا جس کے معنی حبشی زبان میں سلطان کے ہیں، یعنی غلبہ و استیلا اور قوت و جبروت کا مالک۔ یہ خاندان بھی اہل سبائی کی طرح شروع میں کو اکب پرست تھا۔ اس کے بعد یہودیت اور عیسائیت نے اپنا دامن اثر پھیلانا شروع کیا۔ بخران کے شہر میں عیسائیت نے فروغ پایا۔ لیکن چونکہ اہل شُبَّح کو رومیوں (اور حبشیوں) سے سخت محاصرت تھی اس لئے انہوں نے عیسائیت کے مقابلہ میں یہودیت کو ترجیح دی اور ملک میں عام طور پر یہودیت پھیل گئی رومی قیصر جُسٹین نے شُبَّح یمن کے دربار میں اپنا قاصد بھی بھیجا تھا تاکہ ان سے مراسم صلح و مودت قائم رکھے جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عیسائی پادریوں (راہبوں) کی ایک جماعت بھی ”سیح کی منادی“ میں مصروف عمل تھی۔ شُبَّح ذونو اس زمانہ میں یمن کا حاکم تھا۔ چونکہ بخران عیسائیت کا مرکز تھا اس لئے اس نے عیسائی راہبوں کی تبلیغ سے مشتعل ہو کر بخران پر حملہ کر دیا۔ پہلے تو اہل شہر قلعہ گزیں ہو گئے لیکن بالآخر شکست کھائی۔ ذونو اس کا تعصب، بربریت تک اُتر آیا۔ اُس نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ روشن کی اور عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ یہودیت قبول کریں۔ جو اس سے انکار کرتا تھا آگ کے گڑھے میں جھونک دیا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے ذونو اس اور اس کی جماعت کو اصحاب الاخدود (گڑھوں والے) کہا ہے۔

**اصحاب الاخدود** قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْاُتُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَ هُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُوْنَ

بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُُوْدٌ ۝ وَ مَا تَقْمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ضُطُّ وَ اَمْلُهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شٰهِدٌ ۝ (۴-۸۵/۹)

(دیکھو) خندقوں والے، یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے (جو انہوں نے خندقوں میں روشن کر رکھی تھی) تباہ کر دیئے گئے۔ (یاد کرو) جب وہ اُس آگ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والے بندوں کے ساتھ (ظلم و ستم) کر رہے تھے اسے خوب اچھی طرح دیکھ رہے (اور سمجھ رہے) تھے۔ اور وہ ان مومنوں پر بجز اس کے کوئی حرف گیری نہیں کر سکے تھے کہ وہ اُس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو (بڑا ہی) زبردست اور (ہر طرح) قابل تعریف ہے۔ ایسا خدا جسے

آسمانوں اور زمین کی سلطنت و حکومت حاصل ہے اور (یاد رکھو) اللہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے (اس لئے کوئی بھی مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکتا)۔

ذرا قرآنِ کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ دامانی پر غور کیجئے۔ عیسائیوں پر مظالم ہو رہے ہیں اور قرآنِ کریم انہیں اس طرح اپنے آغوشِ رافت و محبت میں لے کر ان کا تذکرہ کرتا ہے جیسے بالکل اپنے ہوں اور اپنے ہونے میں شبہ بھی کیا تھا؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ تمام انبیاءِ کرام اور ان کے ماننے والی جماعتیں ایک ہی سلسلۃ الذہب کی مختلف کڑیاں تھیں۔ اس لئے قرآنِ کریم، نزولِ قرآن سے پیشتر انہیں بھی مومن قرار دیتا ہے۔ یہ تو ان قوموں کا تعصبِ بجا ہے جو قرآن اور اس کے حامل (نبی اکرمؐ) کو اپنے سے غیر سمجھ رہے ہیں جو اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اگر وہ جماعتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں تو بدستور مومن رہتیں۔ لیکن حضور کی رسالت کے انکار سے انہوں نے اپنے آپ کو نہ ماننے والوں (کفار) کے زمرہ میں شامل کر لیا اور یہ نہ سمجھے کہ خدا کی طرف سے ایک نئے رسولؐ (اور جدید کتاب) آ جانے کے بعد، پہلے رسولوں (اور کتابوں) پر ایمان اسی صورت میں صحیح قرار پاسکتا ہے جب اس نئے رسولؐ (اور کتاب) پر ایمان لایا جائے کہ یہ رسول بھی اسی خدا کا فرستادہ اور یہ کتاب بھی اسی اللہ کا نازل فرمودہ ہے جس نے اس سے پیشتر رسولوں اور کتابوں کو بھیجا تھا۔

اس کے علاوہ نجران کے ان مصیبت زدہ عیسائیوں کا ذکر اس لئے بھی اس انداز میں کیا گیا ہے کہ وہ مظلوم تھے اور قرآن، دنیا میں ہر مظلوم کا حامی ہے خواہ وہ کسی قوم اور کسی مذہب سے متعلق ہو (لیکن ظلم کسے کہتے ہیں اور مظلوم کون ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بھی قرآن ہی کی میزان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے)۔ واضح رہے کہ آیات (۴ - ۸۵/۹) میں خود قریش کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جو جماعتِ مومنین کے خلاف جنگ کے لئے خندق میں کھود رہے تھے (ہم نے مفہوم القرآن میں یہی مفہوم لیا ہے اور موجودہ مفہوم تاریخی روایات کی رو سے لیا گیا ہے)۔

اصحاب الرس کا ذکر قرآنِ کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک سورۃ

اصحاب الرس

فرقان میں :-

وَ عَادًا وَ ثَمُودًا وَ اَصْحَابَ الرَّسِّ وَ قُرُونًا بَيْنَ ذَلِكَ كَثِيرًا (۳۸/۴۵)

اور (دیکھو) ہم نے عاد و ثمود اور اصحاب الرس اور ان کے درمیان میں بہت سی نسلوں (اور قوموں) کو ہلاک و برباد کر دیا ہے۔

اور دوسرے سورہ ق میں ہے۔

كُذِّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ أَصْحَابُ الرَّسِّ وَ ثَمُودُ ۝ (۵۰/۱۲)

(اور اے پیغمبر! ان اقوام عرب سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور قوم ثمود بھی اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں) پس یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم ان کے افکار پر دل گرفتہ نہ ہو۔

حضرت اسمعیلؑ ارض حجاز میں آکر متمکن ہوئے تھے۔ آپ کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے خاندانوں کے رئیس تھے۔ ان میں سے ایک کا نام قیس مدماہ تھا۔ اصحاب الرس انہی کی اولاد میں سے قیاس کہتے جاتے ہیں۔

**اصحاب الحجر** | اصحاب الحجر کا ذکر قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر آیا ہے۔  
وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۱۵/۸۰)

اور بلاشبہ اصحاب حجر نے بھی (خدا کے بھیجے ہوئے) رسولوں کو جھٹلایا ہے۔

حضرت اسمعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام نبایط تھا۔ ان کے خاندان کو بنط (جمع انباط) کہا جاتا ہے۔ شام و عرب کے حدود پر ان کی حکومت کے آثار ملتے ہیں۔ تورات میں (مزقیل نبی کے صحیفہ میں) بنط کا ذکر آیا ہے۔ پہلے ان کا دار السلطنت ریم تھا لیکن جب اس پر رومیوں نے قبضہ کر لیا تو وادی القرظی میں دوسرے شہر حجر کی طرف منتقل ہو کر آ گئے۔ اسی نسبت سے انہیں اصحاب الحجر کہا گیا ہے۔ ایسی عظیم الشان سلطنت کے مالک رفتہ رفتہ رومیوں کی محکومیت میں آ گئے۔ اور محکومی اور غلامی کا یہی وہ عذاب ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے کہ محکومی سے بڑھ کر انسانیت کی میزان میں اور کوئی عذاب رُسوا کن اور جاں گداز نہیں ہو سکتا۔ جب اسلام کا ظہور ہوا ہے تو اس قوم کے منتشر افراد شام کے گرد و نواح میں غلہ فروشی کرتے نظر آتے تھے۔ چونکہ ان کے عروج و زوال کا گہوارہ خود عربوں کی سرزمین تھی اس لئے قرآن کریم نے عبرت و موعظت کے صفحات پر ان کے مٹے ہوئے نقوش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ چونکہ ان سے بہت پہلے قوم ثمود کا مرکز بھی حجر کا شہرہ چکا ہے اس

لئے مؤرخین کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت میں اصحابِ الحجر سے مراد قوم ثمود ہی ہے لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ ان سے مراد قوم نبط ہی ہے جس کے عروج و زوال کی داستانیں آج بھی حجر کے کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش ملتی ہیں۔

**ایک اہم ضمنی گوشہ** زیرِ نظر عنوان کے مختصرات کے متعلق کسی تصریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اس مقام پر ایک چیز سامنے آگئی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے۔ مغرب کے مستشرقین نے جب دیکھا کہ جہاں تک قرآنی تعلیم کا تعلق ہے اس پر صحیح اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں، تو انہوں نے قرآن کے خلاف اعتراض کی ایک اور راہ نکالی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے بیان کردہ بعض قصص و واقعات تاریخی طور پر قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ فلاں نبی کا تاریخ میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ فلاں واقعہ کی تاریخی حیثیت محلِ نظر ہے و قس علیٰ ہذا۔ اس سے ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآن سے متعلق دلوں میں شکوک و ارتیاب کے کانٹے بودیئے جائیں اور اس طرح یہ خیال عام کر دیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) سنی سنائی باتوں کو الہامی کہہ کر پیش کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کے متعلق ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا ہو جائے کہ اس کے ”مصنف“ خود نبی اکرمؐ ہیں تو دین کی پوری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ اس لئے کہ یہ عمارت استوار ہی اس بنیاد ہے کہ قرآن منزلِ من اللہ ہے، کسی انسان کی تصنیف نہیں۔ اس مذہب کو شش کی ابتداء مغرب کے بعض مستشرقین سے ہوئی اور اس کے بعد ان کی نقالی میں ہندوستان کے بعض ایسے گوشوں سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی جو اپنے آپ کو ”مسلمان“ کہلانے کے باوجود اسلام کے ان بدترین دشمنوں کے آلہ کار و نفیر بننے میں فخر و سعادت محسوس کرتے ہیں اور اس قسم کے اعتراضات کی اشاعت سے عوام پر اپنی تجدد پسندی، روشن خیالی، تحقیقاتِ علمی اور دقتِ نظر کا رعب جمانا چاہتے ہیں۔ قرآن علم و یقین کا پیغامبر ہے اس لئے اسے علم و یقین کے ترازو میں ٹلنے سے ذرا بھی تاثر نہیں۔ وہ سہ تاپا حق ہے۔ اس لئے اسے حق و صداقت کی کسی محفل میں آنے سے جھجک نہیں۔ وہ عین حقیقت ہے اس لئے اسے علمی تحقیقات کی کسوٹیوں پر پرکھے جلنے میں ادنیٰ سا تکلف بھی نہیں۔ ہمیں اس پر ذرا بھی اعتراض نہیں کہ دنیا بھر کے محقق اس کے ایک ایک

دعوے کو تحقیق کے کانٹے میں تولیں اور تنقید کی میزافوں میں پرکھیں۔ وہ تو خود تمام نوع انسانی کو چیلنج دیتا ہے کہ آؤ اور میری مثل و نظیر کچھ پیش کرو!! وہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میری دعوت، جہالت اور توہم پرستی کے آئندہ عقیدوں پر مبنی نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ہمارے لئے اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے کہ قرآن کے دعاوی کو علمی معیاروں پر کیوں پرکھا جا رہا ہے؟ لیکن جس چیز پر ہمیں اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو علم کے معیاروں پر پرکھتے، قیاسات کی ترازوؤں میں نہ تولتے۔ اسے ہر اس علمی تحقیق کے مقابل میں لائیں جو یقین کا درجہ حاصل کر چکی ہو۔ لیکن ظن و قیاس کو حق و یقین بتا کر عوام کو دھوکا نہ دیجئے۔ یہ روش 'علم کے بازار میں دیانتداری نہیں کہلا سکتی'۔

اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کے بیان کردہ فلاں واقعہ کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا، یعنی ان معترضین کے پاس قیاس کی میزان ہے جسے انہوں نے 'دھرم کا نٹا' تصور کر رکھا ہے اور جو چیز اس میزان میں پوری نہیں اترتی وہ ان کے نزدیک ساقط الاعتبار اور ناقابل یقین ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعوے کا ثبوت کیا ہے کہ تاریخ نے اپنی تحقیقات کی تکمیل بھی کر لی ہے اور ہر تحقیق کو یقین کا درجہ بھی مل چکا ہے؟ یعنی یہ ماضی میں جو کچھ ہو گزرا ہے ہماری تاریخ اس کے متعلق مکمل تحقیق کر چکی ہے اور اس کی تحقیق کے نتائج یکسر حتمی و یقینی قرار پا چکے ہیں۔ اس لئے اب نہ اس کی تحقیقات کی فہرست میں کسی اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اس کے نتائج مستخرجہ میں کسی تبدیلی کا امکان! ہمیں علم تاریخ کی اہمیت سے انکار نہیں۔ (جیسا کہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے)۔ قرآن کریم خود اس کی اہمیت پر زور دیتا اور اسے حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس 'اپنے زمانہ تک کے تاریخی نتائج کو مکمل اور غیر متبدل قرار دینے کا ثبوت کیا ہے؟ ازمنہ قدیمہ کے متعلق تاریخی تحقیقات کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) اگر آج سے ایک سو سال پیشتر کے کسی مغربی مؤرخ کی تاریخ کی کتاب اٹھا کر دیکھئے اور اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ اس ایک سو سال میں مزید تاریخی تحقیق اور اثری انکشافات کیا کیا نتائج سامنے لائے ہیں تو آپ حیران ہوں گے کہ ان مزید تحقیقات و انکشافات نے نہ صرف سابقہ نتائج پر اضافہ ہی کیا ہے بلکہ ان کی روشنی میں ان میں بہت سارے تبدیلی کرنا پڑا ہے۔ مصر، شام، عراق، فلسطین وغیرہ میں ان اثری انکشافات کی ابتدا ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس مختصر سے عرصہ میں ہی اتنا کچھ زمین سے اُبھر اُبھر کر سامنے آ گیا ہے جس نے تاریخی تحقیقات کا رخ بدل دیا ہے۔ کلدانیوں کے شہر آشور کے متعلق آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں ایسے ایسے انکشافات سامنے آئے ہیں جن سے

حضرت ابراہیمؑ کے کوائفِ حیات پر ایک نئے تاریخی زاویہ سے روشنی پڑتی ہے حالانکہ اس سے پیشتر خود مغرب کے تاریخی محققین میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے۔ بتل دویر کی کھدائیوں میں قدیم عبرانی زبان کے ایسے خطوط ملے ہیں جن سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ مصر کے تہ خانوں اور قدیم یہودی صومعوں کی کھدائی سے عجیب و غریب دفائن منقشہ شہود پراتے ہیں۔ الفسٹائن کے سفریات میں ارامی زبان کے بہت سے قدیمی ریکارڈ ملے ہیں جو خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ ابھی ان اثری انکشافات کی ابتدا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو زمین اپنے سینہ کے کیسے کیسے راز ہائے مہربانہ اگل کر رکھ دے گی۔ یَوْمَئِذٍ تُخَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۚ (۴-۹۹/۵)۔ انہی امور کے پیش نظر تاریخِ یہود کا مشہور عالم 'CECIL ROTH' اپنی کتاب 'A short history of the Jewish people' میں ان نقادانِ عہدِ حاضر کی تنقید پر بحث کرتا ہوا جو بائبل کے روایتی بیانات کو تاریخی حیثیت سے قابلِ اعتماد قرار نہیں دیتے، لکھتا ہے۔

عام عقائد کے برعکس، یہ ناقدانہ مسلک بھی تو کسی صورت میں منزہ عن الخطا نہیں۔ اس کے نتائج تو نسل بعد نسل بلکہ ہر سال بدلتے رہتے ہیں۔ اگرچہ تخریری تنقید بہت دور رس ہوتی ہے، لیکن ابھی تک (ازمنہ گزشتہ کے واقعات کے متعلق) یہ بھی کوئی ایسا بیان نہیں دے سکی جسے ساری دنیا تسلیم کر لے۔ عہدِ حاضر کے مؤرخین کی اکثریت تاریخی مآخذ کے متعلق نہایت غیر مؤثر مباحث میں الجھی رہتی ہے۔ دوسری طرف گزشتہ صدی کے انقلابی مسلک کے خلاف نہایت واضح ردِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ ان کے تنقیدی تجزیہ کی کمزوریاں بے نقاب کی جا رہی ہیں۔ مصریات اور متعلقہ علوم بتا رہے ہیں کہ بائبل کے بیانات کم از کم اس زمانہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں جس سے وہ واقعات متعلق ہیں۔ نیز اثری انکشافات، روایتی بیانات کے مدد و خطوط کی تائید کر رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۱)

لہ (DEAD SEA) کے (SCROLLS) نے جو حال ہی میں ملے ہیں، یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

لے چونکہ بائبل میں بہت سی تحریف ہو چکی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اثری انکشافات (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)



اور اہمی اثری انکشافات کا فن بھی اپنے عہد طفولیت میں ہے، اس لئے جو کچھ زمین سے برآمد ہوتا ہے اس کا صحیح مفہم اخذ کرنے کے لئے بھی بہت سے قیاسات سے مدد لینی پڑتی ہے جب رفتہ رفتہ (مزید علمی تحقیقات سے) یہ قیاسات یقینیات میں تبدیل ہوں گے تو موجودہ نتائج میں بھی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔ اسی بنا پر 'CECIL RDTH' دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

بعض نقادیہ بھی کہتے ہیں کہ (حضرت) موسیٰ کے حالات کے متعلق کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ ایسا باور کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہم یہ مان لیں کہ یہ ٹھیکریاں (جو آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے برآمد ہو رہی ہیں) کسی قوم کے حافظہ یا ازمنہ قدیمہ کے تحریری ریکارڈ سے زیادہ قابل اعتماد اور اہم ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ کسی زمانہ میں یہ دعویٰ کرنا کہ تاریخی تحقیقات اس قدر مکمل اور یقینی ہو چکی ہیں کہ ان پر نہ کسی اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ رد و بدل کا امکان حقیقت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ جو چیز ہمارے زمانہ کے تاریخی نتائج کے خلاف ہے یا تاریخ سے اس کی تائید میں شہادت نہیں ملتی وہ غلط اور ناقابل تسلیم ہے۔ ایک ایسا اعتراض ہے جو علم کے بازار میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ قرآن کریم کے جن تاریخی مقامات کو مغربی مستشرقین محل نظر قرار دیتے ہیں وہ عام طور پر انبیائے نبی اسرائیل سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہودیوں کی قدیمی تاریخ کے متعلق یورپ میں بہت کچھ چھان بین ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود ابھی حالت یہ ہے کہ ان کی تاریخ کے اکثر مقامات تاریخی کے پردہ میں چھپے ہیں مثلاً 'CECIL RDTH' اپنی تاریخ میں اکثر مقامات پر لکھتا ہے کہ:

”اس کے بعد آئندہ سالوں کی داخلی تاریخ کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔“ (ص ۵۴) یا

”یہودیوں کی اس عہد کی تاریخ کے متعلق ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“ (ص ۵۴) دس علی ہذا۔

لہذا قرآن کریم کے متعلق صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے اس کی تعلیم کو دیکھئے جس کی رُو سے یہ انسان کی انفرادی خودی کی تکمیل اور اس کے نظام اجتماعیہ کی تدوین کرتا ہے۔ غور و فکر کے بعد

(بقیہ فٹ نوٹ گذشتہ صفحہ سے) اس کی جزئیات کی تائید نہ کریں، محض موٹے موٹے واقعات کی طرف اشارہ کریں۔ لیکن قرآن کریم ہر طرح تحریف سے پاک ہے اس لئے اس کا حرف حرف ستر با علم و یقین ہے۔

یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ یہ تعلیم کسی انسان کے غور و تدبر کا نتیجہ نہیں بلکہ منزل من اللہ ہے۔ اس ایمان کے ساتھ آگے بڑھتے۔ اب رہا وہ حصہ جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے، سوان میں سے آپ کے زمانہ تک کی علمی تحقیق جن چیزوں کی تائید نہیں کر سکی، اس کے لئے انتظار کیجئے تاکہ مستقبل کی مزید تحقیق ان بیچ در بیچ گروہوں کو کھول دے۔ حَتَّىٰ يَتَّبِعَنَ لَهُمْ آيَةُ الْخُلُقِ (۵۳/۲۷)

اس مقام پر بعض حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ تاریخ کے متعلق یہ اندازِ نگاہ تو بڑا غیر علمی (unscientific) ہے کہ اُس بات کو صحیح اور یقینی سمجھا جائے جو قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عام علمی دنیا میں کسی تاریخی بیان یا انکشاف کی صحت و سقم کے پرکھنے کے معیار بھی عام علمی ہی ہو سکتے ہیں، لیکن جب ہم قرآن کے متعلق یہ ایمان رکھیں کہ یہ اُس خدا سے علم و خبر کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کے علم سے کوئی شے پوشیدہ نہیں، تو اس کے بعد تاریخی بیانات و انکشافات کی حیثیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اُس وقت قرآن ایک یقینی کسوٹی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس پر ظن و قیاس کا ہر مفروضہ پرکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ محورِ ابی کے قوانین کے متعلق ہماری تاریخ میں مختلف باتیں آتی ہیں، اگر کہیں ایسا ہو جائے کہ محورِ ابی کے یہ تمام قوانین کسی چٹان پر کندہ مل جائیں تو یہ چیز تاریخ کے تمام بیانات کے لئے یقینی معیار قرار پائے گی، ہمارے نزدیک قرآن حقائق و معارف کی ایک محکم اور یقینی چٹان ہے جو تمام قیاس اور ظنی بیانات کے لئے معیارِ صداقت کا کام دیتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو ایسا نہیں مانتے تو ان سے ہم یہ کہیں گے کہ آپ یہ بتائیے کہ اس وقت تک جن انکشافات یقینیات کا درجہ حاصل کر لیا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جو قرآن کے بیان کے خلاف جاتی ہو؟ سو جب اس وقت تک کے ہمارے تجربات قرآن کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں تو جو امور ابھی یقینیات کے درجے تک نہیں پہنچے ان کے متعلق ہمیں ایسا باور کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ جب وہ یقینی درجہ حاصل کریں گے تو وہ بھی قرآن کی صداقت کی شہادت بہم پہنچائیں گے۔ یہ اندازِ نگاہ عین علمی ہے۔ اس مقام پر ہم چاہتے تھے کہ ان مغربی معترضین کے سامنے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے احوال و کوائف بطور مثال پیش کر کے انہیں بتاتے کہ جن واقعات کو آپ یقینی قرار دے کر قرآنی تصریحات کو خلافِ حقیقت کہا کرتے تھے، خود آپ کے ہاں کی مزید تاریخی تحقیق نے انہیں کو نہ صرف مشکوک بلکہ وضعی قرار دے دیا ہے، لیکن چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات کے متعلق ہماری مستقل تصنیف الگ سامنے آرہی ہے، جہاں ہم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے، اس لئے ہم اس مقام پر تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ جو حضرات ان تفصیل سے

دل چسپی رکھتے ہوں وہ اس کتاب (شعلہ مستوی) کو ایک نظر دیکھ لیں۔ اس مقام پر ہم صرف دو کتابوں کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں جو اس موضوع پر حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک ہے MARCELLO CRAVERI کی کتاب 'THE LIFE OF JESSUS' اور دوسری ہے DR: H.J. SCHONFIELD کی تصنیف 'THE PASSOVER PLOT' آپ دیکھئے کہ ان کی تحقیق نے اُس دور کی تاریخ کے کتنے (مزعومہ) یقینیات کو خرافات ثابت کر دیا ہے۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کے جو واقعات ہنوز علمی تحقیق کے پھلنے میں چھانے جا رہے ہوں، انہیں ثابت شدہ حقائق تصور کر کے قرآنی تنقید کا معیار قرار دینا، علمی طرز تحقیق نہیں۔ ہمارا دعوے ہے کہ تاریخ کے جو واقعات علمی معیار کے مطابق ثابت شدہ قرار پا چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی اصلاً اور اساساً قرآنی بیانات کی تغلیط نہیں کرتا۔ اور نہ ہی ایسا کر سکے گا۔

---

فَقَرِ مَوْمِنٍ چیت؛ تسخیرِ چہا

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (۱۸/۹۵)

# ذوالقمرین

در قبائِ خسروی درویشِ زی

دیدہ بیدار و خدا اندیشِ زی!

## ذوالقرنین

داستانِ بنی اسرائیل کے آخری باب تک پہنچنے سے پیشتر ایک مستی کا تذکرہ سامنے لانا ضروری معلوم ہوتا ہے جو خدا کا رسول نہیں، لیکن چونکہ وہ ایک نیک بندہ ہے اور اس نے یہودیوں کی مظلومیت کے دور میں ہیکلِ سلیمانی کی بازیابی اور تعمیر نو میں مدد کی تھی، اس لئے قرآن کریم نے اس احسان کے بدلے میں اسے اپنی ابدیت کے آغوش میں جگہ دیدی ہے۔ یہاں پھر قرآن کریم کے سحابِ رحمت کی حدودِ فراموش و سعتوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ محض اس بنابر کہ اس نے مظلوموں کی حمایت کی ہے، ایک "غیر" کو کس طرح "اپنوں" کی صف میں کھینچ لاتا ہے، بغیر اور اپنے کا یہ فرق ہم نے دنیاوی نقطہ نگاہ سے لکھا ہے، ورنہ قرآن کے ہاں تو جیسا کہ ہم شروع سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں، اس باب میں معیار ہی جدا گانہ ہے!

**ذوالقرنین کون کھتا؟** | اس شخص کا لقب ہے ذوالقرنین (دو سینگوں والا)۔

ذوالقرنین سے کون مراد ہے؟ یہ سوال ایک زمانہ دراز سے مؤرخین اور مفسرین کی ذہنی کاوشوں کا محور اور ان کی قیاس آرائیوں اور نکاتِ آفرینیوں کا مرکز بنا رہا ہے لیکن زمانہ حال کے اثری مکتشفین کی سعی و کاوش سے کچھ ایسے نقوش اُبھر کر سامنے آئے ہیں جن سے بعض قیاساتِ یقینیات کی طرف رخ کئے نظر آ رہے ہیں اور ان کا اندازہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تفاسیل و خصوصیات ذوالقرنین کی طرف منسوب کی ہیں ان کا صحیح انتساب ایران کے اس شاہنشاہ کی طرف کیا جاسکتا ہے جسے یونانی مؤرخ سائرس، یہودی مؤرخ اور عرب کچھسرو کے نام سے پکارتے ہیں لیکن اتنی تحقیق و کاوش کے باوجود، یہ قیاس ابھی حقیقت کی صورت اختیار نہیں کر سکا ہو سکتا ہے کہ مزید اثری مکتشافات ان مدفون حقیقتوں سے مٹی کے اور تودے اٹھائیں اور وہ صورتیں جو قرنِ ہاقرن سے

خاک میں پنہاں چلی آرہی ہیں اور جنہیں کہیں کہیں شاعر کی چشم تصور لالہ و گل کی صورت میں متشکل دیکھ لیتی ہے، بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔ بہر حال اس وقت تک قیاسات کا رخ اسی سمت جا رہا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا کبوتر ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لئے قیامت صغریٰ تھا۔ بخت نصر کی وحشت و بربریت نے نہ صرف یروشلم کو تباہ و برباد اور اس کے مقدس ہیکل کو منہدم کیا بلکہ وہ یہودیوں کے بقیۃ السیف کو بابل کی طرف ہانک کر لے گیا جس طرح قصاب بکریوں کو مذبح کی طرف لے جاتا ہے۔ تورات میں مختلف انبیاء کے ان صحیفوں کو دیکھئے جن میں یہودیوں کی اس زہرہ گداز مصیبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔

**دانیال نبی کا خواب** | دل کا خون آنکھ میں کھینچ آتا ہے۔ لیکن عین اس انتہائی مایوسی اور اندوہناک تاریکی کے زمانہ میں ان میں سے بعض انبیاء کو اُمید کی کرن بھی دکھادی جاتی ہے اور انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ یہ مصیبت ابدی نہیں۔ اس کا خاتمہ ہو گا اور یہودی پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹیں گے۔ دانیال نبی کی کتاب میں ایک خواب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

بیشضر بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے ہاں مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی بعد اس کے جو شروع میں مجھے نظر آئی تھی اور میں نے عالم رویا میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے۔ پھر میں نے رویا کے عالم میں دیکھا کہ میں دانی کی ندی کے کنارے ہوں۔ تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ ادبچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا۔ میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ کچھ اتر دھن کی طرف سینگ مارتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ ہو سکا۔ نہ کوئی اس کے ہاتھ سے چھڑا سکا۔ پردہ جو چاہتا تھا سو کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

لے

غالب

خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پنہاں ہو گئیں

لے یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں کے لڑکچر میں ”نبی“ ہیکل کے ایک معزز منصب دار کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن اگر کسی نبی کو منجانب اللہ غیب کا علم عطا کیا گیا ہو تو وہ قرآنی اصطلاح میں نبی ہو گا۔

ایک بکرا پیچم کی طرف سے آکے تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوڑا اور اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے نیچوں نیچ ایک عجیب طرح کا سینک تھا اور وہ اس دو سینک والے مینڈھے کے پاس جیسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے زور کے قہر سے اس پر دوڑ گیا۔ اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اس کا غضب اس پر کھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اس کے دونوں سینک توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا سامنا کرے۔ سو اس نے اسے زمین پر پٹک دیا اور اسے لتاڑا۔ اور کوئی نہ تھا کہ مینڈھے کو اس کے ہاتھ سے چھڑا سکے۔ اور وہ بکرا نہایت بزرگ ہوا اور جب وہ پُر زور ہوا تب اس کا بڑا سینک ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ چار نادر سینک آسمان کی چاروں ہواؤں کی طرف نکلے۔ (دانی ایل نبی کی کتاب ۱۸/۸) اس کے بعد اس خواب کی تعبیر ان الفاظ میں بیان ہوئی۔

اور ایسا ہوا کہ جب میں دانی ایل نے یہ رویا دیکھا تھا اور اس کی تعبیر کی تلاش کرتا تھا تو دیکھ میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی۔ اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبرتی ایل اس شخص کو اس رویا کے معنی سمجھا چنا پنچہ وہ اُدھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آگیا اور جب پہنچا میں ڈر گیا اور اوندھے مُنہ گر پڑا۔ اس نے مجھے کہا:-

اے اُم زاد! سمجھ لے کیونکہ دریا آخری زمانے میں انجام ہوگا۔ اور جب وہ مجھ سے کہہ رہا تھا میں اوندھے مُنہ بھاری نیند میں زمین پر پڑا تھا۔ تب اس نے مجھے چھوڑا اور سیدھا کیا اور کہا کہ دیکھ! میں تجھے سمجھاؤں گا کہ قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ یہ امر آخری مقررہ وقت پر تمہاری ہوگی۔ وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینک ہیں سو آدمی اور فارس کے بادشاہ ہیں اور وہ بال والا بکرا یونان کا بادشاہ اور وہ بڑا سینک جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے۔ اور چونکہ اس کے ٹوٹ جانے کے بعد اس کی جگہ میں چار اور نکلے سو یہ چار سلطنتیں ہیں جو اس کی قوم میں قائم ہوں گی۔ لیکن اُن کا اقتدار اس کا سنا نہ ہوگا۔ (دانی ایل نبی کی کتاب ۱۵-۱۸/۲۲)

اس خواب میں آگے چل کر یہ بشارت دی گئی ہے کہ بائبل کے قید و محن کی زندگی سے یہودیوں کی نجات فارس کے بادشاہ کے ہاتھوں ہونے والی ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کی مملکت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، جنوبی حصہ میں فارس اور شمالی حصہ

**سائرس** | میں میڈیا (مادیا) کی سلطنت۔ ۵۶۰ ق م کے قریب وہاں سائرس نامی ایک بادشاہ ہوا۔ اس نے فارس اور میڈیا کی دونوں مملکتوں کو ایک کر کے ایران کی وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

تخت نشینی کے بعد اُسے لیڈیا (ایشیائے کوچک کے شمالی اور مغربی حصہ) کے فرمانروا کے خلاف جنگ کرنی پڑی جس نے اس کے ملک پر حملہ کر دیا تھا۔ جنگ میں سائرس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن اس نے بجائے قتل و غارت گری اور سلب و نہب کے تمام ملک میں امن و سلامتی کا سکہ رواں کر دیا۔ اس کے بعد اسے مشرق کی جانب مکران اور بلخ کے وحشی قبائل کی سرکوبی کرنی پڑی۔ اسی زمانہ میں بابل کے باشندوں نے اس کے حضور درخواست گزرائی کہ وہ انہیں وہاں کے مستبد حکمران (شازاد) کے جور و ظلم سے نجات دلائے۔ اس زمانہ میں بابل کے سے مستحکم قلعہ کا فتح کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ لیکن سائرس ان مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے اٹھا اور فتح و نصرت نے اس کے پاؤں چوم لئے۔ سائرس نے بابل پہنچ کر دانیال نبی کی بڑی تعظیم و تحکیم کی۔ یہودیوں کو اجازت دیدی کہ وہ پھر یروشلم کو آباد کریں اور اپنی امداد سے مہیکل کی تعمیر جدید بھی شروع کرادی۔ عزرا کی کتاب میں ہے:-

اور شاہ فارس خود اس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے مُنہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہود ہیں وہ اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان جو کوئی ہو اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو یہود ہیں ہے، جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے (کہ وہی خدا ہے) جو یروشلم میں ہے۔ اور ہر ایک جو باقی رہا ہو ان سب مقاموں سے جہاں کہیں وہ پردیسی ہوا ہو سو اس مقام کے لوگ سونے چاندی سے اور مال مویشی سے اس کی مدد کریں اور اس کے سوا وہ خدا کے گھر کے لئے جو یروشلم میں ہے، اپنے جی کی خواہش سے ہدیئے گزرائیں۔ (عزرا کی کتاب ۱-۱/۴)

عزرا کاہن کی کتاب کے علاوہ یرمیاہ نبی کے صحیفہ میں بھی خورس کا نام آتا ہے۔ حالانکہ ان کا زمانہ فتح بابل سے قریب ڈیڑھ سو برس پیشتر کا ہے۔ اس میں لکھتا ہے۔

جو خود اس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پورے کرے گا۔ اور



یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور یہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

(یسعیاہ ۴۴/۲۸ : ۴۵/۲۰)

اگر ان روایات کی صحت کو بہ نظر اشتباہ بھی دیکھا جائے تو بھی یہ حقیقت واضح ہے کہ خود یہودیوں کے دل میں خورس کی کس قدر عزت و تعظیم تھی۔ یہ تھا وہ احسان جس کے صلہ میں خورس کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ قرآن میں اس کا تذکرہ ایسے انداز میں درج کیا گیا۔ ویسے بھی اس کی معدلت گسٹری اور غربا پروری، خدا ترسی اور نیک کرداری ایسی تھی کہ اُسے عزت کا مقام عطا کیا جانا۔

لیڈیا اور بابل کے بعد خورس کے حیوش و عساکر کا قدم ایران سے مشرق کی جانب بعض خانہ بدوش وحشی قبائل کی سرکوبی کے سلسلہ میں اٹھا۔ اس کے بعد جھیل کاسبین (بحیرہ خزر) کے کنارے (یا کاکیشیا کے دامن میں) پہنچواں ایک قوم نے "یا جوج و ما جوج" کے حملوں اور ان کی تاخت و تاراج کی شکایت خورس تک پہنچائی۔ اُس نے اس سیلاب بلا کو روکنے کے لئے پہاڑ کے اس دتہ میں ایک دیوار بنادی جس کی راہ سے یہ وحشی قبائل ان اقوام پر حملہ آور ہو کر تے تھے۔

سائرس کا انتقال ۵۲۰ ق م میں ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا کیقباو تخت نشین ہوا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ سائرس دین زردشتی کا متبع بلکہ بہت بڑا مبلغ تھا۔ اس کی نیک سیرتی اور خوش اطواری کے تذکرے سے تاریخ کا دامن بھرا پڑا ہے۔ اور تو اور خود یونانی مورخ جن کی نہ صرف مملکت (لیڈیا) بلکہ تہذیب و تمدن اس کے ہاتھوں تباہ و ویران ہوئے تھے اس کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ گذشتہ صدی عیسوی کے وسط میں اصطخر کے مقام پر سائرس کا ایک سنگی مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے دو بازو عقاب کی طرح ہیں اور سر پر مینڈھے کے سے دو سینک ہیں جن کے متعلق گمان غالب ہے کہ فارس اور مادی کی سلطنتوں کے یکجا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اس پس منظر کے بعد اب قرآن کریم کی تصریحات کی طرف آئیے۔

**ذوالقرنین** | قرآن کریم میں ذوالقرنین کا ذکر سورہ کہف میں آتا ہے جس کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔  
ذٰی الْقُرْنَيْنِ ۝ قُلْ سَأَسْأَلُكُمْ عَنْهُ

ذٰکُرًا ۝ (۱۸/۸۳)

(اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تم کہہ دو، میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام

الہی میں اڑھ کر سنا دیتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ استفسار یہودیوں کی طرف سے ہوا ہو گا کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہی وہ غیر اسرائیلی ہے جس کی عظمت و عقیدت یہودیوں کے دل میں جاگزیں تھی۔ اب قرآن کریم کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے!

إِنَّا مَكِّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ مِصْرَ وَاتَّخَذْنَا مِنْهُ كُفْرًا سَبَبًا ۝ (۱۸/۸۴)

ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی۔ نیز اس کے لئے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔

اب اس کے بعد پہلی مہم کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا۔

فَأَسْبَغَ سَبَبًا ۝ (۱۸/۸۵)

تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک (مہم کے لئے) ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا)۔

**مغربی مہم** | یہ مہم جانب مغرب (یعنی لیڈیا کی طرف) تھی۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ لیڈیا کا علاقہ ایشیا کے کونے کے شمال مغرب میں واقع تھا جہاں سے آگے بڑھنے پر سمندر آ جاتا ہے۔ وہ ساحل

سمندر تک جا پہنچا۔ اب اس کے آگے خشکی کا راستہ نہیں تھا اس لئے وہ وہیں رُک گیا۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ ۚ

وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۚ قُلْنَا يَلَدًا الْفَرَسَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ ۚ

إِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝ (۱۸/۸۶)

یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا۔ وہاں اُسے سورج ایسا دکھائی دیا،

جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہو اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا جس

نے حق کی مخالفت کی تھی۔ ہم نے کہا ”اے ذوالقرنین! (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو

چاہے انہیں عذاب میں ڈالے چاہے سلوک کر کے اپنا بنا لے۔“

غالباً بحیرہ اشود کا کنارہ تھا جہاں کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کہ سورج (گویا) سمندر کے اندر ڈوب رہا ہے سبیل

سمندر پر کھڑے ہونے سے ایسا ہی منظر دکھائی دیا کرتا ہے۔ اس نے وہاں کی آبادی کو بھی زیرِ تسخیر کر لیا۔ اب

اگر اس کی فتوحات چنگیز و ہلاکو کی سی ظلم و ستم کی خوفناک آندھیاں تھیں تو وہ اس علاقہ کو آگ اور خون کا جہنم بنا

دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ عدل و احسان سے کام لیا اور حکم دیا کہ

قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ

عَذَابًا تَكْرَرًا هَ ذَا مَّا مَنَ اَمَّنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ مِّنَ الْحُسْنٰی  
وَسَنَقُولُ لَهُ مِّنْ اَمْرِنَا يُنْصَرًّا ه (۸۷-۸۸/۱۸)

ذوالقرنین نے کہا ”ہم نا انصافی کرنے والے نہیں۔ (جو پہلے ہو چکا سو چکا۔ اب) جو سرکشی کرے گا،  
اسے ضرور سزا دیں گے، پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ (بد اعمالوں کو) سخت عذاب  
میں مبتلا کرے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے بھلائی ملے گی اور ہم  
اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی و راحت ہو۔“

قُلْنَا يٰٰذَا الْقَرْنَيْنِ (آیت ۸۶/۱۸) سے بعض لوگوں کا خیال اس طرف گیا ہے کہ ذوالقرنین صاحبِ وحی  
تھے (اور اس لئے خدا کے رسول) لیکن قرآن نے اس کی تصریح نہیں کی اور محض قلنا سے رسالت پر ہتھکڑیاں  
بہت دور کی تاویل ہے۔ اس اندازِ بیان سے مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فاتح کو یہ اختیار دے  
رکھا ہوتا ہے کہ وہ چاہے توبہ تقاضائے عدل، مغلوب دشمن کو سزا دے اور چاہے، بہ طریقِ احسان، ان سے  
حسن سلوک روا رکھے۔ ان میں سے وہ جو راستہ بھی اختیار کرنا چاہے، خدا کی طرف سے اس پر گرفت نہیں  
ہوتی۔ البتہ احسان کا طریق اختیار کرنے سے، اس کا خیر کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ قلنا سے انسان کے اسی  
اختیار و ارادہ کی استعداد کی طرف اشارہ ہے۔

**مشرقی مہم** | اس کے بعد اس کی مشرقی مہم کا ذکر ہے۔ بحرِ یامنی، بلخ کے علاقہ میں جو ایران سے  
مشرق کی جانب واقع ہے، وحشی قبائل نے اودھم مچا رکھا تھا۔ یہ مہم ان کی اصلاح  
کی خاطر اختیار کی گئی۔

لَمَّا اَشْبَعَ سَبَبًا هَ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَ جَدَّهَا تَطْلُعُ  
عَلٰی قَوْمٍ لَّمْ يَجْعَلْ لَهُمْ مِّنْ دُونِهَا سِتْرًا ه (۸۹-۹۰/۱۸)

اُس کے بعد پھر اس نے تیاری کی اور (پورب کی طرف)، نکلا۔ یہاں تک کہ مشرقِ اقصیٰ تک  
پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا جو جلیل میدان میں رہتی تھی اور دھوپ سے بچنے کا کوئی  
سامان انہوں نے نہیں کر رکھا تھا۔

یعنی وہ قوم جو کھلے میدانوں میں رہتی تھی اور اس نے شہری زندگی (تمازتِ آفتاب سے چھپ کر مکانات  
میں رہنے کی زندگی) اختیار نہیں کی تھی۔

**اور شمالی مہم** | اب اس کے بعد اس کی شمالی مہم کا ذکر آتا ہے جب اُس نے کاکیشیا کے پہاڑوں کی طرف رخ کیا۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ  
يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۝ (۱۸/۹۳)

یہاں تک کہ وہ ایک وادی میں پہنچا جس کے دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ وہاں اس نے دیکھا پہاڑوں کے اُس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو بالکل نہیں سمجھتی۔

یہ علاقہ یوں سمجھئے کہ آرمینیا اور آذربائیجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا خطہ تھا جہاں کی آبادی اہل ایران کی زبان سے بالکل ناواقف تھی۔ اس قوم نے اس سیلاب بے پناہ کے خلاف فریاد کی جو ہر سال پہاڑ کے درہ میں سے اُمنڈ آتا تھا اور انسانی جان و مال کو جس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا تھا۔ ان حملہ آور وحشی قبائل کا نام یاجوج و ماجوج تھا (تفصیل ان کی باب زیرِ نظر کے اخیر میں آئے گی)۔ یہی وہ وحشی قبائل تھے جن کی طوفان انگیزوں سے بچنے کے لئے اہل چین نے وہ دیوار تعمیر کی جس کا شمار آج دنیا کے نوادرات میں ہوتا ہے۔ اس علاقہ کی آبادی نے بھی یہی تجویز کیا کہ پہاڑ کے اس درہ کو پاٹ دیا جائے جس سے یہ طوفان اُمنڈ آتا ہے۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّا يَا جُوجَ وَ مَا جُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ  
فَهَلْ تَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ (۱۸/۹۴)

اس قوم نے کہا "اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنادیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لئے کچھ خراج مقرر کر دیں؟"

دیکھئے! اس قوم نے یہ کہا کہ اگر آپ ہمارے لئے اتنا کر دیں تو ہم آپ کے باجگذار بن جائیں گے اور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ چونکہ یہ قوم مظلوم تھی ذوالقرنین نے ان کی حمایت اور امداد کے معاوضہ میں ان سے کچھ وصول کرنا نہیں چاہا اور کہا۔

قَالَ مَا مَكْنِيِّ فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ  
وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا مَّا ۝ (۱۸/۹۵)

ذوالقرنین نے کہا "میرے پروردگار نے جو کچھ مجھے دے رکھا ہے، وہی میرے لئے بہتر ہے۔ (تمہارے خراج کا محتاج نہیں، مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور یاجوج اور ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا۔

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم نے اس "باحثِ شاخہ" کا ذکر اس خصوصیت سے کیا ہے! اس کے بعد

الْأُوْنِیُّ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ۖ حَتّٰی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَاقِیْنِ قَالَ اَنْفُخُوْا حَتّٰی اِذَا جَعَلَهُ نَارًا ۖ قَالَ الْاُوْنِیُّ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قَطْرًا ۝ (۱۸/۹۶)

(اس کے بعد اُس نے حکم دیا، "لوہے کی سلیں میرے لئے ہتیا کر دو۔" پھر جب (تمام سامان ہتیا ہو گیا اور) دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی، تو حکم دیا، (بھٹیاں لگاؤ اور) اسے دھونکو۔ پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بائیں آگ (کی طرح لال) ہو گئی، تو کہا "گلا ہوا" تاہنہ لاؤ اُس پر انڈیل دیں۔"

چنانچہ دیوار تیار ہو گئی اور ایسی دیوار کہ

فَمَا اسْتَطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ ۚ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ (۱۸/۹۷) **ذوالقرنین**

چنانچہ (اس طرح) ایک ایسی سدن گئی کہ (یاجوج اور ماجوج) نہ تو اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے!

جب یہ عظیم الشان کام مکمل ہو گیا تو ذوالقرنین اپنے خدا کے حضور زمین بوس ہوا اور سجدۂ شکرانہ بجالایا کہ اس کے فضل و کرم سے ایسا اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا حَجَّآءٌ ۙ دَعُوْا رَبِّیْ جَعَلَهُ دَكَّآءٌ ۙ وَ كَانَ دَعْوُ رَبِّیْ حَقًّا ۝ (۱۸/۹۸)

ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا "یہ (جو کچھ ہوا) میرے پروردگار کی مہربانی سے ہوا ہے۔ جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی، تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دے گا (مگر اس سے پہلے کوئی اُسے ڈھا نہیں سکتا) اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے، ٹلنے والی نہیں!"

اس کے بعد ہے۔

وَتَرْكُنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ  
جَمْعًا ۚ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ  
كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غَطَاٍ عَنْ ذِكْرِنَا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا

(۹۹-۱۰۱/۱۸)

اور جس دن وہ بات ظہور میں آئے گی تو اس دن ہم ایسا کریں گے کہ اسمندر کی لہروں کی طرح ان قوموں میں سے ایک (قوم) دوسری (قوم) کے درمیان پہنے لگے گی اور نرسنگھا پھونکا جائے گا اور ساری قوموں کی بھیڑ اکٹھی ہو جائے گی!

اس دن ہم منکروں کے سامنے دوزخ اس طرح نمودار کر دیں گے جیسے ایک چیز بالکل سامنے دکھائی دے وہ منکر جن کی نگاہوں پر ہمارے ذکر کی طرف سے پردہ پڑ گیا تھا اور اکالوں میں ایسی گرائی کہ کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔

ذوالقرنین نے آیت (۱۸/۹۸) میں کہا تھا کہ یہ دیوار ایسی مضبوط بن گئی ہے کہ اسے کوئی گرا نہیں سکے گا۔ لیکن اگر خدا کے قانونِ فطرت کی طرف سے کوئی ایسی بات سرزد ہو، (مثلاً زلزلہ آجائے یا سیلاب) تو اسے یہ دیوار روک نہیں سکے گی۔ اس کے بعد قرآن کا اضافہ ہے کہ ذوالقرنین نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب اس قسم کے بین الاقوامی موانعات کچھ حقیقت نہیں رکھیں گے۔ اس وقت قویں سمندر کی تلاطم انگیز موجوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں گی اور اس قسم کی دیواریں ان کی یورش کے راستے میں حائل نہیں ہو سکیں گی۔ اس وقت جنگ کے بگل بھیں گے اور تمام قومیں جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کے مقابلہ کے لئے جمع ہو جائیں گی۔ اس وقت جہنم کی تباہیاں ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائیں گی۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کا یہ بیان کس طرح حرفاً و روحاً پورا ہو کر رہا ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کی رکاوٹوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

ذوالقرنین کی سرگذشت قرآن کریم میں اتنی ہی مذکور ہے۔ اس بحث میں اُبّ لمحے بغیر کہ اس سے بالتحقیق کوئی شخصیت مراد ہے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ایک جہاں دار و جہاں آرا کے لئے کن خصوصیات کو

مستحسن قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کے ممکن فی الارض اور اسباب و ذرائع کا ہتیا ہونا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے، وہی ممکن فی الارض جسے تذکرہ حضرت یوسفؑ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۖ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ  
لُيُؤْتِيَهُمْ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُشَاءُ ۚ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۲/۵۶)

اور (دیکھو) اس طرح، ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جمادیئے کہ جس جگہ سے چاہے، حسب مرضی کام لے جو چاہتا ہے اسے (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیضیاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

وہی ساز و سامان جس کے تذکرے حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے کوائف حیات میں وجہ شادابی قلب و نظر بن چکے ہیں ممکن فی الارض اور قوت و شوکت کے سامان انعامات خداوندی ہیں جن سے محرومی کسی قوم کی انتہائی بدبختی اور خدا کا رسوا کُن عذاب ہے۔ اسی ممکن فی الارض کو اللہ تعالیٰ نے جماعتِ مومنین کے لئے سب سے بڑا انعام قرار دیا ہے۔

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا  
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ إِلَهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ (مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نظامِ صلوة قائم کریں گے، سامانِ نشو و نما بتا کر نے میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے برائیوں روکیں گے اور تمام امور کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔

پھر جیسا کہ اس آیتِ جلیلہ میں بتایا گیا ہے، اس ممکن فی الارض سے مقصود تغلب و استبداد نہیں بلکہ قوانینِ الہیہ کی تنفیذ و ترویج ہے جو یکسر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ یہی وہ عدل و انصاف ہے جسے ذوالقرنین نے اس وقت اختیار کیا جب اللہ نے اسے لیبیا کی سرزمین پر تسلط عطا فرمایا۔ پھر آگے بڑھتے۔ اس ممکن فی الارض کا سب سے اہم مقصد دنیا سے فساد مٹانا ہے۔ یاد رکھئے قوانینِ الہیہ کا مقصد اصلاح ہے، یعنی انسانی صلاحیتوں کی ایسی پرورش اور نشو و ارتقاء (زکوٰۃ) جس سے یہ اپنے معراج تک جا پہنچیں برعکس اس کے کٹا غوثی نظام کا نتیجہ (بلکہ یوں سمجھئے کہ خود یہ نظام) فساد ہوتا ہے جس کی تعریف (definition) اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اصلاح کی بالکل ضد ہوتا ہے۔ آیت (۱۸/۹۴) میں اس قوم نے یا جوج و ماجوج کے متعلق یہی کہا تھا

کہ وہ مُفْسِدٌ دُنِیٰ اِلَیّ الْاٰخِرِیْنَ ہیں۔ چونکہ فساد فی الارض کا استیصال ہر اس قوم کا فریضہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمکّن عطا فرمایا ہو اس لئے وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں کسی صلہ اور معاوضہ کی خواہاں اور متمنی نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے فرض سمجھ کر سرانجام دیتی ہے اور جس کام کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا جائے اس کے لئے صلہ اور معاوضہ کی تمنا کیسی؟ اس کا بدلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمکّن فی الارض کو مستحکم سے مستحکم تر کرتا جاتا ہے۔ آیت (۱۸/۹۵) پر غور کیجئے قَالَ مَا مَنَّكَ بِنِّیِّ فِیْهِ دَبِّیْ خَیْرٌ کی حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔

پھر یہ بھی کہ جب اس جماعت کے ہاتھوں کوئی ہم انجام پائے گی تو وہ اسے اپنے کسب و ہنر پر محمول نہیں کرے گی بلکہ اسے اللہ کا فضل اور رحمت قرار دے گی۔ نتیجاً اس کا یہ کہ فتح و کامرانی ان کے دماغوں میں تکبر و غرور کے طاغوتی ختناس کے بجائے عجز و نیاز کے ملوکوتی جوہر پیدا کرے گی۔

**سائرس اور مذہبِ زرتشت** | اگر ذوالقرنین سے مراد سائرس ہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے زمانے میں زرتشتی مذہب کی تعلیم کس قدر بلند اور پاکیزہ تھی۔ عصرِ حاضرہ کی

تحقیق کے مطابق جناب زرتشت کا عہد سائرس کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس زمانہ میں یہ مذہب اپنے حقیقی خط و خال میں تھا۔ دارا (یعنی سائرس کے دوسرے جانشین) کے فرامین جو اس کے کتبات میں کندہ ملے ہیں اس زمانہ کی زرتشتی تعلیم کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی رو سے یہ مذہب عبودیتِ خداوندی اور نیک عملی کی مضبوطی کا داعی تھا لیکن آہستہ آہستہ دیگر مذاہب کی طرح اس مذہب پر بھی خارجی اثرات نے اپنا تسلط جمالیا اور رفتہ رفتہ سائرس اور دارا کے زمانہ کا مذہب ایک اور مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ سکندر اعظم کے حملہ نے نہ صرف ایرانی سلطنت کو ہی تباہ و برباد کیا بلکہ زرتشت کا مقدس صحیفہ (اوستا) بھی اسطرح کے حملہ کے وقت جل کر تباہ ہو گیا۔ اس کے ایک عرصہ بعد تک پیروانِ مذہبِ زرتشت ادھر ادھر پریشانی میں پھرتے رہے تا آنکہ ساسانی عہدِ حکومت کے وقت اردشیر نے اوستا کا نسخہ از سر نو مرتب کیا جس طرح حملہ بخت نصر کے بعد یہودیوں نے تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا اس جدید نسخہ کو اصل نسخہ سے جو نسبت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے بعد زرتشتی مذہب درحقیقت قدیم مجوسی مذہب ہی کی دوسری صورت بن کر رہ گیا۔ (تفصیل اس کی دوسرے مقام پر ملے گی)۔



**یا جوج و ما جوج** | یا جوج و ما جوج کون تھے؟ اس کے لئے سورہ کہف کی مذکورہ صدر آیت کو پھر ایک مرتبہ سامنے لائیے۔

قَالُوا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يٰجُوجَ وَ مَا جُوجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ (۱۸/۹۴)

اس قوم نے کہا ”اے ذوالقرنین! یا جوج اور ما جوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لئے کچھ خرچ مقرر کر دیں؟“

اور اس کے ساتھ سورہ انبیاء کی ان آیات کو ملا کر پڑھتے جن میں یا جوج اور ما جوج کا ذکر دوسری مرتبہ آتا ہے۔

وَ حَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلُكْنَهَا اَنْهُمْ لَا يُزِجُوْنَ ۝ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يٰجُوجُ وَ مَا جُوجُ وَ هُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ ۝ وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۝ يُوْنِلْنَا قَدْ كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (۲۱/۹۴-۹۵)

اور (دیکھو) جس آبادی کے لئے ہم نے ہلاکت ٹھہرا دی تو اس کے لئے (کامیابی و سعادت) ممکن نہیں۔ وہ کبھی (اپنی) سابقہ سر بلندی کی طرف لوٹ نہیں سکتی۔

تا آنکہ وہ وقت آجائے گا کہ یا جوج اور ما جوج کی راہ کھل جائے گی۔ (زمین کی) تمام بلندیوں سے وہ دوڑنے ہوئے اتر آئیں گے اور (خدا کے ٹھہرائے ہوئے) سچے وعدہ کی گھڑی قریب آجائے گی تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ لوگوں کی آنکھیں (شدتِ دہشت و حیرت سے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، اُن لوگوں کی آنکھیں جہنم میں (سجائی سے) الکار کیا تھا (وہ پکار اٹھیں گے) افسوس ہم پر! ہم اس (ہولناک گھڑی سے غفلت میں رہے بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار تھے!)

قرآن کریم میں یا جوج و ما جوج کا ذکر انہی دو مقامات میں آیا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جن اقوام و ملل کی سرگذشت بیان ہوئی ہے وہ تمام سامی النسل تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی

لہٰذا اس آیت کی تشریح فرا آگے چل کر آئے گی۔

کہ شروع شروع میں ایک قبیلہ صحراوردی اور دشت بہمانی کی زندگی بسر کرتا پھر وہ آہستہ آہستہ اقامت گزینی اختیار کر لیتا اور کچھ عرصہ بعد تمدن و حضارت کی زندگی تک پہنچ جاتا۔ اس طرح مختلف آبادیوں کی طرح بڑتی اور حکومتوں کے نقشے مرتب ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس وسط ایشیا میں ایک اور نسل تھی جس کا انداز زندگی ان سے بالکل مختلف تھا۔ سطح مرتفع پامیر کے گرد و پیش کا علاقہ جسے اب منگولیا کہا جاتا ہے اس نسل کا اولین مسکن تھا۔ اس قوم نے کبھی تمدن و حضارت کی زندگی اختیار نہیں کی، ہمیشہ خانہ بدوش اور صحراوردی رہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان کی تعداد بڑھتی تو اپنے وطن کی بلندیوں سے ایک سیلاب بے پناہ کی طرح اُمنڈ کر کسی ایک سمت کا رخ کر لیتے اور جس طرف یہ کف بدہاں طوفان پھرتا اُمنڈتا جاکھلتا آبادیاں ویرانوں میں اور بستیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ قتل و غارتگری، سلب و نهب لوٹ مار ان کا شیوہ تھا۔ یہ وحشی قبائل اپنی طبیعت کی سختی اور مزاج کی درشتی کے لئے مشہور تھے۔ گرد و پیش کی اقوام و ممالک ان کی وحشت و درندگی سے ہمیشہ خائف رہتے اور ان کی یورش اور یلغار سے بچنے کے لئے مختلف تدابیر سوچتے رہتے۔ انہی کے حملوں کی روک تھام کے لئے اہل چین کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانا پڑی۔ اسی طوفان کا رخ بدلنے کے لئے سائرس نے سد تعمیر کی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہی قبائلیوں کی ایک شاخ تازیوں کے نام سے مشہور تھی۔ دوسری شاخ کا نام سحین تھا۔ ایک اور شاخ یورپ میں میگرا کے نام سے مشہور ہوئی۔ تاریخی انکشافات بتاتے ہیں کہ انہی منگولین قبائل کا ابتدائی نام موگ تھا۔ (اسی سے منگولین بنا) یونانیوں نے اسی موگ کو میگاگ کہا اور عبرانی میں یہی ماجوج بن گیا۔ انہی کا ایک قبیلہ یوآچی کہلاتا ہے جس نے آخر الامر ماجوج کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ہیں ماجوج و ماجوج GOG AND MAGOG ان کا ذکر سب سے پہلے تورات میں حزقیل نبی کی کتاب میں ملتا ہے جہاں لکھا ہے:-

خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد! تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسکت اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہیوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسکت اور توبال کے سزائیں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھر ادوں گا اور تیرے جہڑوں میں بنیاں ماروں گا اور تجھے اور سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو سب کے سب فاخرہ پوشاک جنگی پہنے ایک بڑا ہنہ جو پھر میں اور سپر میں لئے ہوئے ہیں اور سب کے سب تلوار بھرنے والے ہیں کھینچ نکالوں گا اور ان کے ساتھ فارس اور کوش اور فوط جو سب کے سب سپر میں لئے ہوئے اور خود

(حزقیل ۱ - ۵/۳۸)

پہنے ہوئے ہیں۔

حزقیل نبی بخت نصر کے حملہ میں قید ہو کر بابل پہنچے تھے۔ یہ پیش گوئی دیں کی اسیری کے ایام میں کی گئی تھی اور اس کے

بعد آپ سائرس کے زمانہ تک زندہ تھے۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ اس میں انہی وحشی قبائل کا ذکر ہے جو کاکیشیا کی راہ سے حملہ آور ہوا کرتے تھے اور جن کی روک تھام کے لئے سد تعمیر کی گئی تھی۔ اس پیش گوئی میں روش (روس) مسک (ماسکو) واضح ہیں۔ تو بال، بحر اسود کے شمالی علاقہ کو کہتے ہیں (مسک اور تو بال شمالی کاکیشیا کے دو دریاؤں کا بھی نام ہے غالباً یہ نام ان کے گرد و پیش کے قبائل کی وجہ سے رکھے گئے ہوں گے یا ان قبائل نے ان دریاؤں کی نسبت سے دنیا میں اپنا تعارف کرایا ہو گا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ یہ وحشی قبائل انہی علاقوں سے متعلق تھے۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس کی شہادت ہے کہ یہی قبائل کاکیشیا (قفقاز) کے درہ سے حملہ آور ہوتے تھے۔ سائرس نے اس درہ کو بند کر دیا۔ زمانہ حال کے اکتشافات سے ظاہر ہے کہ سائرس نے دراصل دو دریاؤں: نوائی تھیں۔ ایک بحر خزر سے مغرب کی طرف، قریب تیس میل لمبی جہاں وہ کوہ کاکیشیا کے مشرقی کنارے تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں قدیم زمانہ سے ایک شہر در بند آباد ہے۔ اس سے آگے بڑھتے تو وہ درہ آتا ہے جو 'Darial Pass' کے نام سے مشہور ہے۔ اس درہ میں بھی ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہی وہ دیوار ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔



اب سورۃ انبیاء کی اس آیت کو لیجئے جس میں یا جوج کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا۔  
 حَتَّىٰ اِذَا فُتِحَتْ يَابُجُجٌ وَّ مَا جُجُجٌ وَّ هُمْ مِّنْ كَلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ ۝ (۲۱/۹۶)  
 جب وہ وقت آجائے گا کہ یا جوج اور ما جوج کی راہ کھل جائے گی (زمین کی تمام بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اُتر آئیں گے۔

**آخری یورش** ایک مفہوم کے اعتبار سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کسی آنے والے حادثہ کی پیش گوئی ہے، وہ حادثہ جو اپنی وحشت اور خوف سامانی کے اعتبار سے لرزہ انگیز ہو گا کہ ساری دنیا دہشت سے کھڑکھڑا اٹھے گی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وحشی منگولیوں کے یہ سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھتے رہتے تھے۔ ظہور اسلام سے قبل ان کی یورش چوتھی صدی عیسوی میں باعث تخریب و فساد بن چکی تھی جب وہ یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ اس کے بعد یہ طوفان رُک گیا اور تیرہویں صدی عیسوی تک رُک کار ہوا۔ اس دوران میں ان کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی اور نظر آتا تھا کہ اس مرتبہ اس طوفان نے جس سمت کا رخ کیا قیامت برپا کر دے گا۔ (قریب ۱۲۰۰ء) میں چنگیز خانی دبدبہ اور غلغلہ کا شہرہ بلند ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی خاں اس کا جانشین ہوا۔ اوکتائی کے بعد منکو منکو کے بعد قبلانی خاں اور قبلانی خاں کا بھائی ہلاکوں خاں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ صدیوں کا رُکا ہوا سیلاب اُمنڈ کر آگے بڑھا (حَتَّىٰ اِذَا فُتِحَتْ يَابُجُجٌ

وَمَا جُؤْجُ (اور اپنی سطح مرتفع سے اُچھلتا ہوا بغداد تک پہنچا) (مِنْ كُلِّ حَذَبٍ يَنْظِرُونَ) (۲۱/۹۶) اور اسلامی شوکت و سطوت کو اس طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا کہ اس کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ یہ وہ قیامت صغریٰ تھی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن یہ بھی اللہ کے اس قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت ظہور پذیر ہوئی تھی جس میں کسی سے رعایت نہیں برتی جاتی۔ یوں تو مسلمانوں کی مرکزیت ایک عرصہ سے کمزور ہوتی چلی آرہی تھی لیکن فتنہ تاتار کے بعد ان کا شیرازہ کچھ اس طرح بکھرا کہ آج تک پھر مجتمع نہ ہو سکا اور وہ قوم جسے اقوام و ملل سابقہ کے احوال و کوائف سے قدم قدم پر آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یاد رکھو کہ قوانینِ الہیہ کے خلاف انسانی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ ہلاکت و تباہی کا شعلہ ایگز جہنم ہے، ان شعلوں کی لپٹ سے نہ بچ سکی۔

حذر اسے پیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لیکن ان امور کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہاں فقط اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہلاک و خاں کو خود بغداد کے مسلمانوں ہی کی ایک جماعت نے حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ وَفِيهَا آيَاتٌ لِّعُقُوبٍ لِّمَن يَّعْقِلُونَ۔

لیکن اگر سورۃ انبیاء کی دونوں آیتوں کو سامنے رکھا جائے تو ایک اور مفہوم بھی سامنے آتا ہے۔ اس کی پہلی آیت میں ہے وَحَرَّامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ اَهْلُكْنَهَا اَنْ يَّهْمُوْا لَآ يَرْجِعُوْنَ (۲۱/۹۵)۔ یعنی جو قومیں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق زوال پذیر ہو جاتی ہیں، ان کی نشاۃ ثانیہ (دوبارہ زندگی) کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد ہے حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَاجُوجُ ..... تا آنکہ یہ صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ..... اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے یہاں کسی ایسے اصول کو بیان کیا ہے جس کے مطابق گری ہوئی قوموں کے دوبارہ اُبھرنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ یہاں اگر ہم یا جوج و ماجوج سے مراد کوئی خاص قبائل نہ لیں بلکہ ان الفاظ کے بنیادی معانی پر غور کریں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ان کے بنیادی معنی ہیں شعلوں کی طرح اُبھر کر ادھر ادھر پھیل جانا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصرِ حاضر کے مغربی اقوام کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے جس کی رُو سے وہ اپنے اپنے ملکوں سے نکل کر دنیا کی پست اقوام کے ہاں جا پہنچیں اور وہاں اپنی 'Colonies' بن کر اپنا جذبہ استعماریت اور سلطنت سازی (Imperialism) کی تسکین کا سامان فراہم کرنے لگیں۔ لیکن اس کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ اس تزام و تصادم سے خود ان پست اقوام کی رگوں میں بمخند خون میں پھر سے حرارت پیدا ہو گئی اور کچھ عرصہ کے بعد یہ ان اقوامِ غالب کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس طرح ان تباہ شدہ اقوام کو دوبارہ زندگی مل گئی۔ آپ دیکھئے کہ گذشتہ پچاس سال میں اس طریق سے دنیا کی کس قدر پست اقوام اُبھر کر اوپر آ گئی ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، مشرق وسطیٰ کی اقوام اور اب افریقہ کے علاقے سب کی نشاۃ ثانیہ اسی طریق سے ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ انبیاء کی مذکورہ بالا آیات

میں پست اور محکوم اقوام کی باز آفرینی کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ ہے۔

﴿﴾

بہر حال ذوالقرنین اور ماجوج و ماجوج کے متعلق جو گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے وہ نفس واقعہ کے اعتبار سے تاریخی قیاسات پر مبنی ہے۔ اس باب میں مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایٹھکس، جیونش انسائیکلو پیڈیا اور یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ، نیز ترجمان القرآن (از ابوالکلام آزاد مرحوم) کو دیکھنا چاہیے۔

﴿﴾

بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کا تذکرہ ابھی باقی ہے جو معارف القرآن کے اگلے حصہ میں ملے گا جس کا نام ”شعلہ مستور“ ہے۔ اس میں ان حضرات کے تذکارِ جلیلہ کے بعد تمام سابقہ انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام پر فلسفہ تاریخ کی روشنی میں مبسوط تبصرہ بھی کیا جائے گا، جو اپنی جگہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

پرویز